رجسٹرڈ ایل
پیام تعلیم
جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی
پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ

زنگی قلم

سالہاسال سے ہزاروں زنگی قلم ہندوستان کے ہر حصہ میں ہر قسم کی آب و ہوا میں اور ہر قسم کی نوشت و خواند میں استعمال ہو رہا ہے، تقریباً چالیس ہزار زنگی قلم کے استعمال کرنیوالے زنگی قلم کے پائیدار اور کارآمد ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں، زنگی قلم کا ہر ایک پرزہ قلم میں لگائے جانے سے پہلے نہایت غور سے پاس کیا جاتا ہے اور پھر ہر ایک زنگی قلم مکمل ہونے پر تقریباً تیس الفاظ لکھنے کے بعد پاس ہوتا ہے اور اس کے بعد بھی ہر ایک زنگی قلم کے خریدار کے پاس روانگی سے پہلے دوبارہ آزمایا جاتا ہے کہ وہ خریدار کے خاص کام روش اور ہاتھ کے بادُک کے لئے مناسب ہے یا نہیں اور ہر ایک خریدار کو حق دیا جاتا ہے کہ تاریخ رسید سے پورے ایک ہفتہ تک بالکل اطمینان سے جس طرح چاہے استعمال کرے اگر ذرا بھی حسب منشاء کام نہ کرے تو فوراً کارخانے کو واپس کر دے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زنگی قلم کا دشمن کوئی بھی نہیں ہے اور علاوہ اشتہار کے خود استعمال کرنے والوں کی سفارش پر بھی زنگی قلم کی شہرت اور فروخت کا زیادہ انحصار ہے۔ آپ فوراً ہی بالکل اطمینان خاطر سے آج ہی ایک زنگی قلم ایک ہفتہ کی آزمائش پر بشرط پسند وی پی منگائیں۔ کیونکہ راستہ کی ٹوٹ پھوٹ اور ایک ہفتہ تک استعمال کی تمام ذمہ داری کارخانہ پر ہے۔ اس لئے آپ کا کوئی نقصان کسی طرح ہو ہی نہیں سکتا قیمت چھ روپے چار آنے ۶/۴

Checked 1965

بہتر ہے کہ زنگی قلم کے ساتھ ہی ایک گروس زنگی دیسی سیاہی کے قرص قیمت ۱۲ اور ایک زنگی لیور کلپ قیمت چھ آنے منگالیں تاکہ آپ کم از کم ایک سال کے لئے بالکل بے فکر ہو جائیں

زنگی قلم کمپنی نمبر ۲۶ ایجرٹن روڈ دہلی

بقائے صحت کی نو ایجاد مشین

زمانہ حال کی خصوصیات میں سے ایک مزیہ بھی ہے کہ صرف موت کا مقابلہ بہتر اندز یادہ کامیابی سے ہو رہا ہے بلکہ شباب کے قیام اور عود کی طرف بھی زیادہ توجہ کی جا رہی ہے پچیس برس پہلے جو لوگ پہاڑوں پر جانے کے فائدے سے بالکل ناآشنا تھے، آج وہ ہر سال پہاڑوں پر جا کر شباب اور حیات دونوں کی مدت میں اضافہ کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں، سرسبز پہاڑوں پر سورج کی روشنی سے بنفشی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں، وہی اس شباب اور حیات کی توسیع کا باعث قرار دی گئی ہیں، پہاڑوں کے پھل اور میوے ہمیشہ سے صحت اور قوت بخش سمجھے جاتے تھے آج یہ راز افشا ہو گیا ہے کہ وہ بھی شعاع بنفشہ کو مہینوں تک پختگی کے وقت تک جذب کر کے اس قدر مفید ہو جاتے ہیں۔

آج بنفشی شعاع کے مفید ثابت ہو جانے کے بعد سائینسدانوں نے ہر گھر میں اس کو لیجانے کی کوشش کی ہے۔ ایک بجلی کے آلہ سے اس کو مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے اور نہ صرف قوت، حسن، شباب و توسیع حیات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بلکہ فالج، گٹھیا، ورم، درد، پھوڑے وغیرہ کے علاج میں بھی بے مثل نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک مشین کا رہنا نہایت ضروری ہے جہاں بجلی نہیں ہے وہاں بنفشی شعاع سے مس کی ہوئی اشیاء لگانے اور کھانے سے بھی بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے جن طلباء کی نشو و نما میں کمی ہو یا حافظہ خراب ہو یا نیند اور حافظہ میں کمی محسوس ہوتی ہو تو ملاقات یا خط و کتابت کریں۔

زنگی قلم کمپنی (وایولٹ رے انسٹی ٹیوٹ) ایجرٹن روڈ دہلی

قیمت فی پرچہ
دو آنے
۲ر

پیام تعلیم

قیمت سالانہ
ڈھائی روپے
عہ۸ر

جلد ۱۱ — یکم نومبر ۱۹۳۱ء — نمبر ۱

فہرست مضامین

اعتذار

کوئی سوا سال کے بعد آج پھر "پیام تعلیم" کی ادارت میرے ہاتھ میں آرہی ہے۔ جون سنہ ۳۰ء میں میرے شانتی نکیتن چلے جانے کے بعد اس کی ادارت کا کام جن صاحب کے ہاتھ میں تھا وہ غالباً اپنی دیگر مصروفیتوں کے باعث اس کی طرف کما حقہ توجہ نہ کرسکے جس سے ناظرین کو بلاشبہ شکایات کا موقع ہوا ہوگا اور جس کی وجہ سے بالآخر پرچہ کو گزشتہ چند ماہ سے بالکل بند کردینا پڑا۔ لیکن اب سے پرچہ کا انتظام مستقل طور سے مضبوط بنیادوں پر کیا گیا ہے اور اسکی اندرونی اور بیرونی ہر دو حیثیتوں میں کچھ نہ کچھ تغیر بھی ہوگیا ہے۔ بے اُمید ہے کہ ناظرین بہ نظر پسندیدگی دیکھیں گے اور اس کے مستقبل کی طرف سے پورا اطمینان رکھیں گے۔ خدائے تعالیٰ سے دعا ہے کہ توفیق عمل اور ثبات قدم عطا فرمائے۔ وما توفیقی الا باللہ

(مدیر)

(نوشتہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری پروفیسر جامعہ ملیہ)

برائے طلبائے جامعہ

محبت سے تری یارب یہ دل معمور ہو جائے
سراسر ہے یہ تاریکی سراپا نور ہو جائے

میں مخلوق اور تو خالق، میں بندہ اور تو مالک
روا مت رکھ کہ تیرا بندہ تجھ سے دور ہو جائے

مرے سوزِ دروں کو وہ تجلی زارِ عرفاں کر
کہ اس کا ہر شرارہ اک چراغِ طور ہو جائے

تجھے چشمِ بصیرت سے میں دیکھوں خانۂ دل میں
ترے دیدار سے جانِ حزیں مسرور ہو جائے

فروغِ زندگی وہ لے کے اُٹھوں بزمِ ہستی میں
کہ جس سے ظلمتوں کی تیرگی کافور ہو جائے

مرا ذوقِ عمل نا آشنائے حدّ و پایاں ہو
زمیں تھک جائے مجھ سے آسماں مجبور ہو جائے

بہارِ تازہ باغِ آفرینش میں کروں پیدا
متاعِ زندگی خلد و قصور و حور ہو جائے

آدمی کی کہانی
ایک ستارے کی زبانی

کوئی سوا برس کا زمانہ ہوتا ہے ہم نے "پیام تعلیم" میں "آدمی کی کہانی" شائع کی تھی۔ ننھے ننھے تاروں کے کہنے سے ان کی نانی اماں نے دنیا میں بسنے والے دو پایوں کی کہانی کہنی شروع کی تھی۔ تھوڑی سی کہنے پائی تھیں کہ آسمان پر ایسا طوفان آیا، وہ وہ بادل گرجے، اور بجلی کڑکی کہ کان پڑی بات سنائی نہ دیتی۔ ننھی سی جانیں، یہ تارے، ڈرنے لگے۔ نانی اماں نے کہا: "اب جاؤ سو رہو۔ کہانی کل ہوگی،" تارے بادلوں کے نرم نرم گالوں میں منہ چھپا کر سو رہے۔ مگر یہ بڑی بی، جو باوجود نگاہ کم ہوجانے کے روز اپنا دیا جلا کر چرخہ کاتا کرتی تھیں، کہیں پونیاں ٹھیک کرتی رہیں، کہیں اٹیرن درست کیا، مال کو سوت کر لپیٹا، چرخہ کو اٹھا کر کونے میں رکھا، اس کے بعد تھوڑا سا وظیفہ پڑھا، پھر کہیں سونے گئیں۔ ان کا قاعدہ تھا کہ آندھی آئے، پانی برسے، کچھ ہو، یہ جب تک اپنا سب کام پورا نہ کرلیتیں اور ہر چیز کو اپنے ٹھکانے نہ رکھ دیتیں، آرام نہ کرتی تھیں۔ اس تو اس کام میں نانی اماں کو دیر ہوگئی اور ذرا ہوا لگ گئی زکام ہوگیا اور دوسرے روز دن بھر بدن ٹوٹتا رہا۔ اس لئے رات بچوں نے خود کہانی کے لئے نہ کہا اور نانی اماں جیسے تیسے اپنا روز کا کام پورا کر کے سوگئیں۔

ہم یہ تو بتا ہی چکے ہیں کہ تاروں کی دنیا ہم سے کتنی دور ہے۔ ان کی چال ڈھال، طور طریق تو سب نرالے ہیں ہی، یہ بات بھی بڑے اچنبھے کی ہے کہ ان کا ایک دن ہمارے سوا سال کے برابر ہوتا ہے۔ اسی لئے سوا سال تک ہم "آدمی کی کہانی" نہ چھاپ سکے۔ اب چھاپتے ہیں۔ خدا کرے نانی اماں کی طبیعت اچھی رہے تاکہ ہم برابر یہ کہانی شائع کرتے رہیں۔

+

"نانی اماں، پرسوں تم نے جو باتیں بتائی تھیں ہیں تو وہ سب یاد نہیں رہیں یہ تو بتادو کہ یہ گولا جس پر آدمی بستے ہیں یہاں سے کتنے دن سے ہے؟" ایک تارے نے کہا۔

نانی اماں: "اچھا اچھا، بیٹا۔ میں یہی تو بتانے کو تھی۔ تم نے منہ سے بات چھین لی۔ اچھا، کچھ تم ہی بوجھو کہ یہ دنیا کب سے ہوگی؟" ایک شور مچ گیا۔ سب تارے بول اٹھے۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ ایک نے جو ذرا سیانا تھا، کہا: "نانی اماں۔ تم ہی بتاؤ، ہمیں کیا خبر؟" نانی اماں بولیں: "سنو۔ بیٹا کیسی عجیب بات ہے کہ اس گولے پر بسنے والوں کو خود خبر نہیں کہ یہ کتنا پرانا ہے۔ اور اس نے کیسے کیسے دن دیکھے ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے تک یہ آدمی سمجھتے تھے کہ ان کی زمین کی عمر بس چھ ہزار برس ہے۔ بھلا نادانی کا بھی ٹھکانا ہے! اب ان کے عقلمندوں نے سوچ بچار سے کچھ کچھ پتہ چلایا ہے۔ مگر اب بھی صحیح خبر کہاں۔ میری پرنانی کہا کرتی تھیں کہ اربوں برس ہوئے سورج اور اس کے آس پاس کے سب تارے بس ایک جلتا ہوا مادہ تھے۔ آگ کی طرح گرم اور روشن اور روئی کے گالے کی طرح بے شکل۔ کوئی تین ارب برس ہوئے اس بے شکل مواد کے الگ الگ ٹکڑے ہوگئے ایک ٹکڑے سے یہ زمین بنی۔ شروع میں یہ زمین دہکتی آگ کا ایک بڑا سا گولا تھی اور بس۔"

ایک ننھا سا ستارہ بولا: "کیوں نانی اماں، کیا اللہ میاں نے آدمی کو اس دہکتی آگ میں ڈال دیا۔ ارے رے رے۔ یہ تو کباب ہو کر رہ گیا ہوگا، بیچارہ۔ یہ جیتا کیسے رہا؟" نانی اماں نے کہا: "نہیں نہیں بیٹا اس آگ کے گولے کی لپٹ تو کوسوں تک ہر چیز کو جھلس دیتی۔ بھلا آدمی اس پر کیسے رہ سکتا تھا۔ اللہ میاں کے عجیب کارخانے ہیں۔ انھوں نے لاکھوں برس اس گولے کو بے مکین ہی رکھا۔ یہ زمین رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑی۔ اور اس پر برابر نئی نئی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اس کی شکل بدلی رفتار بدلی، کہیں ابھار ہوا تو پہاڑ بنے، کہیں دھنسی تو سمندر بہے۔ ٹھنڈی ہوتے ہوتے یہ اس قابل ہوئی کہ اس پر زندہ چیزیں رہ سکیں۔"

ایک ننھا تارا بولا: "تو بس اللہ میاں نے جھٹ اس پر آدمی کو بسا دیا؟"
نانی اماں نے جواب دیا: "نہیں نہیں بیٹا، اللہ میاں نے ایک دم آدمی پیدا نہیں کئے۔ اس نے زندگی کو جس کے متعلق یہ جانتا تھا کہ آگے چل کر یہ غرور اور گھمنڈ بھی دکھائے گی اور کبھی کبھی تو وہ خود اللہ کی بادشاہت اور اس کے قانون کو بھول کر بلکہ اس سے انکار کرنے کا حوصلہ کرے گی۔ ہاں اس نے اس زندگی کو اس گولے پر پیدا کیا تو ایک حقیر سی چھوٹی جھلی کی شکل میں۔ پہلے پابند مقام کیا، پھر چلنے پھرنے کی آزادی بھی دی تو اس غریب زندگی کی شکل کیا تھی۔ پانی میں لعاب دار، بے ہاتھ پاؤں، بے ناک کان کی ایک ذرا سی جھلک سی اور بس۔ طرح طرح کے بے ریڑھ کے جانوروں سے ہوتے ہوتے ریڑھ کی ہڈی والے جانور بنائے، مچھلیاں پیدا ہوئیں، ان سے وہ جانور بنے جو پانی اور خشکی دونوں میں زندہ رہ سکتے تھے۔ پھر زمین پر رینگنے والے اور انڈوں سے اپنی نسل چلانے والے بڑے بڑے چالیس چالیس پچاس پچاس گز کے جانور پیدا کئے۔ پھر ان پر ایسی مصیبت پڑی کہ معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سب ختم ہی ہو جائیں گے مگر اللہ میاں نے زندگی میں کچھ عجیب صفت رکھی ہے۔ یہ اپنی ہر ناکامی کو نئی کامیابی کا زینہ بنا لیتی ہے، اور ہر شکل سے ترقی کی سواری کے لئے جا بجا کا کام لینا جانتی ہے۔ ان مٹتے ہوئے جانوروں میں سے بعض نے پرواز پر پیدا شروع کیا تو ہوتے ہوتے پرند بھی ہو گئے۔ پہلے چرند کے بازو سے تھے پھر بیچ بیچ پر نکل آئے اور یہی بات تو یہ ہے کہ ان کے ادھر اُدھر اڑنے اور چہچہانے سے اس ویرانے میں بڑی چہل پہل اور رونق ہو گئی۔

دن گزرتے رہے، گذرتے رہے اور انھیں میں سے وہ جانور پیدا ہو گئے جو اپنے بچوں کو دودھ پلا کر پرورش کرتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ ایک دودھ پلانے والا جانور سب سے افضل اور برتر ہو گیا۔ یہی آدمی کہلایا۔ کہتے ہیں کہ زندگی کا پیدا کرنا، اور کبھی مصیبتیں ڈال کر کبھی اچھے مناسب حالات پیدا کر کے اسے برابر ترقی دینا یہ سب کچھ آدمی کی خاطر تھا، یعنی اس چھوٹے سے دو پاؤں والے کا بڑا مرتبہ ہے۔"

ایک ستارہ نے پوچھا: "نانی اماں۔ یہ کیا بات ہے۔ اللہ میاں نے پہلے ہی آدمی کو پیدا کیوں نہیں کر دیا۔ اس لاکھوں سال کے قصے کی کیا ضرورت تھی؟" نانی اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا: "بیٹا اللہ میاں کے کاموں کی 'کیوں' کوئی نہیں جانتا۔ بس ہم تم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس نے کیا کیا اور کیسے کیا، وہ چاہتا تو پہلے ہی آدمی کو پیدا کر دیتا، یا اس سے بہتر مخلوق سے دنیا کو بساتا اور پھر اسے گراتے گراتے اسی ناچیز اور حقیر زندگی کی جھلی تک لیجاتا اور پھر شاید اسے بھی مٹا کر دنیا کو ویسا ہی پہلے سا اجاڑ اور سنسان کر دیتا۔ مگر وہ اس دنیا پر ترقی کا یہ حیرت میں ڈالنے والا کرشمہ دکھانا چاہتا تھا اور اس نے دکھایا۔ اپنی باتوں کی مصلحت وہی خوب جانتا ہے۔"

دوسرے ستارے نے پوچھا: "آپ نے یہ جو کہا کہ آدمی دودھ پلانے والے جانوروں میں سب سے افضل اور برتر ہو گیا تو یہ کیسے؟ اس میں ایسی کونسی نرالی بات تھی جو یہ اوروں سے بڑھ گیا؟" "شاباش پوت" نانی اماں نے کہا "تو نے بڑے پتے کی بات پوچھی۔ یہ اوروں سے اسی وجہ سے بازی لے گیا۔ ایک تو اس نے اپنے اگلے دو پیروں سے ہاتھ کا کام لینا اور پچھلے دو پر کھڑا ہونا

(باقی)

علی گڑھ کالج سے نکلنے کے بعد بے سروسامان طلبا کیلئے جب اور کوئی سامان نہ تھا تو وہ کڑاکے کی سردی میں خیموں میں رہا کرتے تھے ۔ آج اسے ۱۱ سال ہوئے ہیں جسکی گیارہویں سالگرہ ۲۹ اکتوبر کو منائی جارہی ہے

رافع الزماں (مکتب) عمر ٦ سال
یہ بچہ مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر شکل بنا رہا ہے -

عبدالناصر (ابتدائی سوم) عمر ۱۰ سال
طالب علم باغبانی کی گھنٹی میں کھیتوں میں کھاد [illegible]
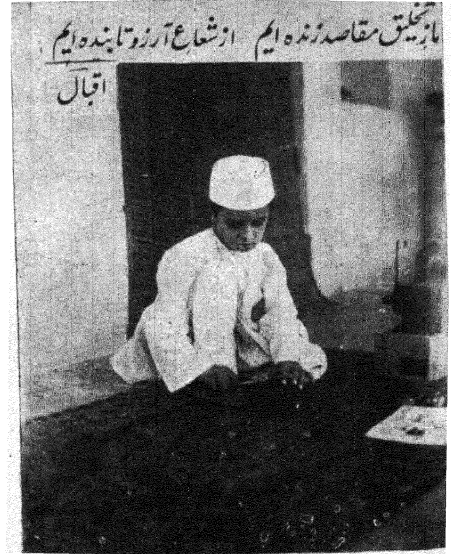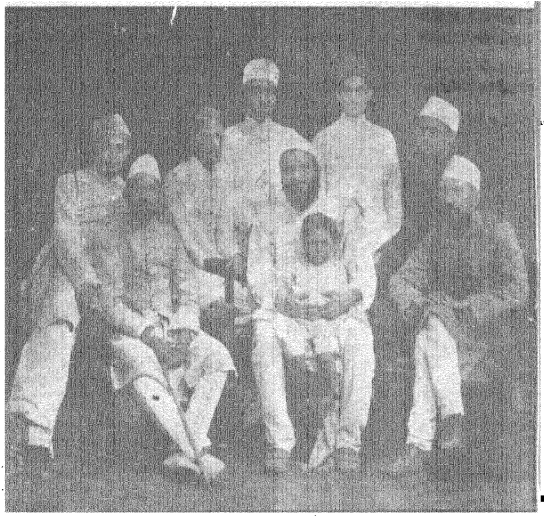
جو گزشتہ گرمیوں کی تعطیل میں بغرض سیاحت و تفریح کشمیر گئی تھی اور جس نی اپنی سیاحت کی دوران میں وہاں کی معاشرتی و سیاسی حالات کا بھی نہایت گہرا مطالعہ کیا ـ

والی بال میچ

جامعہ کی طلبا شام کی وقت والی بال میچ کھیل رہی ہیں

جنہوں نی گزشتہ جون، جو
دھلی سی کشمیر تک کا تمام سفر
طی کیا جو اپنی نوعیت کا ہندو
پہلا سفر ھی۔

(۱) حامد علی خاں صاحب ام
(۲) محمد طیب صاحب
(۳) مسعود اختر صاحب
(٤) محمد ...

کشمیر بہشت نظیر
کی
ایک سرسری سیر

لڑکو! کشمیر کا نام تو تم نے سنا ہوگا اور یہ بھی جانتے ہوں گے کہ یہ کس لئے مشہور ہے۔ کشمیر دنیا کا ایک بہت ہی خوبصورت ملک ہے اور بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ اس دنیا کی بہشت ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔ آؤ آج تمہیں اس "بہشت" کی ایک سرسری سی سیر کرائیں۔

یوں تو کشمیر میں جانے کے بہت سے راستے ہیں، لیکن دو راستے بہت مشہور ہیں، جن سے زیادہ تر لوگ آتے جاتے ہیں۔ ایک جموں کے راستہ سے جاتے ہیں اور سری نگر ہوتے ہوئے راولپنڈی سے واپس آتے ہیں۔ ہم جموں سے ہو کر چلیں گے۔ اس لئے کہ یہ ان دونوں میں سب سے اچھا راستہ ہے۔ نیچے نقشہ میں دیکھو، جموں تک آ کر ریل ختم ہو جاتی ہے اور اسی طرح اوپر بھی راولپنڈی تک ریل کا سلسلہ ہے۔ یہ دونوں شہر کشمیر کی دونوں سرحدوں پر واقع ہیں۔ ایک اس سرے پر ہے دوسرا اُس سرے پر لو یا کشمیر کے اندر خود کوئی ریل نہیں ہے۔ پھر بھلا کیسے جاتے ہوں گے۔
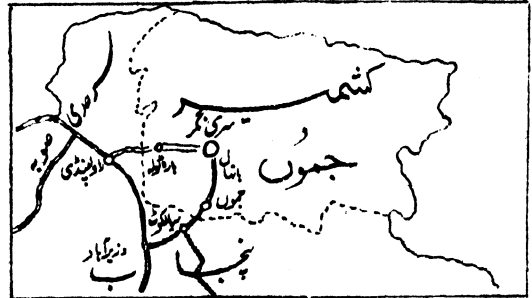
آؤ ہم تمہیں اس کے طریقے بھی بتلائیں۔ سب سے آسان اور کم خرچ طریقہ تو یہ ہے کہ جموں سے موٹر لاری لیں اور سری نگر پہنچ جائیں۔ لاری میں فی سواری پانچ روپیہ سے پندرہ روپے تک جیسا نرخ ہو، کرایہ لیتے ہیں۔ اگر لوگ زیادہ آنا شروع نہیں ہوتے ہیں تو پانچ روپے سواری پر بھی لاریاں چلی جائیں گی اور اگر مسافروں کی کثرت ہے تو فی سواری پندرہ پندرہ روپے تک لیتی ہیں۔

ایک طریقہ اور بھی ہے، اور وہ یہ کہ پیدل یا ٹٹو پر جائیں یا کچھ دور پیدل اور کچھ دور ٹٹو پر سوار ہو کر جائیں، اس کے لئے ایک اور راستہ جاتا ہے جو کسی قدر پہلے راستہ سے چھوٹا ہے۔ لیکن وقت اس سے زیادہ لگے گا اور اس میں خرچ بھی زیادہ ہوگا گو لطف بھی اسی قدر آئے گا۔

اس کے علاوہ تانگے بھی جاتے ہیں لیکن اس سے خرچ زیادہ پڑتا ہے اور لطف میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا۔

بعض منچلے نوجوان سائیکلوں پر بھی جاتے ہیں اور ابھی حال میں ہماری جامعہ کے چند لڑکے اور ایک استاد بھی سائیکلوں پر گئے تھے اور نہ صرف کشمیر میں بلکہ دہلی سے سیدھے گئے تھے اور سارا سفر اسی پر طے کیا۔ لیکن ایسے حوصلہ مند اور باہمت لوگ کم ہوتے ہیں تمہیں بھی جب ہمت ہو تو ایسا کرنا۔ اس وقت تو آؤ موٹر لاری

سے چلیں جو سب سے آسان اور کم خرچ طریقہ ہے۔
ہاں جموں تک تو ہم ریل پر آئے۔ یہاں آ کر ریل ہمارا ساتھ
چھوڑ دیتی ہے اور ہمیں ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی موٹر لاریاں
مل جاتی ہیں، جن سے ہم کرایہ چکا کر اپنے لئے جگہ مقرر کرالیں، تو
بہتر ہے۔ یہ لاریاں جب بھر جائیں گی ـــ اور جب مسافروں کی
کثرت رہتی ہے تو جلد ہی بھر جاتی ہیں ـــ تو سری نگر کو روانہ
ہونگی۔ نقشہ میں دیکھو، سری نگر کشمیر کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔
یہی اس کا پایہ تخت ہے۔ کشمیر میں شہر ایک ہی ہے اور وہ سرینگر
ہے، اس لئے تھوڑی بہت جو کچھ شہری زندگی کی چہل پہل ہے وہ
صرف اسی مقام پر ہے۔ کشمیر کے اور دوسرے قابل دید مقامات
یا تو خاص سری نگر اور اس کے گردونواح میں ہیں، یا اس سے
تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ہیں، جہاں سے آنے جانے کا سلسلہ برابر
لگا رہتا ہے۔ اس لئے عموماً لوگ پہلے سیدھے سری نگر جاتے ہیں
اور وہاں کچھ دنوں قیام کر کے پھر اِدھر اُدھر سیر کے لئے نکل جاتے
ہیں۔ ہم بھی ایسا ہی کریں گے۔

اچھا تو جموں سے لاری روانہ ہوئی۔ پہلے کچھ دور تک تو یہ مسطح
سڑک پر چلتی ہے، پھر آگے چل کر چڑھائی شروع ہونے لگتی ہے اور
یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اوپر چڑھ رہے ہیں، آگے کی سڑک ہمیں اپنی
طرف کو ڈھلوان نظر آتی ہے اور موٹر کی رفتار بھی اس ڈھلوان
کی وجہ سے کچھ کم ہو جاتی ہے۔ ہوتے ہوتے یہ چڑھائی بہت ہو جاتی
ہے اور ہمیں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم آگے کو نہیں چل رہے ہیں
بلکہ اوپر چڑھ رہے ہیں بے شک یہ ایک نہایت بلند پہاڑی ہوتی ہے
جس کے دوسری طرف ہمیں جانا ہے۔ ہم اس پہاڑی میں سے ہو کر
جا نہیں سکتے، اس لئے کہ کوئی راستہ نہیں اور نہ اس کے اندر کھود کر
اتنا بڑا راستہ کوئی بنایا جا سکتا ہے۔ مجبوراً ہم اوپر کی طرف چڑھتے ہیں۔
اور یکبارگی سیدھے چڑھ نہیں سکتے، اس لئے مینار کی طرح اس کے
چاروں طرف گھومتے ہوئے چڑھتے ہیں۔ اس طرح ہماری لاری
کو بالکل سیدھا بھی چڑھنا نہیں پڑتا، کہ جس سے وہ چل نہ سکے، اور ہم
اس کے چاروں طرف گھومتے گھومتے اس کی چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں

پہاڑی کی چوٹی تک اس طرح چڑھنا ایسا تعجب خیز اور دلچسپ
معلوم ہوتا ہے کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ ہماری لاری بانہال
مقام سے اوپر چڑھنا شروع ہوتی ہے اور وہ قطب مینار کے زینوں
کی طرح چکر لگاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ ایک طویل راستہ جب وہ طے
کر لیتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اب اس پہاڑی کے دوسری
جانب آ گئے، لیکن جونہی ہماری لاری مڑتی ہے، وہی بلندی پھر
نظروں کے سامنے آ جاتی ہے اور اس طرح وہ پھر ایک لمبی دوڑ
لگاتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ اب کے دوڑ میں وہ اس کی بلندی
کو طے کرے لیکن وہ بہت کم حصہ طے کرتی ہے، یہاں تک کہ وہ پھر
بھاگتی ہے اور دوسرا چکر لگاتی ہے۔ اس طرح چکر پر چکر لگانے
میں ہمیں کچھ کچھ سردی بھی محسوس ہونے لگتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں
کہ ہاں کچھ اوپر چڑھ رہے ہیں جہاں کی ہوا نسبتاً ٹھنڈی ہے اور
سورج کی کرنیں تیز نہیں پڑتیں۔

تم شاید تعجب کرو کہ جب ہم اوپر چڑھتے ہیں تو ہم کو ہوا کیوں
ہلکی اور سورج کی کرنیں کیوں کم تیز معلوم ہوتی ہیں، حالانکہ ہم سورج
سے قریب اور کرۂ ہوائی کے اندر پہنچتے جا رہے ہیں۔ اس کا سبب یہ
ہے کہ جتنے ہم اوپر چڑھیں گے۔ اسی قدر سورج کی کرنیں ہم پر
ترچھی اور تعداد میں کم پڑیں گی۔ اس لئے ہمیں گرمی کم محسوس ہوگی
سامنے کے صفحہ پر نقشہ میں دیکھو کہ ا مقام پر جو پہاڑ کی چوٹی ہے ب
مقام سے جو میدانی حصہ ہے، آفتاب کی شعاعیں ترچھی اور
تعداد میں کم پڑتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جب ہم کسی بہت بلند پہاڑ

پر چڑھتے ہیں تو ہمیں سخت سردی لگنے لگتی ہے اور ہم بہت جلد ہانپنے لگتے ہیں، اس لئے کہ ہمارے پھیپھڑوں کو کافی ہوا نہیں ملتی اور وہ ہوا لینے کے لئے جلد جلد اپنا کام کرتے ہیں

غرض اس طرح چڑھنے میں اگر تم اپنی موٹر لاری سے گردن نکالکر نیچے دیکھو تو تمہیں پہاڑی کے گرد لمبے لمبے راستے اس طرح معلوم ہونگے گویا مکڑی نے جالے تن دئے ہیں۔ بڑے بڑے کھیت اور میدان بچوں کے کھیلنے کی کیاریاں معلوم ہونگی۔ دریا اور چشمے نالیاں دکھائی دینگی دوسری لاریاں جو تمہارے پیچھے آرہی ہیں، بچوں کے کھیلنے کی گاڑیاں نظر آئیں گی۔ اس سے تم اندازہ کرسکتے ہو کہ تم کتنی بلندی پر ہو!

لیکن ابھی تمہیں اور بلندی پر چڑھنا ہے جب کہیں جاکر تم اس چڑھائی کو پار کرسکوگے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک پہاڑی پر چڑھتے

سورج کی روشنی ۱- پہاڑ کی چوٹی پر میدانی حصہ پر
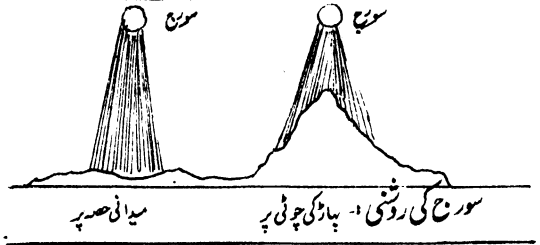
چڑھتے راستہ دوسری پہاڑی پر جانے لگتا ہے اس لئے کہ یہ پہاڑیاں آپس میں ایک دوسرے سے ملی ہوتی ہیں اور پھر لاری اس پر اسی طرح سے چکر کاٹنے لگتی ہے

غرض اس طرح ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر چکر کاٹتے ہوئے ہماری لاری اتنی اوپر پہنچ جاتی ہے کہ وہاں سے بعض برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں ہم سے نیچے نظر آنے لگتی ہیں، لیکن اس پر بھی یہ بلندی کٹتی نظر نہیں آتی اور اس وقت ہماری لاری ایک لمبے تاریک سرنگ سے ہوکر اس پہاڑی کی چوٹی کے دوسری طرف پہنچتی ہے، اس سرنگ سے گزر کر دوسری جانب پہنچنا ہوتا ہے کہ ایک نہایت خوشنما سرسبز حیرت انگیز منظر نظر کے سامنے آجاتا ہے، جسے دیکھ کر خوشی سے دل باغ باغ ہونے لگتا ہے۔

سامنے دور برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی چوٹیاں ہیں جن کے نشیبی حصہ پر اونچے اونچے درختوں کے جنگل ہیں۔ یہ سبز درختوں کے جنگلات اور ان پر سفید چوٹیوں کی پٹی گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے سبز مخملی چادر میں سفید موتیوں کی جھالردار گوٹ لگادی ہے۔ ان پہاڑیوں کے دامن میں اُبلتے ہوئے چشمے اور بل کھاتی ہوئی ندیاں اور نالے، ان کے گرد وپیش شالی (دھان) کے لہلہاتے ہوئے کھیت یہ سب مل کر ایک ایسا دلچسپ اور پر کیف منظر نظروں کے سامنے ہوتا ہے کہ گھنٹوں دیکھتے رہو اور پھر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ آخر کب تک؟ ڈھلتا ہوا آفتاب اس بات کی خبر دینے لگتا ہے کہ شام سے پہلے اس بلند مقام سے اُتر چلو۔ ورنہ رات میں خیر نہیں۔

غرض اسکے بعد لاری آہستہ آہستہ نیچے اُترتی ہے اور جس طرح پیچدار راستوں کو طے کرتی ہوئی وہ اتنی اوپر آئی تھی اسی طرح کے پُرپیچ راستوں سے وہ نیچے اُترتی ہے لیکن جتنا وقت اس کے چڑھنے میں لگا تھا اس کا چوتھائی بھی اُترنے میں نہیں لگتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی کرتے کتنی دیر لگتی ہے اور تنزل وانحطاط جب آتا ہے تو کچھ بھی دیر نہیں لگتی۔

اتنی بلندی سے اُترنے کے بعد ہماری لاری اب مسطح اور سیدھی سڑکوں پر چلتی ہے جس کے کنارے کنارے پانی سے بھرے ہوئے شالی کے کھیت ہیں اور جس کے دونوں جانب سفیدار کے سڈول اونچے اونچے درختوں کی قطاریں چلی گئی ہیں جو خود ایک خوشنما منظر نظر کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ انہی سڑکوں سے گزرتی ہوئی ہماری لاری اپنی منزل مقصود پر آپہنچتی ہے اور ہم سری نگر میں آکر اُتر جاتے ہیں

سری نگر اور اس کے گرد ونواح کے مقامات کی سیر آئندہ ہوگی

تعلیم

بکری کا بچہ ٹیلے پر چڑھنا اپنی ماں کی پیٹھ پر سے شروع کرتا ہے۔

شیر بڑے بڑے جانوروں کا شکار کرنے کی مشق شیرنی کی دُم سے کرتا ہے۔
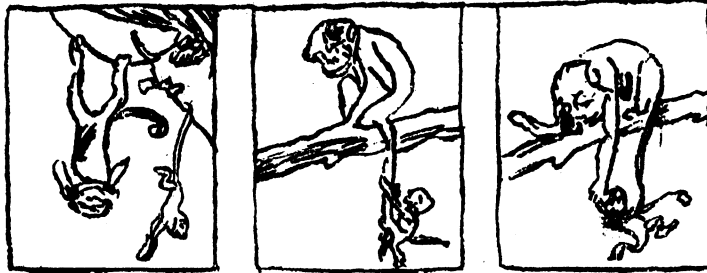
اور بندر درخت کی چوٹی پر آہستہ آہستہ نیچی ڈالیوں سے چڑھنا سیکھتا ہے۔
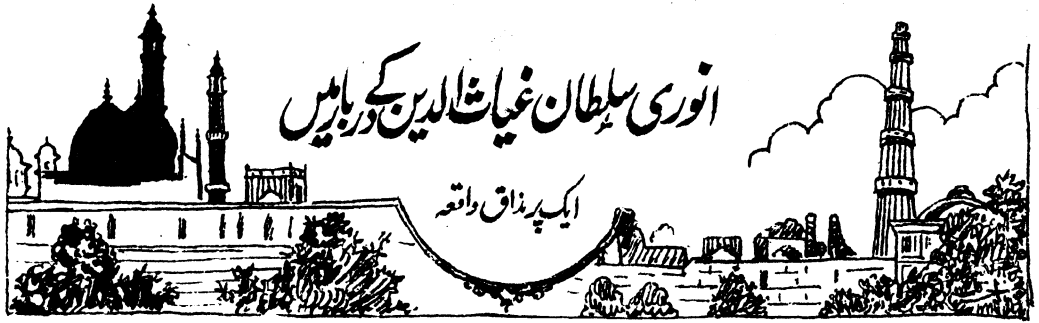
سلطان غیاث الدین تغلق ہندوستان کے مشہور بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہے جس نے ۱۳۲۰ء میں تغلق خاندان کی بنیاد ڈالی اور ۱۳۲۵ء تک ہندوستان کے تخت پر حکومت کی۔ انوری ایران کا ایک بہت مشہور شاعر گذرا ہے جس نے فارسی زبان میں بہت سے اچھے اچھے قصیدے لکھے۔

ایران کا مشہور شاعر انوری ہندوستان کی شہرت سنکر ایران سے روانہ ہوا، بڑی بڑی مصیبتوں سے یہ دور دراز سفر طے کرنیکے بعد ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں پہونچا، سلطان غیاث الدین یہاں اسوقت حکومت کر رہا تھا۔ اسکے دربار میں بڑے بڑے علما، اور شعراء جمع تھے، بادشاہ اُن کی بڑی قدر کرتا تھا۔

انوری نے دہلی پہونچکر بادشاہ کے دربار میں جانے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی صورت نظر نہ آئی کہ یہ بدیشی آدمی ہندوستانی دربار میں کیسے پہنچے، ہزار تدبیریں کیں لیکن کچھ نہ ہوا،

انوری اپنی ناکامی سے نا امید نہیں ہوا اور وہ سوچتا رہا کہ کس طرح بادشاہ کے دربار میں پہونچے، آخر اسے ایک تدبیر سوجھی اُسنے کہا کہ مصیبت میں کوئی شخص ساتھ نہیں دے سکتا۔ اور نہ کسی کی سفارش کام آسکتی ہے، ایران میں اگرچہ میری شہرت ہے لیکن اہل ہند کیسے یقین کریں گے کہ ایران کا زبردست شاعر انوری میں ہی ہوں انوری نے ایک نہایت ہی پر مذاق طریقہ اختیار کیا یعنی وہ شہر سے باہر ایک دھوبی کے یہاں جاکر ایک گدھا چند دن کے لئے کچھ روپیہ دے کرلے آیا سرائے میں پہونچکر جہاں وہ ٹھیرا تھا اس نے اپنے سب کپڑے اُتار دیئے صرف ایک لنگوٹی باندھ لی، تمام جسم پر مٹی لگالی ایک طرف کی ڈاڑھی مونچھ، ابرو استرے سے مونڈ ڈالی اور ایسے ہی ایک طرف کے سر کے بال صاف کر دیئے، اور پھر سیاہی اور سفیدی سارے منہ پر ملکر عجب طرح کی مجنون سی شکل بنالی، اور گدھے پر اسکی دم کی طرف اپنا منہ کرکے بیٹھ گیا اور دم کو لگام بنالیا،

ایسی عجیب شکل بناکر انوری شہر کی طرف چلا، تمام لوگ بڑے چھوٹے اسکے پیچھے ہولئے اور ایک شور غل ہونے لگا، کوئی تالیاں بجاتا، کوئی ڈھیلے مارتا غرض ہر شخص دیوانہ اور پاگل سمجھ کر چھیڑتا اور انوری کے منہ میں جو آتا بکتا۔

شہر میں ہر طرف مشہور ہوگیا کہ ایک پاگل آدمی کہیں سے آگیا ہے اور اسطرح گدھے پر بیٹھا گھوم رہا ہے لوگ دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑے، انوری بھی عجیب عجیب حرکتیں کرتا کبھی روتا، کبھی ہنستا، کبھی چیختا چلاتا اور چھیڑنے والوں کو گدھے سے اتر کر مارنے کے لئے دوڑتا تو کوئی گدھا دوسری طرف ہانک دیتا، یہ پھر اپنا گدھا لینے کے لئے گرتا پڑتا ہوا دوڑتا اور لوگ پھر اس پر تالیاں بجاتے اور دھکے دیتے تو وہ چار دن شانے چت زمین پر گر پڑتا پھر اس کے اوپر کچھ لوگ اور گر جاتے۔ اس طرح یہ مجمع شور و غل کرتا قلعہ سے گذرتا ہوا شہر سے باہر چلا گیا شام کا وقت ہوگیا اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس آگئے، انوری بھی اپنے گھر گیا گدھے کو دھوبی کے یہاں پہنچا دیا اور خود غسل کرکے کپڑے بدل ڈالے۔

دوسرے دن انوری نے پھر ایسا ہی کیا، اس دن پہلے سے بھی زیادہ مجمع ہوگیا لوگوں کو خوب لطف آتا تھا، خوب چھیڑتے اور ہنستے تالیاں بجاتے، اسی طرح قلعہ سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر چلے گئے۔

یہ خبر بادشاہ کے یہاں بھی پہنچی کہ ایک پاگل شہر میں آیا ہے جو تمام لوگوں کے لئے تماشہ بن گیا ہے۔ بادشاہ کو بھی دیکھنے کا شوق ہوا اور حکم دیا کہ اب وہ جس وقت آئے مع تمام مجمع کے قلعہ میں داخل کر لیا جائے۔

شاہی حکم ہوتے ہی تمام شہر میں سپاہی پھیل گئے، چار بجے اور پھر وہی شور غل شروع ہوا معلوم ہوا کہ پاگل شہر کے اندر داخل ہوگیا ہے، تمام لوگ دیکھنے کیلئے ٹوٹ پڑے اور یہ مجمع شور و غل کرتا ہوا آہستہ آہستہ شاہی قلعہ کی طرف چلا، جب قلعہ کے قریب پہنچا تو قلعہ کا دروازہ کھول دیا گیا اور سپاہیوں نے اس پاگل آدمی کے ساتھ تمام لوگوں کو قلعہ کے اندر داخل کر دیا بادشاہ نہایت ہی شوق میں کھڑا ہوا اپنے امراء اور وزراء کے ساتھ انتظار کر رہا تھا۔ مجمع کے پہنچتے ہی اس نے حکم دیا کہ قریب لاؤ اور پھر بادشاہ بڑے شوق کے ساتھ دیکھنے لگا۔ بنے ہوئے پاگل انوری کی امید بر آئی اس نے اپنے دل میں کہا کہ اچھا موقع ہے بادشاہ سامنے کھڑا ہے اس نے ایسی ایسی پاگل پنے کی حرکتیں شروع کیں کہ ہنستے ہنستے بادشاہ کے پیٹ میں بل پڑ گئے، تقریباً ایک گھنٹہ تک بادشاہ یہ تماشہ دیکھتا رہا تمام لوگ چھیڑتے تھے اور تالیاں بجاتے تھے تاکہ جہاں پناہ خوش ہوں۔

ایک گھنٹے کے بعد بادشاہ نے کہا کہ اب ہنسنے کی طاقت نہیں اس لئے یہ کھیل بند کیا جائے اور اس پاگل سے کہا جائے کہ بادشاہ بہت خوش ہوا ہے جو مانگنا ہو مانگ۔ پاگل نے اور بکنا شروع کیا اور بادشاہ کو برا بھلا کہنے لگا بادشاہ اس حرکت پر اور ہنسنے لگا، اور پھر کہا کہ جو کچھ مانگنا ہو مانگ۔ ادھر بادشاہ بار بار کہتا کہ کیا انعام چاہتا ہے، اُدھر پاگل آدمی اور بکتا جھکتا۔ بڑی دیر کے بعد پاگل نے کہا غریب پرور سلامت پاگلوں کو بھلا کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے، بس ایک گذارش ہے جان بخشی ہو تو عرض کروں۔ بادشاہ نے کہا ہاں کہو کیا ہے۔ پاگل نے کہا ایک رُباعی سُن لیجئے تمام لوگ اور بادشاہ متحیر تھے کہ یہ پاگل آدمی کیسے شاعر ہوگیا، تمام لوگ غور سے سننے لگے، پاگل نے اجازت پاتے ہی نہایت ہی اچھی آواز میں یہ رباعی پڑھنی شروع کی ؎

بعد ازیں گیتی نزاید زیر چرخ چنبری	شاہ چوں سلطاں غیاث الدین گدا چوں انوری
ختم شد بر تو سخاوت بر من مسکیں سخن	چوں شجاعت بر علیؑ بر مصطفےٰ پیغمبری

(یعنی یہ دنیا اب نہ غیاث الدین ایسا بادشاہ پیدا کر سکتی ہے اور نہ انوری جیسا گدا۔ جس طرح ہمارے پیغمبر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوگئی اور بہادری حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر، اسی طرح اے سلطان غیاث الدین تجھ پر سخاوت ختم ہوگئی ہے اور تیرے بعد کوئی دوسرا سخی نہ پیدا ہوگا اور مجھ پر شعر و شاعری تمام ہوگئی اور مجھ جیسا کوئی شاعر بھی آئندہ پیدا نہ ہوگا)

بادشاہ اس رباعی کو سُن کر پھڑک اٹھا اور بہت خوش ہوا، فوراً اس نے اپنے دربار میں داخل کر لیا اور بڑی قدر و منزلت کی۔

سیکھا۔ دوسرے اس کا دماغ اوروں سے تیز تھا۔ یہ اور جانوروں سے بہت کمزور تھا، اوروں سے زیادہ بے بس تھا مگر بس اپنی سمجھ سے نہیں اور اُس پاس کی سب چیزوں کو زیر کرنے کی نئی نئی تدبیریں نکال سکتا تھا اور اپنے ہاتھوں سے عجیب عجیب آلات اور اوزار بنا لیتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں پر اپنے دل کا حال ظاہر کرنے کیلئے بول چال کی بڑی انوکھی ترکیب نکالی اور پہلے ہی دن سے اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ جب کبھی اس پر کوئی مشکل آن پڑتی تو جہاں یہ ایک طرف اپنی عقل سے کام لیتا وہاں کچھ نرالے انداز سے اوپر آسمان کی طرف بھی نظر اٹھاتا اور اللہ میاں سے اپنی لو لگاتا تھا۔ اسے کبھی جان کر اور کبھی بے جانے اللہ میاں پر بڑا بھروسہ اور یقین تھا۔ اور اسی عقل اور اسی یقین نے اس دو پاؤں دو ہاتھ والے کو زمین پر سر بلند اور کامراں بنایا۔"

سب سے ننھا ستارہ اونگھنے لگا اور نیند کا ایک جھونکا ایسا آیا کہ اس کا سر نانی اماں کے کاندھے سے جا ٹکرایا۔ نانی اماں کی پونی بھی ختم ہوگئی تھی انھوں نے کہا: "اچھا بس، اب کہانی کل ہوگی۔ اب جا کر سو رہو"

ڈاکٹر سن یت سین

جمہوریت چین کا بانی

شہر کنیٹن کے قریب ایک گاؤں ہے جسے ہیانگ شان کہتے ہیں اسی میں جمہوریت چین کا بانی ڈاکٹر سن یت سین ۱۲ نومبر ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک اچھا اور نیک کسان تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کی بڑی عزت اور تعظیم کرتے تھے۔ اسی گاؤں میں ایک مدرسہ تھا۔ اکثر لوگ پڑھنے کے لئے جایا کرتے تھے۔

سن یت سین بھی اور لڑکوں کی طرح وہاں جاتا تھا، اور اسی مدرسہ میں ابتدائی تعلیم کی منزل طے کی اس وقت اسکی عمر ۱۳ برس کی ہو چکی تھی۔ اس کے بوڑھے باپ نے دیکھا کہ لڑکا ہونہار معلوم ہوتا ہے اس لئے مزید تعلیم کے لیے اس کو ہونولولو بھیجنا چاہا۔ جب سن یت سین نے سنا کہ باپ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسے ہونولولو بھیجدیا جائے گا تو وہ کچھ رنجیدہ ہوا اس لئے کہ اسے اپنے باپ سے اسقدر محبت تھی کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ کہاں کینٹن اور کہاں ہونولولو دونوں جگہوں میں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ اپنے باپ کو چھوڑکر وہ اتنی دور کیسے رہ سکتا تھا، مگر اسکو یہ بھی خیال ہوا کہ باپ کی نافرمانی کرنا ایک گناہ عظیم ہے اور باپ نے جب یہ حکم دیدیا ہے کہ میں ہونولولو چلا جاؤں، تو پھر کیسے انکی بات ٹالی جاسکتی ہے وہ اس خیال میں محو تھا، اور انتہائی تردد کے ساتھ جانے اور نہ جانے کا فیصلہ کر رہا تھا

کہ دفعۃً اس کے محبت اور شفقت آمیز باپ نے آکر کہا "اے میرے عزیز بیٹے! تمہیں میری جدائی کا رنج ہے، اور رنج ہونا بھی چاہیئے مگر یاد رکھو گھر میں بیٹھکر تم کو کچھ نہیں مل سکتا ہے۔ اس وقت تو ایک بوڑھا باپ اور ایک بوڑھی ماں زندہ ہے جب ہم دونوں مرجائینگے تو پھر کون تمہاری خبرگیری کرے گا؟ اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنے مرنے سے قبل تم کو اس قابل بنا جائیں کہ تم خود اپنی آپ نگرانی اور خبرگیری کرسکو محبت کی وجہ سے تم تو اس وقت مجھ سے جدا ہونا نہیں چاہتے لیکن ایک دن ایسا آیگا جبکہ اللہ میاں تمہارے بوڑھے ماں باپ کو اپنے ہاں بلالینگے تو تم اس وقت کیا کروگے؟ کیا تم ہم کو روک سکوگے؟ روکنا تمہارے بس میں نہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ تم ذرا سے عارضی رنج کو برداشت کرو اور صبر و استقلال کے ساتھ دنیا میں انسان بننے کی کوشش کرو جب تم خود انسان بن جاؤگے تو ہر شخص تم کو عزت کی نگاہ سے دیکھے گا تمہاری عزت خاندان کی عزت ہے اور تمہاری ذلت خاندان کی ذلت ہے اگر تم اس وقت میری بات نہ سنوگے اور پڑھنے لکھنے کے لئے تکلیف برداشت کرنا پسند نہ کروگے تو بالآخر دنیا میں ذلیل ہوگے اور تمہارا خاندان وطن اور قوم سب خاک میں

مل جائیں گے۔ مرد بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تم سفر کرو باہر کی کھلی ہوا کھاؤ لوگوں سے ملو تجربہ حاصل کرو اپنے دماغ کو علم و ہنر سے ترو تازہ کرو۔ دنیا کو دیکھو۔ لوگوں کی طرز زندگی پر غور کرو اغیروں کی خوبیوں سے سبق لو اور ان کی برائیوں سے بچو۔ اور سب سے ضروری بات یہ کہ لوگوں سے محبت کے ساتھ پیش آؤ اچھی صحبت میں رہو۔ کیونکہ زندگی میں کامیابی کا راز اچھی صحبت ہی میں مضمر ہے جسے انسان کی خدمت کہتے ہیں وہ اچھی صحبت ہی میں رہ کر حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر اچھی صحبت تم نے چھوڑ دی۔ اور انسانی خدمت سے کنیاتے رہے تو یہ سمجھ لو کہ تم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی خودغرض نہیں۔ کیونکہ خودغرض وہ ہے جو کسی جماعت کے ساتھ ملکر کام کرنا نہ چاہے۔ ہاں ایک بات اور ہے اپنے عقیدہ پر یقین رکھو ارادے پر جمے رہو اور جو کام کرو پوری ایمانداری سے کرو۔ وطن کے وفادار خادم اور قوم کے سچے خیر خواہ بنو۔ اور اس بات کو زندگی کا سب سے بڑا اصول سمجھو کہ سید القوم خادمھم (قوم کا سردار وہ ہے جو ان کا خادم ہو)

اس وقت میں تم کو اپنے پہلو سے جدا کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ تم باہر جا کر عقلمند اور ہوشمند بنکر واپس آؤ عقلمندی اور ہوشمندی یہ چیزیں تمکو اس چھوٹے سے گاؤں میں ہرگز نہ ملیں گی ان کی تلاش کرنے کیلئے تمہیں محنت کرنی پڑیگی۔ مصیبتیں جھیلنی ہونگی تکلیف برداشت کرنا ہوگا۔ صبر و استقلال سے اپنے ارادہ پر جمے رہنا پڑیگا۔ اور اس کو حاصل کرنے کے لئے تمہیں مسلسل کام کرنا ہوگا۔ تب کہیں جاکر کامیابی تمہیں حاصل ہوگی۔ خاندان تمہارے نام سے روشن ہوگا وطن تمہارے نام سے چمکیگا اور تم خود ایک انسان کہلانے کے مستحق ہوگے "

ان باتوں کو سنتے ہی سن یت سین کی معصوم آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پیارے لہجے میں اپنے باپ سے کہنے لگا " ابا جان میں آپ کی نافرمانی کیسے کر سکتا ہوں؟ جب آپ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھ کو ہونولولو ہی جانا ہوگا تو میں خوشی سے جانے کیلئے تیار ہوں، مگر ہاں آپ کی جدائی کا مجھے بہت رنج ہے۔ میں اس رنج کو کیسے بھلا سکوں خیر میں اس کو دبانے کی کوشش کرونگا۔ اور ہر قسم کی تکلیف برداشت کرتا رہوں گا، اور جب تک میں باہر رہونگا، برابر اپنی خیریت سے آپکو اطلاع دیتا رہونگا "

غرض، ایک پر لطف شام کو سن یت سین اپنے گاؤں ہیانگ شان سے نکلا اور شہر کنٹین میں پہنچا، وہاں سے جہاز پر سوار ہوا، اور ہانک کانگ اموائی اور شنگھائی سے ہوتا ہوا ہونولولو میں پہنچا۔ ہونولولو ایک پرلطف اور فرحت افزا شہر ہے جو دریا جاپان کے مغربی کنارے پر واقع ہے جہاں سے سیر یا ریلوے کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسی شہر میں سن یت سین پانچ سال تک رہا، اور اپنی ثانوی تعلیم ختم کی چونکہ یہ شہر ایک بندرگاہ ہے اس لئے یہاں لوگوں کی آمد و رفت بھی بہ کثرت ہوتی ہے۔ انگریزی روسی، جرمنی، فرانسیسی، اطالوی اور جاپانی سافر جو سیریا ریلوے سے آتے اور جاتے ہیں، انہیں ضرور کچھ نہ کچھ عرصہ تک اسی بندرگاہ میں قیام کرنا پڑتا ہے۔ مختلف لوگوں کے چال چلن، عادات و اطوار وضع قطع افکار و خیالات کو دیکھکر سن یت سین کے دل میں یہ سوالات پیدا ہونے لگے کہ یہ لوگ دولتمند کیوں ہیں؟ تازہ و توانا کیوں ہیں؟ مضبوط اور قوی کیوں ہیں؟ خوش اور بے فکر کیوں ہیں؟ زندہ دل اور ہشاش بشاش کیوں ہیں؟ کیا انکو کوئی خزانہ غیب ملگیا ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ خوش و خرم اور فارغ البال ہیں؟ اس کا کیا سبب ہے جس سے انکو تمام دنیا میں شان و شوکت حاصل ہے؟ اس وقت سے سن یت سین کی طبیعت میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ یہ انقلاب کیا تھا آگے چلکر پیام تعلیم کے پیارے بچوں کو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

زمانہ بہت تیزی سے چلتا ہے۔ وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اگرچہ سن یت سین کو تعلیم کی غرض سے ہونولولو میں پانچ سال تک رہنا پڑا

مگر چشم زدن میں یہ پانچ سال ختم ہوگئے۔ ہائی اسکول کی ثانوی تعلیم سے فارغ ہوتے ہی وہ ہانگ کانگ میں واپس آیا، اور کوئنیس کالج میں داخل ہوگیا۔ یہاں کے زمانۂ قیام میں اسنے اپنے عزیز وطن کی ہر قسم کی کمزوری دیکھی خرابی دیکھی سکوت اور مردنی کی زندگی دیکھی تو اسکے دل سے بے اختیارانہ ایک ٹھنڈی سانس نکلی سر کو پکڑ کر یہ سوچنے لگا کہ کس طرح ان کمزوریوں کو دور کیا جائے؟ ان خرابیوں کی اصلاح کیجائے اور سکوت اور مردنی کی زندگی میں حرکت اور جان پیدا کردی جائے؟ ایک طرف تو وہ یہ سوچ رہا تھا اور دوسری طرف جب وہ کوئنس کالج سے فارغ ہوا، تو میڈیکل کالج میں داخل ہوا، اس لئے کہ وہ چاہتا تھا کہ قبل اسکے کہ انسان کی روحانی اور اندرونی بیماری کی دوا تجویز کرسکے وہ جسمانی اور خارجی بیماری کے علاج کا سبق اور تجربہ حاصل کرے اور ان جسمانی علاج کے تجربات سے ایک اصول تیار کرے جسکی تکمیل سے وہ روحانی تکلیف بھی رفع ہو سکتی ہے۔ طبی پیشہ کا اختیار کرنا درحقیقت اس کی قومی بیماریوں کے علاج کا آغاز تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب کسی شخص کے جسم میں روگ ہو تو اس کے لئے دوا دینا اور علاج کرنا ضروری ہے ورنہ وہ بیچارا مارے تکلیف کے تڑپ کر مرجائے گا۔ اسی جسمانی علاج سے اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر کسی قوم میں معاشرتی اور اندرونی بیماریاں ہوں تو اس کو دور کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ ورنہ وہ قوم تھوڑے دنوں میں فنا ہو جائیگی۔ اور روئے زمین پر اس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہیگا اس نے دیکھا کہ چینی قوم نہایت پستی و کمزوری اور ذلت و خواری کی حالت میں ہے۔ اسکو مصیبت کی آگ سے نکالنا، اس کی تکلیفوں کو دور کرنا، اسکو مضبوط اور طاقتور بنانا، اہل فکر کے نزدیک ایک انسانی فرض ہے۔ جسمانی اور انفرادی علاج کے لئے ہزاروں حکیم اور ڈاکٹر موجود ہیں مگر روحانی اور قومی علاج کے لئے کوئی اچھا حکیم یا ڈاکٹر نہیں ملسکتا ایسی حالت میں سن یت سین کے دل میں کیونکر یہ خیال پیدا نہ ہوتا! اور کیونکر اس کو درد وطن کا احساس نہ ہوتا! غضب یہ ہے کہ اسی زمانہ میں چین و جاپان کے درمیان جنگ شروع ہوگئی تھی اور ایسا اتفاق ہوا کہ ۱۸۹۴ء میں جاپان نے چین کو شکست دیدی۔ اسی شکست کو دیکھ کر سن یت سین کا جوش وطن بھڑک اٹھا اور اسی وقت سے وہ

کون ہے جسے کھیل نہ بھاتا ہو۔ تمام کاموں کے لئے کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے ذرا بھی نہیں۔ چھٹی ہوئی کتاب طاق پر، لڑکے کھیل کے میدان میں۔ بھول بلبل کو، چراغ پروانہ کو جس قدر کھینچتا ہے، اسی قدر کھیل کا میدان لڑکوں کو۔

یہ کیوں؟ اسلئے کہ کھیل ایک نہایت ہی پرلطف مشغلہ ہے۔ تاہم اس لطف کے پیچھے، جو کھیل سے حاصل ہوتا ہے، ایک سنجیدہ مقصد بھی ہے، یعنی تربیت۔ یوں تو ہر کھیل سے کچھ نہ کچھ تربیت ہوتی ہے۔ مگر سب سے زیادہ ان کھیلوں سے جن میں دو ٹیموں کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے، مثلاً ہاکی، فٹ بال وغیرہ وغیرہ

کیا تم بتا سکتے ہو کہ کھیل سے کس قسم کی تربیت حاصل ہوتی ہے؟ تم میں سے جو ذہین لڑکا ہوگا اس کی سمجھ میں شاید ایک بات آجائے کہ کھیل سے جسمانی تربیت ہوتی ہے، جسم کے اعضا پر زور پڑتا ہے۔ خون رگوں میں اچھی طرح دوڑنے لگتا ہے۔ اور پھیپھڑا صاف ہوا زیادہ مقدار میں کھینچتا ہے۔ اس سے آدمی کی صحت اچھی ہو جاتی ہے اس کے اندر توانائی اور چستی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ خوش و خرم رہتا ہے۔ مگر کھیل سے صرف جسمانی تربیت نہیں ہوتی، ذہنی تربیت بھی ہوتی ہے۔ کھلاڑی اپنے دماغ کو استعمال کرنے کی عادت اسی طرح ڈالتا ہے جس قدر دماغ کو استعمال کرنے کی عادت ہونی چاہئے۔ ہاکی میچ میں دیکھو کس ہوشیاری سے کام لیتے ہیں۔ اپنے مخالف سے گیند چھیننے کیلئے کیسی کیسی ترکیبیں نکالتے، اور پالینے کے بعد آگے بڑھانے کے لئے کیسے کیسے داؤ پیچ کرتے ہیں۔ نازک اوقات میں جلدی سے طے کرلیتے ہیں کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟ ہر وقت چوکنا رہتے ہیں اور نہایت یکسوئی سے بلا کسی طرف دھیان بٹائے اپنا کام کرلیتے ہیں۔ یہ کھیل کی مشق سے بڑھی ہوئی ذہانت کی نشانیاں ہیں۔

اسی طرح کھیل سے اخلاقی تربیت بھی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے انتھک کوشش کا عملی سبق ملتا ہے۔ اس بات کی عادت پڑتی ہے کہ آدمی اگر کسی مقصد کو سامنے رکھ کر کوشش کرے تو نہایت صبر و استقلال تندہی اور ہمت سے آخری وقت تک مصروف رہے۔ کامیابی کی شیخی اور ناکامی کی مایوسی کا اثر اپنے اوپر نہ پڑنے دے۔ اور کوشش کرے کہ شروع سے آخیر تک کام یکساں ہوتا رہے۔

اس کے علاوہ آدمی ایمانداری، قانون کی پابندی، اور احکام کی اطاعت بھی سیکھتا ہے، نیز ہمدردی، ایثار اور ملکر کام کرنے کا عادی بنتا ہے۔

بسا اوقات لڑکے کھیل کے اصلی راز کو بھول جاتے ہیں۔ اور صرف تفریح اسکا مقصد سمجھ لیتے ہیں۔ یہ نادان اور نقصان اٹھانے والے ہیں۔ جس وقت کوئی میچ ہو۔ ہاں اس وقت کھیلنے والوں کے ذاتی اوصاف کے متعلق رائے قائم کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے۔ اور اکثر اوقات انکی اندرونی بھلائیوں اور برائیوں کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ جسمانی

طاقت اور ذہانت کا پتہ تو با آسانی چل جاتا ہے۔ مگر اخلاق اور چال چلن کا اندازہ بھی غور کرنے والے کیلئے زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ آؤ، ہم تمہیں بتلائیں کہ اس کا اندازہ کس طریقہ سے کیا جاتا ہے۔

پہلے یہ یاد رکھو کہ آدمی جیسا کھیل کے میدان میں ہوگا ویسا ہی زندگی کے دوسرے موقعوں پر۔ اب مثلاً ہاکی کے کھیل کو لو بعض لوگ عادی ہوتے ہیں، بلکہ جان بوجھ کر اس کی مشق کرتے ہیں کہ غلط جانب سے گیند کو اس طرح ماریں کہ رفری پکڑ نہ سکے۔ یہ بے ایمانی ہے اور ایسا کرنے والا اپنے فائدے کیلئے دوسروں کو دھوکا دینے والا ثابت ہوگا۔ کچھ لوگ اپنا کمال دکھانے کیلئے ہمیشہ گیند اپنے پاس رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چاہے موقع ہو یا نہ ہو کھیل کے خراب ہونے اور وقت ضائع ہونے کی پروا نہیں کرتے یہ خود غرض ہوتے ہیں اور اپنے نام و نمود کی خاطر کل جماعت کا نقصان کرا دیتے ہیں تامل نہیں کرتے۔ بعض جیت کر مغرور یا ہار کر رنج کی وجہ سے کھیل میں ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ ان میں استقلال و ہمت کی کمی ہوتی ہے یہ لوگ دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ اسی طرح بار بار اپنی جگہ چھوڑ کر دوسرے کی جگہ چلا جانے والا ظاہر کرتا ہے کہ اسکی طبیعت میں نظم نہیں ہے۔ لاپروائی سے کھیلنے والا ظاہر کرتا ہے کہ اسے اپنے فرائض کا احساس نہیں رہتا۔ وغیرہ وغیرہ

لڑکو تمہیں چاہیئے کہ تم کھیل کے وقت کھیل کے اصلی مقصد کا بھی خیال رکھا کرو۔ اس سے ایک فائدہ جو فوراً ظاہر ہوگا وہ یہ ہے کہ تمہارا کھیل اچھا ہو جائے گا اگر تمہاری ٹیم کے سب لڑکے ایسا ہی کریں تو ساری ٹیم کا کھیل اچھا ہو جائے گا کیونکہ ٹیم وہی اچھا کھیلتی ہے جسکے کھلاڑی جسمانی، دماغی، اور خاص کر اخلاقی اعتبار سے بالکل ٹھیک حالت میں ہوں مگر سب سے زیادہ قدر کے قابل فائدے وہ ہیں جو تمہیں آئندہ زندگی میں حاصل ہونگے جب تم اس بڑے کھیل کے میدان میں داخل ہوگے جس کو دنیا کہتے ہیں۔ وہاں بھی ایک "گول" (مقصد) ہوگا جس کے لئے تمہیں اپنے جسم و دماغ اور اخلاق کی تمام قوتیں صرف کرنی پڑیں گی۔ وہاں بھی ایک ٹیم (جماعت) ہوگی جس کے ساتھ اگر محبت ہمدردی اور قاعدے کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ وہاں بھی جیت اسی کی ہوگی، جو اچھے جسم، اچھے دماغ اور اچھے اخلاق کے ساتھ جائیگا

بقیہ صفحہ ۱۳

نہایت بیتابی اور بے چینی کے ساتھ زندگی گذارنے لگا جزیرہ ہانگ کانگ میں تو انگریزی حکومت تھی اسی کے ماتحت وکرسن یکیان بسا اوقات اپنے وطن کی کمزوریوں پر درد کے آنسو بہاتا تھا راتوں میں وہ اکثر اپنی فریاد خدا کی بارگاہ میں عرض کرتا اور اسی سے امداد کی التجا کرتا۔ اور کبھی آہ و فغاں کا تار اس کی زبان سے لگا ہوتا اور خود بخود اپنے دل سے یہ سوال کرتا "کیا ہم اپنے کمزور ملک کو طاقتور نہیں بنا سکتے کیا ہم اپنے آپ کو مادر وطن کا لائق فرزند ثابت نہیں کر سکتے؟ کیا ہم ایسے بیکار اور پست ہمت ہوگئے کہ ملک کی تکلیف دور نہیں کر سکتے؟ جانور تک اپنے ہمسائے سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے، اور اسکے دکھ درد کے رفع کرنے کیلئے تدبیر سوچتا ہے۔ ہم تو آخر انسان ہیں۔ مادر وطن خطرہ میں پڑی ہوئی ہے کیا ہم اسکی حفاظت نہ کریں اور اس کی جان بچانے کیلئے کوشش نہ کریں اگر ہم ایسے ہیں تو جانور سے بھی بدتر ہیں!"

(باقی)

کوائفِ جامعہ

نہایت رنج وملال کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ گزشتہ چند ماہ کے قلیل عرصہ میں ہمیں کئی عزیزوں کا داغِ مفارقت اُٹھانا پڑا ہے۔ ابھی ابوالبرکات مرحوم کی جدائی کا زخم بھرنے بھی نہ پایا تھا کہ شبیر احمد مرحوم داغ دے گئے۔ عزیز موصوف نذیر نیازی صاحب کے چھوٹے بھائی بھی تھے اور جامعہ کی جماعت ثانوی دوم میں پڑھتے تھے اسی دوران میں محمد اسحٰق مرحوم کے انتقال کی بھی خبر آئی جو جامعہ جونیر کا امتحان دے کر مکان گئے ہوئے تھے، ان کے علاوہ ایک نجدی عرب بھی جو جامعہ میں بطور مہمان مقیم تھے یہیں سپردِ خاک ہوئے۔ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ ان سب مرحومین کو غریقِ رحمت کرے اور ان کے اعزہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے

گرمی کی گزشتہ چھٹیوں میں جامعہ سے اساتذہ اور طلبہ کی دو جماعتیں کشمیر گئی تھیں جن میں ایک کی قیادت مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی کر رہے تھے اور جو ۵ اساتذہ اور ۳ طالب علموں پر مشتمل تھی اس جماعت کا مقصد کشمیر بہشت نظیر کی سیر و تفریح کے علاوہ وہاں کے لوگوں کی معاشی اور تمدنی حالات کا مطالعہ کرنا تھا دوسری جماعت جو تین طالب علموں اور اس کے قائد جناب حامد علی خاں صاحب پر مشتمل تھی، سائیکلوں پر گئی اور دہلی سے کشمیر تک کا تمام سفر سائیکلوں ہی پر ختم کیا۔ ہر دو جماعتیں بحمد اللہ اپنے اپنے مقصد میں کامیاب واپس آئیں، جن کی تصویریں کہیں دوسری جگہ دی جا رہی ہیں۔

فہرست تعطیلات جامعہ

مجلس تعلیمی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے جلسہ منعقدہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں مفصلہ ذیل تعطیلات منظور کی ہیں

۱۔ اسلامی تہوار

محرم (۹، ۱۰ تاریخ) ۲ یوم، یوم النبی (۱۲ ربیع الاول) ۱ یوم، شب برات ۱ یوم، لیلۃ القدر (۲۷ رمضان المبارک) ۱ یوم، عید الفطر (۲۹ رمضان کے بعد) ۳ یوم

عید الضحیٰ ۴ یوم (یوم الحج لغایۃ ۱۲ ذی الحجہ)

۲۔ غیر اسلامی تہوار

دسہرہ ۱ یوم، دیوالی ۱ یوم، ہولی ۱ یوم، بسنت ۱ یوم، ایسٹر ۱ یوم، کرسمس ۱ یوم

۳۔ متفرق تہوار

یوم تاسیس جامعہ (۲۹ اکتوبر) ۱ یوم، قومی دن (۱۳ اپریل) ۱ یوم

۴۔ موسمی تعطیلات

موسم گرما (جون، جولائی) ۲ ماہ، موسم سرما (۲۱ دسمبر تا ۴ جنوری) ۱۵ یوم، سال تعلیمی کے پہلے حصہ (ٹرم) کے اختتام پر یوم تاسیس کے ساتھ ۳ یوم مزید

سال تعلیمی کے تیسرے حصہ (ٹرم) کے اختتام پر ایسٹر سنڈے کے علاوہ ۴ یوم

ہر ماہ کی آخری جمعرات، ہر ہفتے جمعہ

تشریح (۱) اگر دو تہوار مثلاً (اسلامی اور غیر اسلامی) ایک ہی دن پڑ جائیں تو اُن دونوں تہواروں کی چھٹیاں علیحدہ علیحدہ ہونگی۔

(۲) اگر کوئی تہوار، جمعہ یا آخری جمعرات کے دن پڑے تو اس کی بجائے علیحدہ چھٹی ہوگی۔

سُکھ کی تلاش

محمود اپنے دوست سے ملنے گیا تھا وہاں سے لوٹا تو اپنے والد سے کہنے لگا" مجھے ایک بات سے بہت دُکھ ہوا۔ راجہ صاحب کے پاس کچھ غریب آدمی آئے تھے۔ کوٹھی کے دروازے پر اُنھوں نے جوتے اُتارے۔ اندر گئے تو جہاں راجہ صاحب کے جوتے رکھنے کی جگہ تھی وہیں ایک طرف بیٹھ گئے۔ وہ بیچارے آئے تھے اپنی بپتا سنانے۔ راجہ صاحب جو نکلے تو انھوں نے یہ تو دیکھا نہیں کہ غریب لوگ کس مصیبت میں ہیں اور ڈر کے مارے کہاں بیٹھ گئے ہیں، اپنے نوکروں سے کہا یہ کوٹھی میں کیسے گھس آئے انکو یہاں سے نکالدو"

محمود:۔ ابا، یہ لوگ تو بڑے دکھی تھے۔ جب راجہ نے بھی ان کی نہ سُنی تو ان کو سکھ کیسے ملیگا؟

مسعود:۔ (محمود کے والد)۔ بیٹا! دنیا میں دُکھ ہمیشہ سے ہے اور اس کا علاج ہر شخص کر سکتا ہے۔

محمود:۔ ابا! یہ کیسے؟

مسعود:۔ میں تم کو ایک راجہ ہی کے بیٹے کا قصہ سناتا ہوں کہ اُس نے کیسے دکھ سے نجات پائی اور سکھ کو تلاش کیا۔ تم نے جغرافیہ کے سبق میں پڑھا ہے کہ ہندوستان کے شمال میں ہمالیہ پہاڑ ہے۔ اس کا دامن ہرا بھرا ہے، جدھر دیکھو اُدھر ہرے بھرے کھیت لہلہاتے ہیں۔ رنگ برنگ کے پھول اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ اسی ملک میں اب سے کئی ہزار برس پہلے کپل وستو نام کی سلطنت تھی جس کے راجہ کا نام سدھو دھن تھا۔ راجہ کو دیسے تو ہر طرح کا سکھ تھا لیکن اولاد نہ تھی۔ بیٹا نہ ہونے کا بڑا دکھ تھا۔ ہر وقت اسی خیال میں ڈوبا رہتا نہ دربار میں جی لگتا نہ راج کے کام میں دل بہلتا۔

محمود:۔ ابا، یہ تو بڑا دکھ تھا۔ کیسے دور ہوا؟

مسعود:۔ راجہ نے خدا سے دعائیں مانگیں، دان دیئے لیکن چالیس برس تک کچھ نہ ہوا۔ چالیس برس کے بعد آرزو پوری ہوئی۔ لڑکا پیدا ہوا۔ راجہ کے دل کا کنول کھل گیا۔ گھر گھر جشن ہوئے۔ تمام شہر میں دھوم مچ گئی۔ بچہ کا نام گوتم رکھا گیا۔

محمود:۔ یہ تو عجیب نام ہے!

مسعود:۔ ہاں عجیب نام ہے۔ ان کے کام بھی ایسے ہی تھے۔ اکلوتا بیٹا اور وہ بھی کن آرزوؤں کے بعد پیدا ہوا۔ باپ کی توجہ اور نگرانی کا حال بیان نہیں ہو سکتا لیکن باپ جس ہنر کو بڑی محنت کے ساتھ سکھاتا وہ اس کو بالکل پسند نہ آتا۔ باپ کی یہ کوشش تھی کہ گوتم لڑائی میں جائے اور سپاہیانہ کرتب دکھائے۔ یہ سب سے الگ تنہائی میں سوچ بچار کیا کرتے۔ راجپوت شہزادے گھوڑدوڑ میں سرپٹ گھوڑے دوڑاتے اور جب بازی لیجاتے تو بہت خوش ہوتے لیکن گوتم گھوڑے کو ہانپتا دیکھ کر اُسکی باگ تھام لیتے۔ راج کنور اپنے جیتنے کے قصے خوش ہو ہو کر سناتے اور یہ اپنے ہارنے پر فخر کرتے کہ دیکھو بے زبان جانور کو دکھ سے کیسا بچایا۔

محمود:۔ دوسروں کو دکھ سے بچانے سے سکھ ملتا ہے؟

مسعود:۔ دوسروں کا دکھ دور کرنے سے بھی آدمی سکھی رہتا ہے لیکن انہوں نے تو بہت کچھ کیا جس سے غریبوں کو سکھ ملا لیکن سدھودھن کو یہ باتیں بری معلوم ہوتی تھیں۔

محمود:۔ ابا! یہ کیوں؟

مسعود:۔ بیٹا! یہ اس لئے بری معلوم ہوتی تھیں کہ گوتم ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ دنیا چھوڑ دے تو خاندان سے حکومت چلی جائے اور سب امیدیں خاک میں مل جائیں۔

محمود:۔ ابّا تو اس کے باپ نے کیا کیا کہ گوتم کا دل ان باتوں سے پھر جائے اور وہ راج کا کام سنبھالنے لگے؟

مسعود:۔ بیٹا! راجہ نے اس کی شادی کر دی۔ اس کے لئے بڑا خوبصورت محل بنوا دیا جس کے چاروں طرف خوشنما باغ لگوایا اور سب سامان اس کے دل لگنے کا جمع کرایا۔

محمود:۔ گوتم کا دل لگ گیا ہوگا۔ محل کی خوبصورتی، باغ کی ہوا نوکروں کی خدمت، بیوی کی محبت، سب کچھ تھا۔

مسعود:۔ ہاں عیش و آرام کا پورا سامان تھا لیکن گوتم کا دل نہ لگنا تھا نہ لگا۔ اس نے دیکھا کہ محل میں رہتا ہوں مگر میرے نوکر پھوس کے جھونپڑوں میں۔ میری خدمت کے لئے اتنے نوکر ہیں ان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں، دکھو بڑھاپے سے انکی کمر جھک جاتی ہے، چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو جاتے ہیں لیکن غربت کی وجہ سے مارے مارے پھرتے ہیں۔ بیمار ہوتے ہیں تو تکلیف میں کبھی چیختے چلاتے ہیں اور کبھی کروٹیں بدلتے ہیں۔ یہ بڑے دکھی ہیں ان کا دکھ دور ہو تو میں بھی سکھ پاؤں۔

محمود:۔ ابا! یہ راج کنور تو بہت اچھے تھے۔ ان کو غریبوں، مصیبت کے مارے ہوؤں کا بہت خیال تھا۔ اپنے آرام کی فکر نہ تھی۔

مسعود:۔ بیٹا یہ ایسے ہی تھے۔ لوگوں کی حالت دیکھ کر یہ کہا کرتے تھے "دکھ دنیا میں کہاں سے آیا اور کس طرح دور ہو سکتا ہے" انکو اسی کی دھن لگی ہوئی تھی۔ نہ گھر کا خیال نہ حکومت کی فکر۔ بچہ کی محبت بھی اس سے نہ روک سکی اور آخر کو سکھ کی تلاش میں چل کھڑے ہونے کا پکا ارادہ کر لیا۔ رات کا وقت، سہانا سماں، چاندنی چھٹکی ہوئی تھی کہ یہ بستر پر سے اٹھے اور عمر بھر کے لئے محل چھوڑ دیا۔

محمود:۔ گوتم نے سکھ کو کیسے تلاش کیا؟

مسعود:۔ گھر چھوڑ کر جنگلوں میں چلے گئے خیال کیا برہمن بڑے ودوان (عالم) ہیں۔ ان کے پاس چلوں شاید وہی راستہ بتائیں ان کے پاس گئے مگر انکی حالت خراب تھی۔ اپنے تئیں سب سے اچھا سمجھتے اور دھرم (مذہب) کا مالک جانتے لیکن دیا (رحم) کچھ نہ کرتے۔ گوتم نے کہا ان کے پاس کیا ملے گا۔ انہوں نے کھانا کھانا چھوڑ دیا کہ شاید اس سے سکھ ملے لیکن اس کے بعد بھی چین نہ ملا۔ پھر بھیک مانگنی شروع کر دی لیکن اس فقیری سے بھی مقصد حاصل نہیں ہوا۔ اور یہ سوچ میں پڑ گئے کہ "سکھ کو کیسے تلاش کروں؟" ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر سوچنے لگے اس فکر میں ڈوبے ہوئے تھے کہ دل ٹھہر گیا چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

محمود:۔ گوتم کو سکھ مل گیا۔ انہوں نے اس کو پا لیا؟

مسعود:۔ ہاں انہوں نے سکھ کو تلاش کر لیا اور سب کو بتانے لگے کہ سکھ کیسے پائیں۔ وہ سب سے کہتے تھے۔ کسی کو دکھ نہ دو بے زبان جانوروں تک پر رحم کرو۔ سچ بولو اور اچھے کام کرو۔ آدمی آدمی سب برابر ہیں
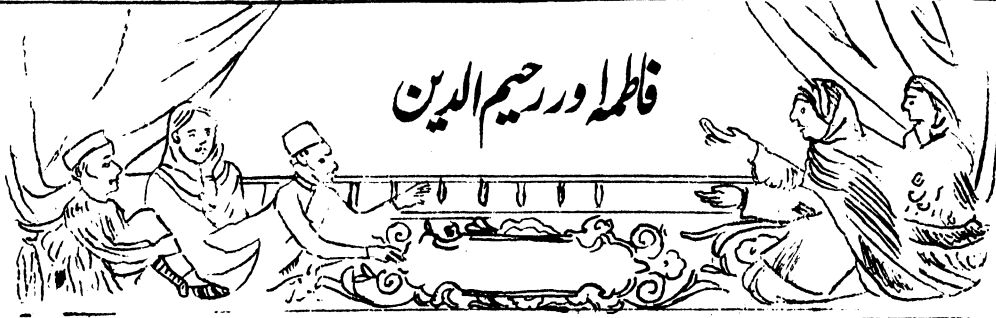
یوں تو چھوٹے بھائی بہن ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ کھیل میں لڑتے رہتے ہیں، اور اپنے ماں باپ سے ایک دوسرے کی شکایتیں کرتے رہتے ہیں، لیکن فاطمہ اور رحیم الدین کی لڑائی کوئی معمولی لڑائی نہیں تھی۔ بچے کبھی مٹھائی پر جھگڑا کرتے ہیں، کبھی گوٹے کی ہڈی پر، کبھی کھلونے پر، اور تھوڑی دیر بگڑے اور خفا رہنے کے بعد پھر ساتھ کھیلنے لگتے ہیں۔ فاطمہ اور رحیم الدین ایسے چھوٹے نہیں تھے کہ ایسی باتوں پر لڑیں، فاطمہ دس برس کی ہوگئی تھی اور رحیم الدین بارہ برس کا، فاطمہ گھر کا کام سیکھ رہی تھی، سینا پرونا، کھانا پکانا، گھر کی صفائی کرانا، کمروں کو سجانا، اور اس سے جب فرصت ملتی تو ماں کوئی کتاب دے کر پڑھنے کے لئے بٹھا دیتی، یا فاطمہ خود اپنا چھوٹا سا ستارا لے کر ٹن ٹن کرنے لگتی۔ رحیم الدین سویرے اُٹھ کر ناشتہ کرتا اور اسکول چلا جاتا، وہاں سے دوپہر کو واپس آکر کھانا کھاتا اور تھوڑی دیر آرام کر چکتا تو ایک مولوی صاحب جو پاس رہتے تھے آکر اسے قرآن شریف یاد کراتے۔ شام کو کھیلنے کا وقت تھا اور جب تک لڑائی نہیں ہوئی تھی دونوں بھائی بہن آنگن میں کوئی نہ کوئی کھیل کھیلتے تھے، اور اگر دو سے زیادہ آدمیوں کا کھیل ہوتا تو پڑوس کے دو چار بچوں کو بلا لیا کرتے تھے۔ پھر شام کا کھانا ہوتا اور کھا پی کر رحیم الدین اسکول میں جو گھر پر کرنے کے لئے کام دیا جاتا، اسے کر ڈالتا اور پھر سب کے سب لیٹ کر سو رہتے۔ بچے لڑتے بھڑتے ہیں جب ہر وقت کا ساتھ رہے۔ رحیم الدین اور فاطمہ کی تو زندگی ایسی تھی کہ دن بھر میں شاید دو تین گھنٹے ساتھ رہنے کو ملتے ہوں مگر اس پر بھی ان میں ایسی لڑائی ہوگئی کہ کھیلنا کیا، بول چال بھی بند ہوگئی، اور وہ ایک دوسرے سے ایسے بیگانے ہوگئے کہ کوئی دیکھتا تو یہ سمجھتا کہ وہ بھائی بہن ہی نہیں۔

قصہ شروع یوں ہوا کہ رحیم الدین کا اسکول میں نام لکھایا گیا اور جب وہ دو سال تک برابر اپنے درجہ میں اول آیا تو اسے مکان میں ایک چھوٹا سا کمرہ الگ دیدیا گیا جس میں ایک ننھی سی میز تھی، دو کرسیاں اور ایک کتابوں کی الماری۔ فاطمہ نے کچھ ماں کے کہنے سے، مگر زیادہ تر بھائی کی محبت میں میز کے لئے ایک چادر بنائی جس میں سرخ اور سبز ریشمی بوٹے تھے، کرسیوں کے واسطے دو گدّے بنائے۔ الماری کا ایک شیشہ ٹوٹا تھا، اس لئے اس پر ایک جھالر دار پردہ لگایا، اس نے نوکر کو حکم دیا کہ اس کمرے میں بلا ناغہ صفائی کرے اور خود روز جاکر دیکھ لیتی تھی کہ اس کا کہنا پورا کیا گیا یا نہیں۔ رحیم الدین جب اسکول سے واپس آتا تو اُسے کمرا ایسا صاف ستھرا ملتا کہ اس کا جی بہت خوش ہوتا، اور وہ اس پر اس طرح ناز کرنے لگا کہ کوئی راجہ اپنے محل پر کیا کرتا ہوگا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اس کے اول آنے کی خوشی میں اس کے ماں باپ اس کی یوں خاطر کرتے ہیں۔ فاطمہ کا بھائی جہان

ماننے کے بجائے وہ اس کی ساری خدمتوں کو اپنا حق سمجھنے لگا اور اس کے گھمنڈ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ فاطمہ کو اپنے بھائی سے بہت محبت تھی، اس کی ذہانت پر وہ فخر کرتی تھی، ماں نے بھی اسے سکھایا تھا کہ مردوں کا کام محنت کرنا اور کمانا ہے، عورتوں کا ان کی خدمت کرنا اور اُن کو آرام پہنچانا، تاکہ وہ محنت کرسکیں اور کما سکیں۔ اس لئے فاطمہ اپنی سی کرنے پر تیار تھی۔ لیکن رحیم الدین کا گھمنڈ اور اس کے نخرے دیکھ کر اس کا دل کھٹا ہوگیا پھر ایک روز رحیم الدین کو انعام میں ایک اچھی اچھی تصویروں کی کتاب ملی، وہ اسے اتنی پسند تھی اور اسے اتنی فکر تھی کہ اس کی جلد یا تصویر خراب نہ ہوجائے کہ فاطمہ نے کتاب دیکھنے کو مانگی تو اس نے نہیں دی، جب اسکول جاتا تو اسے بکس میں بند کر جاتا اور کھول کر دیکھتا تو اُسی وقت جب فاطمہ کہیں اور ہوتی۔ اتفاق سے فاطمہ نے اسے کتاب پڑھتے دیکھ لیا اور لپک کر اسے چھیننے کی کوشش کی۔ چھینا جھپٹی میں کتاب کی ایک تصویر پھٹ گئی، اور اس پر رحیم الدین کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے کتاب تو چھوڑ دی اور فاطمہ کے زور سے طمانچہ مارا۔ مار کھا کر فاطمہ پر ضد سوار ہوئی اور اس نے کتاب کے دو چار ورق اور پھاڑ کر اسے کونے میں پھینک دیا اور روتی ہوئی کمرے سے بھاگی، ماں باورچی خانہ میں تھی۔ باپ کام سے واپس نہیں آیا تھا اس لئے ماجرا سننے والا کوئی نہ تھا، دونوں میں صفائی نہ ہوسکی، اور چھوٹی سی بات پر بہت بڑی لڑائی ہوگئی، شام کے وقت کھیل نہیں ہوا، رات کو کھانے پر ایک دوسرے سے بولے بھی نہیں، اور ہاتھ دھونے کے لئے دونوں اتفاق سے ایک ساتھ گئے تو رحیم الدین نے دانت پیس کر کہا۔

"جناب آپ اب کبھی میرے کمرے میں آئیں تو اتنا ماروں گا کہ کھوپڑی پھٹ جائیگی!"

فاطمہ نے جواب دیا۔

"کمرے میں جائے میری جوتی، مگر میں میز کی چادر اور گدّے اور الماری کا پردہ منگوالوں گی۔"

رحیم الدین کی کتاب تو برباد ہو ہی چکی تھی، دوسرے دن وہ اسکول سے واپس آیا تو اسے بے پوشش کی میز، بے پردے کی الماری اور بے گدّوں کی کرسیاں نظر آئیں جن پر بیٹھنے کو کسی طرح جی نہیں چاہتا تھا۔ دو ایک روز میں جب کمرہ صاف نہیں کیا گیا تو میز کرسی پر گرد بھی بہت سی جمع ہوگئی، اور وہ محل جس پر اسے اتنا گھمنڈ تھا ایک غریب آدمی کے جھونپڑے سے بھی زیادہ ویران معلوم ہونے لگا۔ تب اُس نے کمرہ میں بیٹھنا چھوڑ دیا۔ کام کے وقت اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعت میں اُستاد نے اسے ڈانٹا، اور کہا کہ اگر تم نے ایسی ہی بے توجہی کی تو تمہارے باپ کے پاس شکایت بھیجی جائے گی۔ رحیم الدین یہ سُن کر بہت ڈرا، اور اُسے ندامت بھی ہوئی، وہ گھر جاکر ایک کونے میں بیٹھ کر خوب رویا۔ دوسری طرف فاطمہ کو بھی اس کی ماں روز جھڑکتی تھی، بھائی کے بگاڑ ہونے کے بعد وہ ایسی بدحواس اور بوکھلائی رہتی تھی کہ اس سے کوئی کام ٹھیک نہیں ہوتا تھا۔ پاجامے کیلئے کپڑا کاٹنے کو دیا گیا، اسے ایسا بے تکا کاٹا کہ سارا کپڑا ٹھکانے لگ گیا اور باورچی خانے میں تو اس نے ایسی ایسی حرکتیں کیں کہ ماں کا ناک میں دم آگیا، انتہا یہ ہوئی کہ ایک روز اس نے شیر برنج میں شکر کی جگہ نمک جھونک دیا۔ تب تو ماں نے اسے باورچی خانہ میں قدم رکھنے کی ممانعت کردی، اور رات کو باپ سے اس کی شکایت کی۔

(باقی آئندہ)

مضمون ذیل ایک جدید طریقہ تعلیم کے متعلق ہے، جسے عبدالغفار صاحب مدھولی نے ۳ر ستمبر کو اساتذہ کے ایک جلسہ میں پڑھ کر سنایا تھا۔ اس طریقہ کا نام انگریزی میں "پروجکٹ میتھڈ" ہے، یعنی بامقصد سعی کا طریقہ۔ اختصار کے طور پر ہم نے اس کا نام صرف "مقصدی طریقہ" رکھا ہے، اس لئے کہ اس میں معلم ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر بچوں سے کام لیتا ہے۔ عبدالغفار صاحب اس جدید طریقہ کو موگا (پنجاب) سے سیکھ کر آئے ہیں اور نہایت دلچسپی اور محنت کے ساتھ جامعہ کے مدرسہ تحتانیہ میں اس کا تجربہ کررہے ہیں۔ اُمید ہے کہ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اور معلمین اس مضمون کے ذریعہ ان کی کوششوں کا ایک حد تک اندازہ کرسکیں گے اور آیندہ اپنے خیالات و تجربات سے دوسروں کو فائدہ اُٹھانے کا موقع دیں گے۔ (مدیر)

بچہ اور مدرس کے تعلقات اور دونوں کو انفرادی حیثیت سے سمجھنے کے لئے یوں تو بہت سی مثالیں ہیں، دلچسپ بحث ہیں، مگر اس وقت اپنا مطلب ظاہر کرنے کے لئے بچہ اور اس کے تعلقات کی سب سے اچھی مثال میرے نزدیک "ستار اور اُس کا بجانے والا" ہے۔ ستار بجانے والے کے لئے دو چیزوں کا جاننا ضروری ہے، ایک تو ستار کے مختلف تاروں کا علم، دوسرے اس کے بجانے کا طریقہ۔ ایک مطرب جسے دونوں باتوں کا علم ہے جب ستار کو چھیڑتا ہے تو مختلف تاروں کی ہم آہنگی سے جو نغمہ پیدا ہوتا ہے وہ یقیناً کوئی معنی رکھتا ہے۔ اسی طرح ایک مدرس کے لئے بچہ کے متعلق دو باتوں کا جاننا ضروری ہے، ایک تو بچے میں ودیعت کی ہوئی مختلف صلاحیتوں یا بالفاظ دیگر بچے کی نفسیات کا علم۔ دوسرے اُن صلاحیتوں اور نفسی خصایص کو کام میں لانے کا طریقہ۔ اگر دونوں باتوں سے واقفیت ہو تو بچہ بھی ستار کی طرح اظہار کے لئے بے تاب ہوتا ہے ع

اک ذرا چھیڑئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں مطرب کو ایک اور اہم فریضہ انجام دینا ہوتا ہے، وہ ہے بجانے سے پہلے تاروں کو چھیڑ کر دیکھنا اور اُن کو درست کرنا۔ یہی حال مدرس کا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ بچے سے کام لینے سے پہلے دیکھے کہ آیا بچہ اس کے لئے تیار ہے یا نہیں، اُسے اس موقع پر "تیاری کا قانون" استعمال کرنا پڑے گا۔

وہ تار کیا ہیں؟ اُن کو کام میں لانے کا طریقہ کیا ہے؟ کس طرح آمادہ کرنا چاہیئے؟ کیا اس کا حل مقصدی طریقہ میں نہیں مل جائے گا؟ قبل اس کے کہ میں اس کے بتلانے کی کوشش کروں، معاف کیجئے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ میں کس حد تک اس کے معلوم کرنے کی خواہش ہے؟ اگر خواہش نہیں ہے تو خواہش پیدا کرنے کے کیا ذرائع پیدا کئے جاسکتے ہیں؟

تعلیم کے مقصد یا بالفاظ دیگر سیکھنے سے کیا مراد ہے؟ سیکھنے سے مراد دماغ میں ایسے جوڑ یا تعلقات پیدا کرنا ہے جن سے موقع پر صحیح جوابی عمل پیدا ہو سکے۔ مثال کے طور پر جب میں کسی لڑکے کا نام لے کر پکارتا ہوں تو وہ میری طرف دیکھتا ہے، لڑکے کا میری طرف دیکھنا اس موقعہ کا جوابی عمل ہے۔ جب میں معنی پوچھتے وقت کسی لڑکے سے "رفیق" کہتا ہوں تو وہ اس کا جواب دیتا ہے "دوست"۔ اگر اس کا یہ جواب صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس میں ایک ایسا جوڑ پیدا ہوا ہے جو اس قسم کے موقع پر اس کا جوابی عمل کرسکے۔ جب میں مکتب کے لڑکے سے "س" "ر" کہتا ہوں تو وہ فوراً "سر" کہتا ہے، اس کا جوڑ درست ہے۔ پس سیکھنے سے مراد "موقع" اور "جوابی عمل" کی کڑیوں یا تعلقات کو مضبوط کرنا ہے۔ یہ کڑیاں یا تعلقات اس قدر مضبوط ہونے چاہئیں کہ باوجود مخالفانہ کوششوں کے بچہ اثر لئے بغیر نہ رہ سکے۔ مثال کے طور پر جب میں ۷ × ۵ کہوں تو بچہ کا دماغ ۳۵ کے اثر سے خالی نہ

نہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کا انحصار اُس طریقہ تعلیم پر منحصر ہے جو اُستاد اُس کے لئے استعمال کرتا ہے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہندوستان میں مختلف کوششیں جاری ہیں۔ اس وقت عام طور پر ہندوستان میں تین طریقے رائج ہیں:-

۱۔ پُرانا طریقہ　۲۔ نیا طریقہ　۳۔ مقصدی طریقہ

پُرانے طریقہ کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں اس لئے کہ تقریباً ہم سب اسی طریقہ سے تعلیم دیتے ہیں اس کی دشواریوں اور نقائص سے شاید ہم کافی واقفیت رکھتے ہیں، اگر ہم اس طریقہ میں تبدیلی چاہتے ہیں تو شاید اس کے نتائج ہماری اس خواہش میں بڑی مدد دیں گے۔ اس میں کسی قاعدے قانون کا خیال نہیں رکھا جاتا ہے بلکہ علم کو ایک وسیع دریا فرض کرلیا ہے (جو یقیناً سچ ہے) مگر آبیاری کے لئے مالی کو حق ہے کہ جہاں سے چاہے کھیتوں کو سیراب کرتا رہے خواہ کھیت کثرت باراں، قلت باراں یا بے وقت پانی دینے سے تباہ و برباد ہی کیوں نہ ہوجائیں۔

نئے طریقہ سے مُراد وہ طریقہ ہے جس کی تعلیم ہندوستان کے مختلف ٹریننگ اسکول اور کالجوں میں دی جاتی ہے۔ یہ طریقہ زیادہ تر منطقی، میری مراد اس سے یہ ہے کہ "ترتیبی" ہے۔ اس کے استعمال اور تیاری میں نصاب اور درسی کتب کو سامنے رکھا جاتا ہے، یعنی اُستاد مقرر کی ہوئی ترتیب کو یکے بعد دیگرے لے کر اُس کی تیاری کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح بچے اُسے قبول کریں۔

مقصدی طریقے سے مراد بچوں کا مفید ارادے یا منصوبے کرنا اور اُس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ اس میں کام کراتے وقت اُستاد کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ بچے کو پیش نظر رکھے (خواہ کام کے دوران میں ہوتا ہو یا سبق کی تیاری میں) نصاب اور درسی کتب اس کی مدد اور معیار کے لئے ہوتے ہیں۔

جہاں تک تعلیم کے چیدہ چیدہ اصول مثلاً "اشیاء سے خیالات کی طرف چلنا" "خیالات سے الفاظ کی طرف چلنا" "آسان سے مشکل کی طرف چلنا" "کام ہی ایک بڑا معلم ہے" ان اصولوں کا تعلق ہے یہ دونوں طریقے مطابقت رکھتے ہیں۔ ضبط مدرسہ و نظم و نسق مدرسہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ ان کے طریقہ کار جدا جدا ہیں۔ پہلے طریقہ میں مدرس کی خواہش کو دخل ہے تو دوسرے طریقے میں بچے کی۔ پہلے طریقے میں علوم مروجہ کو مقصود بنا کر اور ان میں کچھ ترتیبی اور تعلیمی صفات تسلیم کرکے ان مضامین کے تدریجی حصے طالب علم کو پہنچائے جاتے ہیں اور ان جزءوں کا تعین مضمون کے منطقی سلسلہ پر ہوتا ہے۔ دوسرے میں بچہ کی نفسیاتی نشو و نما کو پیش نظر رکھ کر علم و عمل کے وہ جزء اس کی زندگی کا جزو بنائے جاتے ہیں جو اس کے درجہ ارتقاء کے مطابق ہوں، اس کوشش میں اکثر مضامین کی منطقی ترتیب کو توڑنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے طریقہ پر عامل ہونے والے مدرس کو لیجئے۔ فرض کیجئے وہ ابتدائی سوم کو سال تعلیمی کے آغاز میں پہلا سبق دینا چاہتا ہے۔ وہ اُردو کی تیسری کتاب سے پہلے سبق کی تیاری کرے گا اور وہی پڑھانے کی کوشش کریگا۔ مقصدی طریقہ پر عامل ہونے والا مدرس اُس زمانہ میں بچے کی ضرورت دیکھے گا۔ فرض کیجئے سال تعلیمی کے آغاز میں زوروں کی بارش ہوئی ہے۔ بچے برسات کا لطف حاصل کر رہے ہیں، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے وہ سرشار ہو رہے ہیں۔ اس وقت کی ذرا ذرا سی تبدیلی سے وہ چونکتے ہیں۔ اس وقت یہ مدرس اسی تیسری کتاب سے "موسم" اور "برسات" کا سبق تیار کرکے پڑھائیگا۔ یا فرض کیجئے اُس زمانہ میں دارالاقامہ میں آموں کی دعوت ہوئی ہے: "کون سے آم اچھے تھے"؟ "کتنے کھائے"؟ "کیا جی بھرا"؟ اسی کا چرچا ہے۔ یہی مدرس اُسی تیسری کتاب سے "آم" کا سبق پڑھائے گا، اور پہلا مدرس کتاب کا دوسرا سبق۔ کس کے بچوں نے زیادہ سیکھا؟ کس کی تعلیم موثر ہوئی؟ بچوں کے منصوبوں اور ارادوں کا کس نے ساتھ دیا؟ گذشتہ سال ۱۴ ستمبر کو دہلی میں زوروں کی بارش ہوئی۔ جماعت میں آج کے موسم کا ذکر تھا میں نے طلبہ سے کہا اگر وہ چاہیں تو جماعت میں "آج کے موسم" کے عنوان سے مضمون لکھ سکتے ہیں۔ جماعت کا سب سے کمزور لڑکا جو املاء لکھنے سے بھی گھبراتا تھا لکھتا ہے:-

"آج بہت اچھا دن ہے، زمین نرم ہے، ٹھنڈی ہوا
چل رہی ہے، طبیعت چاہتی ہے کہ باغبانی کریں ...."

ہوا کے متعلق لکھتا ہے:-

"........ لہرا دیا ہے کھیت کو ملتی ہیں بالیاں"

(خلیل الرحمٰن)

کس کی تعلیم نے پُرانی واقفیت کا صحیح استعمال سکھایا؟ اگر مدرس ان مواقع سے باخبر ہے تو وہ ایک مفید کام انجام دے سکتا ہے۔

انہی خیالات کے ماتحت تعلیم دینے والوں کے دو گروہ پیدا ہوگئے ہیں

ایک منطقی ترتیب سے کام لیتا ہے یعنی وہ یہ دیکھتا ہے کہ کس واقعہ کے بعد کونسا واقعہ لایا جائے دوسرا بچے کے ارادے، اسکی ضرورت اور ماحول سے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منطقی ترتیب میں اُستاد کے سامنے ایک خاص راستہ مقرر ہوتا ہے اور اُس میں بھٹکنے کی کم گنجائش ہے۔ مگر اس میں طلبہ کے لئے فائدہ کی کم گنجائش ہے۔ دوسرے طریقہ میں اُستاد کو بڑی محنت اور ہوشیاری سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس طریقہ کی بنیاد مبنی ہے، بچوں کی ضروریات پر اس لئے وہ تھوڑے وقت میں زیادہ سیکھتے ہیں۔ اُستاد اور طلبہ کو سوچنے کا موقع ملتا ہے منطقی ترتیب میں درسی کتابوں کا مقصد دوسروں کے خیالات کو جذب کرنا ہوتا ہے اور اس "مقصدی طریقہ" میں درسی کتابوں کا مقصد محض سوچنے میں مدد دینا ہے۔ پہلے طریقہ میں طلبہ میں چیزیں ٹھونسنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوسرے طریقہ میں طلبہ سے اُگلوایا جاتا ہے بالفاظ دیگر بچوں کی پرانی واقفیت اور صلاحیتوں کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔

ہم دوسروں کے خیالات بچوں میں جذب کرانے سے ان کے سوچنے کے مادے کو فنا کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوروں کے یہ خیالات بچوں کے لئے مفید نہیں ہوتے ہیں آج سے تین سال پہلے کا واقعہ ہے کہ ابتدائی دوم کو جزیرہ، جزیرہ نما، جھیل، خاکنائے کے متعلق بچوں کو سوچنے اور اپنے خیالات کو ظاہر کرکے ان سے تعریف نکلوانے کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ کئی لڑکوں نے مجھ سے کہا کہ اگر ہمارے لئے سب سے زیادہ بوجھل کوئی چیز ہے تو وہ یہی معلومات عامہ ہے۔ کسی تعریف کو رٹ لینے سے دماغ میں کوئی مضبوط جوڑ نہیں پیدا ہوتا ہے۔

گذشتہ سال میں ابتدائی سوم کو کنول کے پودے کا سبق پڑھا رہا تھا میں نے بچوں سے ایسے سوالات کئے جن سے کنول کے پودے کے متعلق بیشتر معلومات (جو کتاب میں درج تھی) لڑکوں نے تبلادی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کنول کے گٹے سے تال کھانے بنائے جاتے ہیں (کتاب میں اس کا ذکر تھا اور میں اس حصہ کو مشکل سمجھتا تھا)۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اسی چیز کو ایک لڑکے نے وضاحت کے ساتھ سمجھایا اور کہا کہ کل بازار سے لاکر آپ کو دکھلا دوں گا۔

ہماری تعلیم زیادہ تر کتابی ہے۔ طلبہ کو اخلاقی کہاوتیں یاد کرائی جاتی ہیں مگر عمل کا خیال نہیں رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم جماعت میں قصہ سناتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کس طرح اپنا کام آپ کیا کرتے تھے، مگر جماعت میں جب کوئی طالب علم صفائی کرتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر چپراسی کے فرائض کیا ہیں؟ اس بارے میں والدین کی مدد کی بھی ضرورت ہے گذشتہ سال ہم باغیچہ میں طلبہ سے نالی بنوا رہا تھا ایک طالب علم گارا لانے میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ اتفاق سے اُس کے والد وہاں آگئے۔ اب لڑکا گارا لانے میں شرم محسوس کرتا تھا۔ ہم اس سے اندازہ لگاسکتے ہیں کہ بچہ کا طبعی میلان کیا تھا۔ مگر وہ اس وقت محض اس خیال سے کہ اس کے گھر میں ایسا نہیں ہوتا ہے، اپنے جذبات دبانے پر مجبور تھا۔

بچہ اپنے ماحول سے اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گذشتہ سال میں نے طلبہ سے "ہمارے ہاں کے موسم" کے عنوان سے ایک مضمون لکھوایا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر ایک اپنے ماحول سے متاثر ہے۔

اس سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ ان میں زمیندار، پولس افسر، غریب، ملازمت پیشہ سب قسم کے لڑکے ہیں۔

ہماری تعلیم زندگی سے غیر متعلق ہے۔ وہ رفتہ رفتہ بچہ میں یہ احساس دلاتی ہے کہ تحصیل علم سے اُسے کوئی فائدہ نہیں۔ بعض اوقات جاہلوں کے سامنے اُسے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ میں نے جس وقت مڈل کا امتحان پاس کیا تو میرے ایک رشتہ دار نے مجھ سے کہا کہ فلاں گاؤں میں جاکر فلاں چیز لادو۔ مجھے حیدرآباد سے پشاور تک کا راستہ معلوم تھا مگر اُس گاؤں کو نہیں جاسکتا تھا۔ وہ صاحب تھے ظریف، فرمانے لگے "میاں اپنے ماسٹر سے کہنا کہ مدہول کا جغرافیہ ہم سے پڑھ جائیں" میں اس وقت بڑا شرمندہ ہوا۔ یہی حال ہمارے بچوں کا ہے وہ دہلی سے بمبئی کس سمت کو ہے تبلا سکتے ہیں مگر مقررہ مقام سے "قطب صاحب" نہیں تبلا سکتے۔

تعلیم میں بچہ کا اپنا ارادہ جسقدر مضبوط ہوگا اُسی قدر اُسے کامیابی حاصل ہوگی اور یہی مقصدی طریقہ کی جان ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بچوں کے اپنے ارادے، اپنے مقاصد بھی ہوتے ہیں؟ کیا وہ اس کا اظہار مدرس پر کرتے ہیں؟ جو مدرس انکے اس ارادہ میں مدد دیتا ہے کیا وہ محسوس نہیں کرتا کہ اس نے سکھانے کی کوشش کی ہے؟ کیا بچوں میں تحصیل علم کا شوق نہیں ہے؟ کیا وہ نئی تعلیم حاصل کرنا نہیں جانتے ہیں؟

ان سوالات کا جواب آئندہ اشاعت میں ملے گا۔

رفتارِ تعلیم

ترکی میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مشترکہ تعلیم

پچھلے دنوں قسطنطنیہ میں ایک تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس کانفرنس میں ترکی قوم نے اپنی کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ کانفرنس کی سالانہ رپورٹ میں محکمۂ تعلیم کی اس تجویز کو کہ "لڑکوں اور لڑکیوں کی مشترکہ تعلیم ہونی چاہیئے" مفید بتایا گیا۔ اور جمہوریہ ترکیہ کے مختلف اطراف کے مندوبین نے اس کی پرزور تائید کی۔

پٹنہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کی نمایندگی

میڈیکل ایسوسی ایشن کی طرف سے جناب ڈاکٹر محمد حسین صاحب پٹنہ یونیورسٹی کی سینٹ کے لئے ممبر منتخب ہوئے ہیں اور مسلم ایسوسی ایشن کی طرف سے جناب مسٹر علی حسن خاں صاحب بیرسٹر یونیورسٹی مذکور کی سینٹ کے ممبر منتخب ہوئے ہیں۔

صوبہ بمبئی کے مسلمانوں کی تعلیمی بیداری

اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں بمبئی کی مسلم ایجوکیشنل کا اجلاس پونا میں زیر صدارت جناب جسٹس فیض طیب جی منعقد ہوا صوبہ بمبئی کے بہت سے مندوبین نے کانفرنس میں شرکت کی جس میں مندرجہ ذیل تجاویز پاس ہوئیں:-

(۱) سفارشات ہارٹوگ پر جلد از جلد عملدرآمد کیا جائے۔

(۲) بمبئی یونیورسٹی عثمانیہ یونیورسٹی کو تسلیم کرے۔

(۳) مسلمانوں کے روپے کا سود جو بنکوں سے ملتا ہو اور جسے مسلمان نہیں لیتے ہیں، وہ کانفرنس کے نام منتقل کر دیا جائے۔

(۴) گورنمنٹ سے سفارش کی گئی کہ محکمۂ تعلیم میں تخفیف نہ کیجائے۔ اور مدرسین کو کانفرنس میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔

(۵) مسلم خواتین سے درخواست کی گئی کہ شادی کے موقع پر جو فضول خرچیاں کی جاتی ہیں اُسے روک کر اس روپیہ کو تعلیم نسواں پر خرچ کیا جائے۔

ایک مسلمان طالب علم کو تحقیقات علمی کا وظیفہ

پٹنہ یونیورسٹی کی سینٹ کی طرف سے اب کی بار تحقیقات علمی کا ایک وظیفہ مسٹر اقبال حسین ایم اے۔ بی۔ ال پلیڈر (چھپرہ) کو ملا ہے۔ صاحب موصوف کا موضوع تحقیق "فارسی شاعری میں ہندوستان کا حصہ" ہے یہ تحقیق زیر ہدایت جناب ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب ایم اے پی ایچ، ڈی پروفیسر پٹنہ کالج عمل میں آئے گی۔

میڈیکل کالج ڈھاکہ میں ہڑتال

۱۰ اکتوبر کو میڈیکل کالج ڈھاکہ میں طلبہ نے جو ہڑتال کی تھی، وہ ابھی تک جاری ہے اور آخری دن تک طلبہ کے مطالبات نہ مانے گئے۔ بلکہ سرجن جنرل نے حکم دیدیا کہ کالج یکم نومبر ۱۹۳۱ء تک بند کر دیا جائے۔

یو۔پی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس

جائنٹ سکریٹری صاحب پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اخبارات کو اطلاع دیتے ہیں کہ یوپی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ۹ر۱۰ نومبر ۱۹۳۱ء کو زیر صدارت جناب مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی سہارنپور میں منعقد ہوگا۔ اور قوی توقع ہے کہ صوبہ یو۔پی کے ایکٹنگ ہوم ممبر، آنریبل سر مزمل اللہ خاں صاحب مقامی ہائی اسکول کا سنگ بنیاد رکھیں گے۔

قیمت سالانہ
ڈھائی روپئے
(عہ)

پیام تعلیم

قیمت فی پرچہ
دو آنے
(۲ر)

جلد ۱۱ | یکم دسمبر ۱۹۳۱ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

(۱) یہ مضمون یکم نومبر کے پرچے میں غلطی سے ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب کے نام سے چھپ گیا تھا، حالانکہ اس کی اصل مضمون نگار "رقیہ ریحانہ" صاحبہ ہیں۔ امید ہے کہ ہر دو صاحبان اس نادانستہ غلطی پر ہمیں معاف فرمائیں گے۔

دنیا میں کیا ہو رہا ہے

یہاں ابھی چین اور جاپان میں لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ بات اصل یہ ہے کہ منچوریا کے لوگوں نے جاپانی مال کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور کچھ ایسی باتیں کی تھیں جو جاپان کو ناگوار گزریں اس پر جاپان نے چین پر حملہ بول دیا۔ چین بیچارا باوجود اتنا بڑا ملک ہونے کے آپس کی نااتفاقی سے خود کچھ نہ کر سکا اور اس نے دوسری بڑی بڑی سلطنتوں سے مدد طلب کی۔ یہ کہئے امریکہ اور فرانس کے بیچ میں پڑنے سے بیچ بچاؤ ہو گیا۔ ورنہ کتنوں کی جانیں جاتیں اور کتنا نقصان ہوتا!

آج کل پنجاب کے مسلمانوں میں کشمیر کے معاملے پر بہت جوش و خروش پھیلا ہوا ہے۔ کوئی ہزار آدمی کے قریب جیل جا چکے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی حالت نہایت خراب اور ناگفتہ بہ ہے جس کی اصلاح کا یہ لوگ حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ آج کل مہاراجہ کشمیر بھی اسی غرض سے دہلی آئے ہوئے ہیں

گزشتہ کچھ عرصے سے یہاں ایک گول میز کانفرنس ہو رہی ہے جس میں ہندوستان کے بڑے بڑے لوگ اس غرض سے شریک ہوئے ہیں کہ انگریزوں سے اپنے ملک کی آزادی حاصل کریں۔ گزشتہ ہفتہ کی کارروائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے جھگڑے کا سوال اٹھا دیا گیا جس سے کانفرنس بے نتیجہ ختم ہو رہی ہے اور لوگ ناکام واپس آ رہے ہیں۔

باتصویر معما

یہ ایک باتصویر کہانی ہے جو طالب علم اسے عبارت میں صحیح اور پورے طور پر حل کر کے بھیجے گا، اسے بچوں کی کتابوں کا ایک نہایت مفید سٹ بطور انعام کے دیا جائے گا۔ جواب ۲۰ دسمبر تک آجانا چاہیئے۔ جس کا نتیجہ یکم جنوری کے پرچہ میں شایع کر دیا جائے گا۔

(۱)

(۲)

(۳)

(۴)

(۵)

(۶)
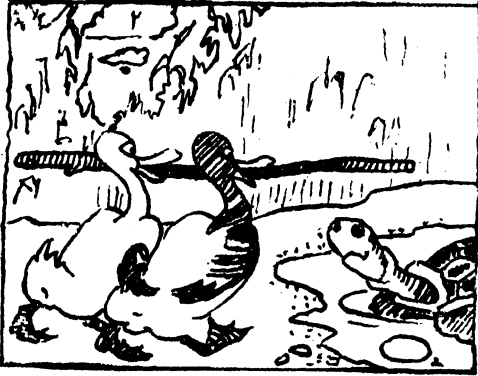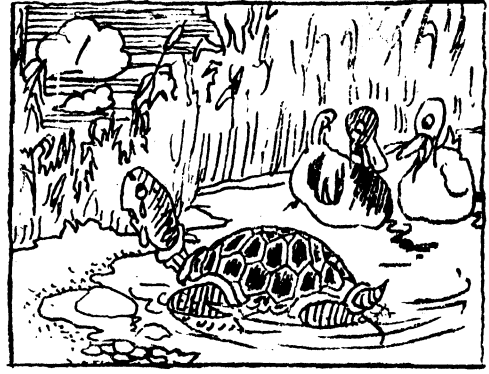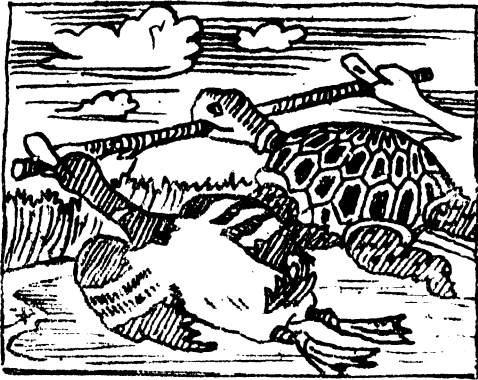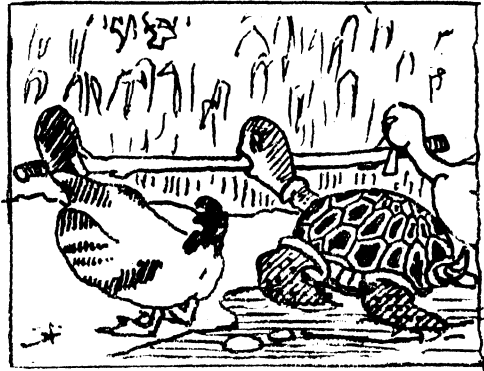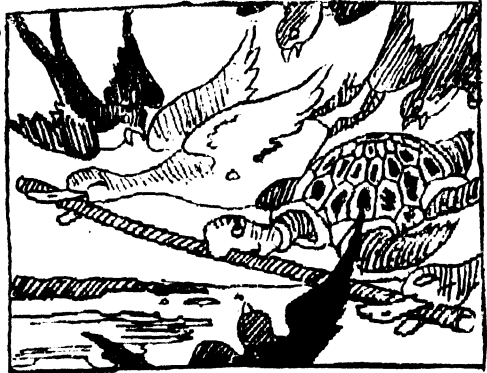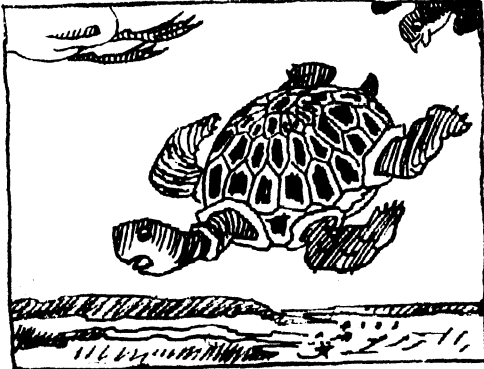
اسلام کی صداقت

ڈاکٹر عبدالکریم گرمانس صاحب نے اپنے اعلان اسلام کے عظیم الشان جلسے میں جو جامع مسجد دہلی میں منعقد ہوا تھا، اسلام کی صداقت پر عربی میں ایک چھوٹی سی تقریر کی تھی جس کا یہ ترجمہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ (مدیر)

محترم بزرگو! اسلام علیکم۔ میں اس عظیم الشان مسجد میں باواز بلند یہ کہنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، اَشْہَدُ اَلَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَاَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ میرا دل اور میری روح اس موقع کی عظمت اور اہمیت کو پوری طرح محسوس کر رہی ہے جس میں مجھ کو یہ شرف حاصل ہوا ہے کہ آپ جیسے متقی اور پرہیزگار علمائے دین کے سامنے اپنے اسلام اور اعتقاد کا اظہار کروں۔

تمام نوع بشر بالعموم اور عرب بالخصوص مدتوں سے اپنے جزیرے میں جہالت اور فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ ایک ایسے بشیر و نذیر پیغمبر کا انتظار تھا جو لوگوں کو ضلالت کے راستے سے ہدایت کی سیدھی راہ پر پہنچا دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس گم کردہ راہ گروہ کے ایک شخص کو اس کام کے لئے چنا اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول بنایا اور اس وحی سے آپ کو مشرف کیا جو پیشتر اور نبیوں کو عطا ہو چکی تھی۔ انسان کی تاریخ میں آپ کی عظیم الشان کرامت کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح ظاہر کیا، فرماتا ہے۔ اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَہَدٰی وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی۔

اس یتیم بے مایہ رسول نے کیا کیا؟ تھوڑی سی مدت میں زمین کی کایا پلٹ دی۔ تمام تاریکیوں کو کافور کر دیا، آفتاب صداقت کا اجالا ہر طرف پھیلا دیا۔ باوجود قریش کے حسد اور بت پرستوں کی سخت مقابلے اور مخالفت کے جو ان کو اپنے نقصان تجارت اور عرب کے جاہل بدؤں پر اپنے غلبے کے مٹ جانے کے اندیشے سے تھی۔ کیا یہ غیر معمولی فلاح و کامیابی اس بات کی کھلی دلیل نہیں کہ آپ کو خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا اور اپنی وحی عطا کی تاکہ آپ انسانوں کی ہدایت کریں، اور ان کے درجہ کو اس وحشت و جہالت کی حالت سے بلند کریں، جس نے انسانیت کو تقریباً پامال کر دیا تھا۔ یہ کیسی کرامت الٰہی ہے کہ جو عرب آپ کی دعوت کے سخت ترین دشمن تھے، وہی دس سال سے بھی کم مدت میں ایسے مومن مخلص بن گئے کہ انھوں نے دین مبین کو اپنا شعار بنا لیا اور دنیا کے دور ترین حصوں میں اس کو پہنچا دیا۔ اس کامیابی کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے دعوت اسلام کے ساتھ ہی کیا تھا تاکہ جھوٹے اور سچے نبی کو پرکھ لیا جائے، لہٰذا یہی سب سے بڑی علامت ہے کہ آپ نے جو کچھ اپنے رب کے نام سے فرمایا سب سچ تھا۔ عربوں نے اس دین کے ذریعے ایک کامل شریعت اور ایک ایسی تہذیب اسلامی کی نشر و اشاعت کی جس کی مثال قطعاً پہلے موجود نہ تھی۔ اس تہذیب نے تمام بڑی بڑی تہذیبوں کو جو غفلت و نسیان کی قبروں میں دفن ہو چکی تھی، دوبارہ زندہ کیا اور علم و معرفت کی تمام شاخوں میں نئے نئے افکار کو پیدا کیا۔ اس لئے کہ تعلیم و تعلم اور اشیاء کے اسباب کی معرفت اسلام کے خاص خصوصیات میں سے ہے۔ مسلمانوں نے علوم، فنون، صنائع اور حیات اجتماعی میں وہ بڑے بڑے حقائق ظاہر کئے جن کی وجہ سے تمام ممالک اسلامی انسانیت کی تکمیل کے لئے درسگاہ عظیم بن گئے ایسے زمانے میں جب کہ اور ممالک میں بالکل اندھیرا تھا۔

میں نے عرصے سے اسلام کی اس جامعیت و کمال کے اسرار و اسباب کی تلاش میں یہ معلوم کیا ہے کہ وہ اصلی روح جس سے دین اسلام کے تمام مظاہر حیات میں ایک حرکت پیدا ہے وہ درحقیقت وہ الہام ہے جس کی بدولت یہ وحشت و جہالت اللہ تعالیٰ کی بندگی اور حیات دنیاوی کے تمدن اور حیات اخروی کے ثواب میں تبدیل ہو گئی۔ انسان جب کسی اعتقاد کو اختیار کرتا ہے تو اس کے لئے یہی کافی نہیں کہ وہ اس کو اپنے دل میں جگہ دے اور اپنے اعمال سے اس کی تصدیق کرے۔ بلکہ اس کو دوسروں کے کانوں تک باواز بلند پہنچانا بھی چاہئے تاکہ ان کو بھی ترغیب ہو۔ اسلام نام ہے عقیدے اور اعمال کا، وہ اعمال اور عقائد جو نمونہ ہوں اپنے بھائیوں کے لئے، جو ان کی زندگی میں ایک ایسی قوت پیدا کر دیں جو حق کو باطل پر غالب کر دے انسانیت کو شک کی تاریکیوں سے نجات عطا کرے اور لوگوں کو سیدھے راستے کی ہدایت دے۔

میرے بزرگو! یہ ہیں وہ باتیں جو اسلام کی جانب (دیکھئے صفحہ ۶)

آدمی کی کہانی
ایک ستارے کی زبانی

شام ہوئی سب تارے منہ ہاتھ دھوکر اور بن سنور کر تیار ہوئے۔ ایک نے کہا "چلو ذرا دنیا والوں کا تماشہ ہی دیکھیں"۔ مگر وہی چھوٹا سا سمجھ دار ستارہ جسے تم جانتے ہو کہنے لگا "ہم تماشہ وماشہ نہیں دیکھتے۔ ہم تو کہانی سنیں گے۔ جانتے ہو نہیں کہ یہ دنیا والے ہیں کون، اور چلے تماشہ دیکھنے!" دو تین تارے اور بھی اس کی طرف سے بولے، اور پھر تو سب نے یہی کہا کہ "چلو نانی اماں سے وہی آدمی والی کہانی سنیں"۔

سب نانی اماں کے پاس پہنچے اور لگے کہنے "نانی اماں کہانی، نانی اماں کہانی"۔ نانی نے کہا "بیٹا، سنبھل کے بیٹھو۔ ذرا دم تو لینے دو۔ میں تو کہہ ہی چکی ہوں کہ روز تمہیں تھوڑا تھوڑا حال ان دو ہاتھوں، دو پاؤں والوں کا سنایا کروں گی۔ پھر یہ بے صبری کیوں ہے؟" سب نے کہا "اچھا تو کہئے"۔

نانی اماں بولیں "ہاں تو میں نے قصہ کہاں تک کہا تھا؟" ایک تارے نے جواب دیا "نانی اماں آپ یہ کہہ رہی تھیں کہ دودھ پلانے والے جانوروں میں ایک عقل اور یقین کی وجہ سے اوروں سے بہت بڑھ گیا اور یہی آدمی ہے۔ مگر یہ تو بتایئے کہ بڑھ چڑھ کر ان حضرت نے کیا کیا؟" "ہاں ہاں" نانی اماں نے کہا "اب یہی بتاتی ہوں۔ سنو"۔

"پہلے تو اوروں سے بڑھنے چڑھنے پر بھی اس کا حال بڑا خراب تھا۔ میں تو جب وہ حالت یاد کرتی ہوں تو ہنسی آنے لگتی ہے۔ یہ باتیں کرنا چاہتا تھا مگر باتیں کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ عجیب طرح سے غوں غوں کرتا اور اشاروں سے کام لیتا تھا۔ البتہ اسی وقت سے پتہ چلتا تھا کہ اس کے اندر کچھ بھرا پڑا ہے جسے ظاہر کرنا چاہتا ہے، مگر اس کی صورت نہیں جانتا۔ لیکن بیٹا جس کے اندر کچھ ہوتا ہے وہ اس کے اظہار کی تدبیر بھی کر ہی لیتا ہے، ویسے کے ویسے تو وہی رہتے ہیں جو اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ ہر کام ہاتھوں سے کرنا چاہتا اور اپنی انگلیوں کو لہو لہان کر لیا کرتا تھا۔ کپڑے لتے نصیب نہ تھے۔ یونہیں ننگا ڈلا پھرا کرتا تھا۔ کھانا اسے پکانا نہ آتا تھا پھل پھلاری اور کچے گوشت سے پیٹ پالتا تھا۔ عقل اس کی دوسروں سے تیز تھی مگر ہاتھ پاؤں نہ تو اور جانوروں کی طرح مضبوط رہے تھے نہ ان میں وہ پھرتی تھی، اس لئے شروع شروع میں دوسروں سے اسے اچھا خاصہ نقصان پہنچ جاتا تھا۔ مگر ہوتے ہوتے اس کی عقل نے اسے تدبیریں سجھائیں۔ اسے جو کچھ قدرت نے دیا تھا اس میں اس نے تھوڑی بہت تبدیلی کر کے اپنے کام کا بنانا شروع کیا اور اس ترمیم کو تمدن یا تہذیب کہتے ہیں جو دنیا میں بس اسی جاندار کو نصیب ہوئی ہے۔ ورنہ باقی تو جیسے پیدا ہوئے ویسے ہی رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اپنی طرف سے اپنی زندگیوں میں کچھ تبدیلی نہیں کر سکتے۔

اس آفت کے پرکالے نے تو اپنی عقل اور اپنے یقین کے زور پر زندگی کا رنگ ہی بدل دیا۔ غوں غوں کرتے کرتے یہ لگا لفظ بولنے۔ چیزوں کے نام لینے۔ اپنے اندر کے خیال دوسروں پر ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ادا کرنے۔ اس کی انگلیوں سے لہو بہا تو اس نے یہ نہ کیا کہ کام چھوڑ دے! چھوڑتا تو مٹ نہ جاتا، جو کام چھوڑتا ہے اس کے لئے دنیا میں جگہ نہیں ہے۔ اس نے کیا یہ کہ اپنے ہاتھوں کو بچانے کے لئے اوزار اور آلات بنائے۔

بلم برچھیوں کے سرے تیار کئے، کلہاڑی کی سی چیزیں بنائیں اور یہ بھی جانتے ہو کیسے؟ ذرا بوجھو تو سہی؟" تارے بولے " اماں، یہ بوجھنا وجھنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم تو سننے آئے ہیں کہانی۔ آپ کہتی ہیں بوجھو۔ ہمیں کیا خبر کاہے سے بنائے، آپ نے دیکھا ہے آپ بتایئے" نانی اماں نے مسکرا کر کہا " اچھا، اچھا۔ مت بوجھو۔ میں ہی بتاتی ہوں۔ یہ چیزیں اس نے پہلے پہل پتھروں کو چھیل چھیل اور کاٹ کاٹ کر بنائیں، یا پتھر کو پتھر پر گھس کر جس سے پتھروں میں دھار پیدا ہو جاتی تھی۔ ان ہتھیاروں سے اس نے جانوروں کو مارنا شروع کیا اور مزے سے ان کا کچا گوشت کھا کھا کر مگن رہنے لگا۔ مگر اسی کا جی تھا۔ میں تو وہ سینڈا بدبودار گوشت کبھی چھوتی نہیں۔ اور ہاں، ان مرے ہوئے جانوروں کی کھالیں نکال کر یہ بدن سے لپیٹ لیتا اور اس طرح اپنے کو سردی سے بچاتا۔ خیر تو ایسے ہی گرتے پڑتے اس کے دن کٹتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے ان میں سے ایک آدمی جو ذرا بے فکرا سا تھا اور ابھی پیٹ بھر کے کچا گوشت کھا چکا تھا دو تیلی تیلی لکڑیاں لیئے بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیا سوجھی کہ کچھ گنگنانے لگا اور لکڑی پر لکڑی رگڑنے لگا جیسے سارنگی بجاتے ہیں نا۔ اس سے کچھ کچھ آواز بھی نکلتی تھی جو اسے گنگنانے کے ساتھ بھلی معلوم ہوتی تھی۔ یہ خوب مزے لے لے کر جھوم رہا تھا کہ یکایک ان لکڑیوں میں، شاید بانس کی کھپچیں تھیں، ایک چمکدار سی چیز نکلی۔ اس نادان کو کیا خبر تھی کہ یہ کیا چیز ہے۔ ڈر گیا اور ڈر کے ان لکڑیوں کو وہ پھینکا، دور۔ لکڑیاں جا کر سوکھی گھاس میں پڑیں اور وہ لگی بھک بھک جلنے۔ اس کے خوف کا عالم نہ پوچھو۔ سہم کر وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ بھاگے مگر ایک ایک پاؤں دو دو من کا ہو گیا تھا۔ موسم سردی کا تھا۔ کچھ فاصلے سے آگ کی گرمی جو لگی تو اس کے بدن کو بڑا آرام ملا۔ ادھر دیکھتے دیکھتے وہ سوکھی گھاس جل کر راکھ ہو گئی اور وہ چمکتی دہکتی چیز ختم۔ اس آدمی نے اوروں کو خبر دی کہ یہ ماجرا ہوا۔ دوسروں نے بھی یہی کر دکھایا یا مگر ڈرے۔ اور سب کو منع کرنے لگے کہ خبردار ایسا نہ کرنا نہیں نہ جانے کیا اور مصیبت آئے گی۔ سارا جنگل جل جائے گا اور ہم سب بھن کر کباب ہو جائیں گے۔ لیکن پہلے دن سے آدمیوں میں کچھ ایسے ہوتے آئے ہیں جو خاص کر کے وہی کام کرنا چاہتے ہیں جس میں خطرہ ہو۔ ان لوگوں سے آدمیوں کے بڑے بڑے کام بنے ہیں۔ ہاں تو اس وقت بھی ایسے بعض لوگوں نے پھر تجربہ کیا اور پھر لکڑیوں کو رگڑنے سے وہی چمکدار گرم چیز نکلی۔ پھر پتھروں کو پتھروں پر مارنے سے یہ خوبصورت چنگاری نکالی گئی۔ غرض آدمی نے آگ کا پتہ چلایا۔

ایک تارہ بولا " مگر نانی اماں۔ اس سے تو سچ مچ بڑی مصیبت آگئی ہو گی۔ یہ لوگ جس سے خفا ہوتے ہوں گے سوتے میں جا کر اسے جلا دیتے ہوں گے"۔ نانی اماں نے کہا " نہیں نہیں سب پر بدگمانی کرنا اچھی بات نہیں۔ کوئی کسی کو کیوں جلائے۔ آدمی آدمی کی جان کا بہت خیال کرتے ہیں۔ وہ تو کبھی کبھی کچھ دیوانے سے ہو جاتے ہیں تب ایک دوسرے کو مارتے کوٹتے، جلاتے تکلیف دیتے ہیں۔ نہیں تو اپنے مل جل کر خوشی خوشی رہتے ہیں"۔ آگ معلوم ہونے کے بعد ان لوگوں نے اس سے ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اپنے نہ جانے کتنے کام بنا لیئے۔ سب سے پہلے تو اس پر گوشت بھونا۔ اس کی سینڈ دور کر کے مزے کا بنایا۔ اور اس قابل کہ اچھی طرح ہضم ہو۔ مٹی کے برتن بنا بنا کر اس میں پکائے اور اس طرح مضبوط برتن بننے لگے، سردی سے بچنے کے لئے اس سے کام لیا۔ جہاں کڑاکے کا جاڑا پڑا اور یہ سب ایک الاؤ لگا کر چاروں طرف بیٹھ گئے۔ اور بس جاڑا غائب۔ (باقی)

(بقیہ مضمون اسلام کی صداقت صفحہ ۴)

میری ہدایت اور میری اس علی الاعلان گواہی کا سبب بنیں۔ اشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و اشہد ان محمداً عبدہٗ و رسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

فاطمہ اور رحیم الدین

(بسلسلۂ گزشتہ)

رحیم الدین اور فاطمہ اپنے پلنگ پر سونے کے لئے لیٹے تو باپ کی باتیں انھیں آپ ہی آپ یاد آگئیں۔ رحیم الدین نے سوچا کہ اگر اس نے کتاب فاطمہ کو دیکھنے کے لئے دے دی ہوتی تو وہ اسے کبھی خراب نہ کرتی، اور اس پر کاغذ چڑھا دیا ہوتا تو اس کی جلد بھی میلی نہ ہوتی۔ اس کے چھپانے کا نتیجہ یہی ہوا کہ وہ خود کتاب کو کبھی اطمینان سے نہ دیکھ سکا اور وہ پھٹ بھی گئی۔ ابھی تک چھوٹی موٹی لڑائیوں کے سوا اس میں اور فاطمہ میں کبھی اَن بن نہیں ہوئی تھی اسے یقین تھا کہ فاطمہ اس سے محبت کرتی ہے۔ پھر جب اسے یاد آیا کہ اس نے فاطمہ کو غصہ میں کیسی بے دردی سے طمانچہ مارا اور وہ کس طرح چیخ اٹھی تھی تو اسے بہت ندامت ہوئی لیکن اس کی کتاب پھٹ گئی تھی، اور یہ ایسی خطا تھی جسے معاف کرنے پر وہ اپنے دل کو راضی نہیں کر سکا۔ دوسری طرف فاطمہ یہ سوچ رہی تھی کہ اسے ایک کتاب کے لئے جس کی تصویریں بھی کچھ ایسی اچھی نہیں تھیں، اپنے بھائی سے لڑنا نہیں چاہئے تھا۔ بھلا کتاب بھی کوئی بڑی چیز ہے اگر وہ چند روز اور ٹھہر جاتی تو رحیم الدین خود اس کی تصویریں دیکھتے دیکھتے اُکتا جاتا، اور پھر وہ چاہتی تو اسے مانگ کر اپنے پاس رکھ لیتی۔ مگر ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آتا کہ اس کتاب کے پیچھے اس کے بھائی نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں اس کی محبت کو بالکل بھلا دیا اور اس کے زور سے طمانچہ مارا۔ رحیم الدین کے آگ بگولا ہو کر طمانچہ مارنے کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آتی تو وہ جی کڑا کر کے محبت کے تقاضوں کو ٹال دیتی اور جب وہ سوئی تو یہی ارادہ کر کے کہ ایسے بھائی سے کبھی میل نہ کروں گی۔

لیکن صبح ہوئی تو دونوں کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔ رحیم الدین کی وقت سے آنکھ نہیں کھلی تھی، ماں نے فاطمہ سے کہا کہ اسے جا کر جگا دے، اور فاطمہ اس کے پاس گئی تو دیکھا کہ وہ منہ پھیلائے آہستہ آہستہ خرّاٹے لے رہا ہے۔ فاطمہ نے اپنی چٹکیا اس کے منہ میں ڈالی تو وہ گھبرا کر اٹھا اور آنکھیں مل کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ فاطمہ نے زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ رحیم الدین اس کے پھول کی طرح کھلے ہوئے چہرے کو دیکھ کر خود بھی مسکرا دیا، سویرے یوں بھی انسان کی طبیعت شگفتہ ہوتی ہے اور جو کوئی جھوٹ نہیں بولتا اور دوسروں کو دھوکا نہیں دیتا وہ خوب ہی گہری نیند سوتا ہے اور اٹھتا ہے تو دنیا بھر سے خوش اور ذرا سی بات میں ہنسنے پر تیار۔ رحیم الدین نے مسکرا کر فاطمہ کو زور سے اپنی طرف کھینچا، فاطمہ جھوٹ موٹ مٹکنے لگی اور رحیم الدین پر اس طرح لد گئی کہ وہ پھر پلنگ پر گر پڑا۔ دونوں میں کشتی ہونے لگی اور خدا جانے کب تک ہوتی رہتی، اس لئے کہ رحیم الدین میں طاقت تو زیادہ تھی مگر اس کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں، ہاتھ پیر میں ابھی پورا زور نہیں آیا تھا، اور فاطمہ خوب چلا چلا کر اور منہ بنا کر زور لگا رہی تھی۔ لیکن اتنے میں ماں نے رحیم الدین کو آواز دی اور بھائی بہن نے ہاتھ پیر ڈھیلے کر دیے، تھوڑی دیر تک الگ بیٹھ کر ہانپتے اور ہنستے رہے، پھر دوڑتے ہوئے ماں کے پاس پہنچ گئے۔

رحیم الدین اسکول گیا تو بہت خوش خوش۔ اس نے سبق تو اچھی طرح

سے نہیں یاد کیا تھا، لیکن اس کے دل میں معلوم ہوتا تھا کسی نے کوک بھر دی ہے، اور اس کا ذہن بھی صاف آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے استاد کے سوالوں کا نہایت تیزی سے جواب دیا، اور سب کو حیرت ہونے لگی کہ اس میں اتنی ذہانت یکبارگی کہاں سے آگئی ہے۔ پھر جب وہ گھر پہنچا تو اس کی طبیعت اور بھی زیادہ خوش ہوئی۔ اس کے کمرے میں گرد کا نام نہیں تھا، میز پر ایک صاف چادر بچھی تھی، کرسیوں پر گدے رکھے تھے، الماری پر پردہ پڑا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھ کر تعجب سے پلکیں جھپکانا شروع ہی کیا تھا کہ فاطمہ جو کمرے کے ایک کونے میں کھڑی تھی دوڑ کر اس سے چمٹ گئی۔ باقی دن پیار محبت میں گزرا، شام کو دونوں خوب مزے سے ساتھ کھیلے، اور رات کو دونوں ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے کھانا کھانے کو آئے۔ باپ محبت کا یہ جوش دیکھ کر مسکرایا اور کہا:

"اچھا بھائی، تم دونوں میں میل ہوگیا، اس سے تو ہم کو بہت خوشی ہوئی، مگر کھانا کھالو تو ہم تم سے ذرا بحث کریں گے۔"

کھانے کے بعد باپ نے پھر پہلے کی طرح فاطمہ کو گود میں بٹھایا اور رحیم الدین کو پاس بلا کر اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ اب لڑائی نہیں تھی، اس لئے دونوں میں سے کسی سے نچلا نہیں رہا جاتا تھا، کبھی رحیم الدین فاطمہ کو گدگداتا، کبھی وہ اس کے چٹکی لیتی۔ پھر باپ نے باتیں چھیڑ دیں۔

"بھئی دیکھو، ہم تم سے پچھلی بار کچھ کہہ چکے ہیں، وہ تمہیں یاد ہے؟"

فاطمہ اور رحیم الدین دونوں کو اس کی باتیں یاد تھیں، مگر ان کے ساتھ انھیں اپنی لڑائی بھی یاد آتی تھی، دونوں اپنے جی میں سمجھتے تھے کہ ہم نے بہت بڑی حماقت کی ہے، وہ چاہتے تھے کہ لڑائی کا سارا قصہ بھول جائیں اور اس کے ساتھ باپ کی نصیحت بھی، اس لئے جب باپ نے یہ سوال کیا تو وہ بہت جھینپے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر باپ کو اس کا خیال تھا کہ ان میں پھر لڑائی نہ ہو اور چھوٹی چھوٹی رنجشوں کی وجہ سے ان کے دلوں سے ایک دوسرے کی محبت نہ جاتی رہے۔ اس نے پھر وہی سوال کیا اور جب دونوں خاموش رہے تو اس نے کہا:

"مجھے معلوم ہے کہ تم میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہو جب تک تم میں لڑائی تھی اس وقت تم میں سے ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ دوسرے نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے، لیکن اب میل ہوگیا تو تم کو تعجب ہوتا ہے کہ تم آخر لڑے کس بات پر تھے۔ اور میں تم سے پوچھتا ہوں تو تم جواب دیتے ہوئے شرماتے ہو، جیسے کوئی اپنی غلطی یا حماقت پر شرماتا ہو۔ اب میں تم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ غلطی اور حماقت کیوں کی، اور اگر تم بھی میرے ساتھ مل کر اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرو تو تم میں پھر لڑائیاں نہ ہوں گی۔ اچھا فاطمہ، تم یہ بتاؤ، تم آج زیادہ خوش رہی ہو یا کل؟"

فاطمہ اس طرح ہنسی کہ گویا یہ سوال کرنا بالکل فضول تھا، اور کسی کو ایسی بات کا جواب نہ معلوم ہو تو خدا اس پر رحم کرے۔ وہ تو بہت بیوقوف ہوگا۔ اس لئے وہ ہنسی اور ہنس کر رہ گئی۔ باپ نے کہا:

"خیر، تمھارے ہنسنے ہی سے مجھے معلوم ہوگیا کہ تم آج زیادہ خوش ہو۔ اور میں اب تم سے ایسے سوال نہیں کروں گا، نہیں تو تم میرے اوپر ہنسو گی اور سمجھو گی کہ میں بڑا بیوقوف ہوں۔ اچھا تم سے ایک ذرا زیادہ مشکل سوال پوچھتا ہوں اب تم بتاؤ کہ رحیم الدین نے تمھیں اپنی کتاب نہیں دکھائی تو تمھیں برا کیوں معلوم ہوا؟" (باقی)

ڈاکٹر سن یت سین
جمہوریت چین کا بانی

گزشتہ اشاعت میں یہ ذکر تھا کہ سن یت سین نے کس طرح اپنا رازدار اور ہم خیال تلاش کیا، اس نمبر میں یہ بتایا جائے گا کہ اس نے انقلاب کی کیا کیا تدبیریں اختیار کیں۔ (مدیر)

ہوہان مین اور سن یات سین کے درمیان یہ بات ہوہی رہی تھی کہ دفعتہً باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کھٹکھٹانے کی آواز سُن کر دونوں خاموش ہوگئے اور ان کے دلوں میں یہ تشویش پیدا ہوئی کہ باہر کسی کو خبر تو نہیں ہوگئی ہے...... اتنے میں باہر کے آدمی نے اَور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا جس کی وجہ سے دونوں کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ ان کو یقین ہوگیا کہ اسوقت ان کی خیر نہیں ہے۔ باہر والا ضرور کوئی پولیس کا آدمی ہے، جو ان دونوں کو گرفتار کرنے کے لئے آیا ہے۔ اگرچہ دونوں اس تذبذب کی حالت میں تھے، پھر بھی انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور یہ سوچنے لگے کہ اگر ہم نے دروازہ نہیں کھولا تو اور بُرا ہوگا، کیونکہ ممکن ہے کہ باہر والا پولیس کا آدمی نہو بلکہ کوئی اور شخص ہو جو کسی خاص کام سے آیا ہو۔ دروازہ نہ کھولنے سے اس کے دل میں یہ گمان ہوسکتا ہے کہ ہم دونوں کسی خاص کام میں مشغول ہیں۔ آخر سن یت سین نے مردانہ قدم اُٹھایا اور دروازہ کے پاس جاکر بلند آواز سے پوچھا، "کون ہے"؟ "تانگ[ل] یان کائی"! باہر والا شخص بولا۔

اس جواب نے سن یت سین کی تشویش کو کسی قدر دور کردیا، کیونکہ تانگ یانکائی بھی ایک باہمت، اور مستقل مزاج نوجوان تھا۔ جو سن یت سین کے خاص دوستوں میں سے تھا۔ پھر بھی سن یت سین کو یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تانگ یانکائی اس کا ہم خیال نہ ہو، اور ان کی خفیہ باتوں کو معلوم کرکے باہر مشہور کردے۔ سن یت سین نے حتی الامکان اپنے اس خیال کو دبایا، اور بے جھجک، جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔

جب تانگ یان کائی سن یت سین کے کمرہ میں داخل ہوا اور ہوہان مین کو وہاں پایا، تو وہ بہت متعجب ہوا، اور اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ ہوہان مین بالکل خاموش تھا اور اس کی زبان سے کوئی بات نہ نکلی، مگر آنکھوں کے اشارہ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ سن یت سین اس وقت تانگ یانکائی سے کسی چیز کے متعلق گفتگو کرے گا۔ چند منٹ کے بعد آخر سن یت سین نے مہر سکوت کو توڑ دیا' اور تانگ یانکائی سے یوں ہم کلام ہوا۔

سن یت سین: "بھائی، ہم دونوں اسوقت یہاں جمع ہوکر ایک اہم مسئلہ پر غور کررہے ہیں......"

تانگ یانکائی: (بات کاٹ کر) کیا اہم مسئلہ ہے، ذرا میں بھی سنوں۔

ل Tan Yan Kai

سن یت سین:۔ تم معلوم کرکے کیا کروگے؟

تانگ یانکائی:۔ کیا کروں گا؟ تم کو مشورہ دوں گا!

سن یت سین:۔ لیجئے، بڑے مشورہ دینے والے ہیں!

تانگ یانکائی:۔ فضول باتیں نہ کرو۔ اگر تم نے مجھکو اپنی زبان سے یہ نہ بتایا، تو میں تمہارے دل میں گھس کر معلوم کرلوں گا۔

سن یت سین کا منشا یہ تھا کہ ایسے طریقہ سے اپنے رازدار اور ہم خیال اشخاص پیدا کرے جس سے لوگ اس کی طرف سے بدگمان نہ ہوں اور انقلاب کے کاموں میں ان سے پوری مدد مل سکے۔ چنانچہ جب تانگ یان کائی اس کے کمرہ میں پہنچا، تو اس کا دل ٹٹولنے کے لئے سن یت سین اس سے اس طرح کہنے لگا:۔

سن یت سین:۔ اچھا، تانگ یانکائی، سنو اس وقت میں اور ہوہان ین اس بات پر غور کررہے ہیں کہ جاپان نے ہمارے بادشاہ کو شکست دیدی، اور بہت سا ملک چھین لیا۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے۔ ہمارے بادشاہ نے اس وجہ سے شکست کھائی ہے کہ فوج اگرچہ اس کے پاس موجود ہے لیکن بہادر سپہ سالار نہیں ہیں جو فوج کی رہنمائی کرسکیں اور ان سے کام لے سکیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بادشاہ اور ملک کو ذلت اٹھانی پڑی۔ میں نے اب ہوہان ین سے کہا ہے کہ ہم اور تم دونوں مل کر بادشاہ کے پاس چلیں اور یہ عرض کریں کہ ہمیں اپنا فوجی سپہ سالار مقرر کیجئے تاکہ ہم اپنی تدبیر اور حکمت سے دشمن کو شکست دیں اگر ہم نے خود شکست کھائی، تو ہم خودکشی کرلینے کے لئے تیار ہیں۔ یہی ہماری سزا ہوگی۔ تانگ یانکائی! میرے خیال میں غالباً ملک کی ذلت دور کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی، تمہاری کیا رائے ہے؟"

اس پر تانگ یان کائی نے لاحول پڑھی اور اپنا ہاتھ میز پر زور سے مار کر نہایت سنجیدگی سے کہا" واہ کیا اچھی تدبیر ہے! میں سمجھا کہ تم دونوں کوئی عقل کی بات کررہے ہوگے۔ اب معلوم ہوا کہ سوائے حماقت اور جہالت کے اور کچھ نہیں ہے۔ سن یت سین! کیا تم بادشاہ کو خدا بنانا چاہتے ہو؟ لاحول ولاقوۃ! بادشاہ بھی کوئی اس قابل ہے! فرض کرو، اگر تم بادشاہ کے وفادار سپہ سالار بن کر جنگ میں جیت گئے، تو اس سے بادشاہ تو ضرور خوش ہوگا، لیکن عوام کو کیا فائدہ؟ تم کو اس وقت ایسا کام کرنا چاہیئے جو ملک و قوم کے لئے فائدہ کا ہو، نہ کہ کسی ایک شخص کے، خواہ وہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جاپان بڑا ظالم ہے، مگر یہ ظلم کیوں ہوا؟ اس لئے کہ جاپان میں بادشاہت ہے۔ بادشاہت کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخصی ملک کی تمام رعایا کو محکوم اور اپنا غلام سمجھتا ہے، سارے ملک کو وہ اپنی ذاتی ملک سمجھتا ہے۔ اسی پر وہ قانع نہیں رہتا بلکہ مزید مقبوضات حاصل کرنے کے لئے وہ دوسرے ملکوں پر فوج کشی کرتا ہے، لاکھوں آدمیوں کا خون بہاتا ہے، لوگ فنا ہوجائیں تو ہوجائیں، پر اس کو کوئی پروا نہیں ہوتی، وہ چاہتا ہے کہ خود اچھی طرح زندہ رہے، عیش و آرام سے دن گذارے، اور دنیا میں جو جی چاہے، کرے۔ وہ نہایت حریص ہوتا ہے اس کے حرص کی آگ کو کوئی چیز نہیں روک سکتی، جب تک خود اس کی ذات فنا نہ ہوجائے۔ جاپان نے بھی اسی وجہ سے چین پر فوج کشی کی کہ اس کا بادشاہ مزید فتوحات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور صرف جاپان کے اس چھوٹے سے جزیرہ پر وہ قانع رہنا نہیں چاہتا۔ اب تم چاہتے ہو کہ بادشاہ کی مدد کرو، اس کی قوت اور حرص کو بڑھاؤ۔ جب جاپان نے تمہارے بادشاہ کو شکست دے کر تم کو ذلیل کیا اور تم نے جاپان کو ظالم و جابر ٹھہرایا، تو اگر تمہارے بادشاہ نے اس کا ملک فتح کرلیا تو کیا جاپانی تم کو ظالم نہ کہیں گے؟ ضرور کہیں گے! جیسے تم محسوس کرتے ہو، ویسے ہی جاپانی بھی محسوس کریں گے۔

"میرے کہنے کا منشا یہ ہے کہ بادشاہ کی مدد کرنا بالکل بیکار ہے۔

اس لئے کہ اگر بادشاہ فتحیاب ہوا، توہم بادشاہ کے غلام ہوں گے اور اگر شکست کھائی تو غیر ملک کے۔ دونوں صورتوں میں ہم غلام کے غلام ہی رہیں گے۔ اس میں نہ انفرادی آزادی ہے اور نہ اجتماعی۔ روشن خیال اور حوصلہ مند نوجوان کے لئے یہ نہایت ذلت اور شرم کی بات ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے ملک والوں کو کسی اندرونی یا بیرونی قوت کا غلام بنائے۔ وہ نوجوان حقیقی نوجوان ہے جو ملک اور قوم دونو کو بیک وقت اندرونی اور بیرونی قوتوں کی غلامی سے چھوڑائے، تم تو ظاہرا جوان مرد معلوم ہوتے ہو، مگر اب معلوم ہوا کہ تم ایک جاہل اور اندھے ہو کسی چیز کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ تم بادشاہ کی مدد کرنا چاہتے ہو؟ افسوس! افسوس!! تم اپنے آپ کو اور ساری قوم کو بادشاہ کا غلام بنانا چاہتے ہو؟ لاحول ولاقوۃ "

سن یت سین:۔ تم تو لاحول ولاقوۃ پڑھتے ہو، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ملک کس قدر کمزور ہے؟ کیا تم یہ پسند کروگے کہ کوئی غیر طاقت ہمارے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کردے؟

تانگ یانکائی:۔ ملک کی کمزوری دور کرنا اور بات ہے، بادشاہ کو طاقت ور بنانا اور بات۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت ملک کو مضبوط بنانے کی سخت ضرورت ہے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بادشاہ کی مدد کرنا بھی ضروری ہے۔ بادشاہ کی مدد کرنا، گویا تم خود اپنے پاؤں میں بادشاہت کی زنجیریں ڈالتے ہو جس کی وجہ سے تمہیں اس کا غلام ہوکر رہنا ہوگا۔ اس سے نہ ملک کی ترقی ہوسکتی ہے، اور نہ قوم کی۔ ملک و قوم کی ترقی عوام کی مجموعی قوت اور اتحاد عمل پر مبنی ہے، نہ کہ بادشاہ کے وجود پر۔ جاپان نے ہم کو اس لئے ذلیل کیا کہ ہم نے اپنا اعتماد لے دے کے بادشاہ پر چھوڑ رکھا تھا۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ بادشاہ ہی ہماری مدافعت کرے گا، اب تم نے دیکھ لیا کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اگر تمام لوگ یہ بات سمجھتے کہ ملک کی ترقی، اور حفاظت اپنی قوت بازو سے ہوسکتی ہے تو ہرگز ہم کو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا تم بادشاہ کا خیال سر سے چھوڑ دو، بادشاہ اس وقت ایک بچہ ہے۔ ماں کا دودھ پیتا ہے۔ ایسے شیر خوار بادشاہ کو بھاڑ میں جانے دو، اور اس کا نام نہ لو۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کس طریقہ سے ہم ملک کو مضبوط اور طاقت ور بنا سکتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ جب تک یہ کم بخت شیر خوار بادشاہ رہے گا اسوقت تک تمام ملک اس ایک شخص کی ملک سمجھا جائے گا اور جب تک چین کی شخصی حکومت قائم رہے گی، اس وقت تک ملک کا مضبوط ہونا اور قوم کا ترقی کرنا محال ہے!

یہاں تک تانگ یانکائی کہنے پایا تھا کہ سن یت سین نے جھٹ سے اس کا منہ بند کردیا اور جھوٹ موٹ خفا ہوکر بولا: خبردار! ایسی بات زبان سے نہ نکالنا، ورنہ تمہاری خیریت نہیں! اگر باہر کے آدمی کو خبر ہوگئی، تو تمام شہر میں شور مچ جائے گا، اور پولیس اگر ہم کو پکڑلے گی تم تو اس وقت بھاگ جاؤگے، مگر مصیبت میرے اور اس بیچاری ہوٹلین پر آئیگی۔ تم ذرا زبان سنبھال کر بولو، ایسا نہ ہو کہ ہم بادشاہ کے ناقابل معافی مجرم ٹھہریں، تم کو تو کچھ پرواہ نہیں، مگر ہم ناحق اور بے گناہ جان سے جائیں گے"۔

تانگ یانکائی:۔ ناحق میں جان جائے گی! تم موت سے ڈرتے ہو؟ یہی تمہاری جواں مردی ہے! میں تو تم کو ایسا نہیں سمجھتا کہ تم اس قدر بزدل ہو، کیا تم نے یورپ کی تاریخ نہیں پڑھی؟ کیا تم نے امریکہ کی آزادی کا مطالعہ نہیں کیا؟ کیا تم کو انقلاب فرانس کی کچھ خبر نہیں؟ انقلاب فرانس اسی لئے ہوا کہ عوام کو شہنشاہیت کے ظلم و استبداد سے تنگ آکر آخر اسی کے خلاف ہتھیار اٹھانا پڑا، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ انقلاب فرانس کے بعد جب عوام نے خود حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی، تو وہ مضبوط اور طاقتور ہوگیا؟ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ استقلال امریکہ کی تحریک کیوں پیدا ہوئی؟ اس لئے کہ امریکہ پر انگریزوں کا تسلط تھا، امریکہ

والے ان کے غلام تھے۔ وہ ان کے ظلم وتشدد کو برداشت نہ کر سکے، بالآخر جارج واشنگٹن جو اس وقت امریکہ کا قاید اعظم تھا، اس بات پر مجبور ہوا کہ وہ انگریزوں کے خلاف جنگ کرے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ خود مختار ہوگیا۔ اس نے غلاموں کو چھوڑایا ملک کو آزاد اور قوم کو مضبوط بنایا اور ایسا مضبوط بنایا کہ اب دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کا کچھ نہیں کر سکتی ہے! یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ظلم خواہ اندر سے ہو، یا باہر سے جب تک اس کو فنا نہ کر دیا جائے، ملک کی اصلاح اور قوم کی فلاح ہرگز نہیں ہو سکتی، تم نے نہیں دیکھا کہ ہمارے ملک میں جو جو بادشاہ گذرے، انھوں نے کیا کیا؟ ملک کو غریب بنایا، رعایا کو پست ہمت، لوگ سب کے سب بزدل ہوگئے اور قوم ساری کی ساری کم زور ہوگئی، چینیوں کو نہ کوئی فن آتا ہے اور نہ ہنر۔ ان میں نہ کوئی مادی ترقی ہے اور نہ روحانی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بادشاہ بھی رہے، اور ملک کی ترقی بھی ہو! میں نے تمہارے جیسا بزدل اور پست ہمت نہیں دیکھا کہ تم صرف ایک شخص کی خدمت کرنا چاہتے ہو، مصیبت زدہ عوام کو بالکل چھوڑ دے رہے ہو۔ اور ان کی طرف مطلقاً کوئی توجہ نہیں کرتے ہو۔ میرے نزدیک اگر ایک شخص جو قوم اور ملک کی فلاح اور بہبود کے لئے بادشاہ کے خلاف اٹھے تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ بلکہ قابل تعریف ہے۔ وہ شخص ایک سچا، بڑا اور باہمت مرد سمجھا جائے گا جو سارے قوم اور ملک کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے، اور انکی تکلیف کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ یہی انسانیت کا تقاضہ ہے۔ تم مجھ کو ڈراتے ہو، کہ باہر خبر ہو جائے گی، اور سپاہی اگر تم کو پکڑ لیں گے۔ بلا سے پکڑ لیں گے۔ انسان مرے مگر شیر کی طرح تو مرے نہ کہ کتے کی طرح۔ تم شیر بننا نہیں چاہتے ہو؟ افسوس صد افسوس!

(باقی آیندہ)

چین کا قومی جھنڈا

ڈاکٹر جولیس گرمانس

گزشتہ پرچہ میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر جولیس گرمانس صاحب جو ابھی حال میں جامعہ کے "یوم تاسیس" کے موقع پر اسلام لائے ہیں ان کے مفصل حالات زندگی مع تصویر کے اس نمبر میں شائع کئے جائیں گے چنانچہ ذیل کے مختصر حالات زندگی ہدیہ ناظرین ہیں اور تصویر علیحدہ طور پر دی جا رہی ہے۔ اسی پرچہ میں اسلام پر آپ کے خیالات بھی پیش کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر جولیس گرمانس یورپ کے ایک ملک ہنگری کے رہنے والے ہیں اور اس کے پایہ تخت بوداپسٹ میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ پہلے پہل آپ کو ایک انجینیرنگ اسکول میں بھیجا گیا۔ اس لئے کہ آپ کے والدین نے بچپن میں دیکھا کہ لڑکے کا میلان کچھ صنعت و حرفت کی طرف ہے لیکن کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ آپ کے والدین نے اندازہ کرنے میں غلطی کی تھی، چنانچہ آپ کو اس اسکول سے اٹھا کر عام اسکول میں داخل کر دیا گیا، جہاں آپ نے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد آپ کالج میں آئے اور ویانا، لائپزگ، اور برلن کی یونیورسٹیوں میں کچھ کچھ زمانہ تک رہ کر تعلیم حاصل کی۔

اس وقت تک آپ کو اسلامی علوم اور اسلام سے کوئی واقفیت اور دلچسپی نہ تھی۔ آپ کو اپنے ملک ہنگری کی تاریخ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ ہنگری پر چونکہ ایک زمانہ تک ترکوں کا قبضہ رہ چکا تھا، اس لئے ہنگری کی تاریخ کے متعلق بہت کچھ مواد ترکی زبان میں تھا اس وجہ سے آپ کو ترکی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت یورپ میں پروفیسر ومبیری صاحب، اسلامی علوم اور زبانوں کے بہت بڑے عالم سمجھے جاتے تھے چنانچہ آپ نے ان ہی سے ترکی زبان سیکھنی شروع کی، ترکی زبان کے ذریعہ آپکو ترکوں کے اخلاق و عادات اور اسلامی تہذیب و تمدن کا کچھ حال معلوم ہوا۔ اس کے بعد آپ کو خیال ہوا کہ اسلامی تمدن و تہذیب کی اصل حقیقت اگر معلوم ہو سکتی ہے تو وہ عربی زبان کے ذریعہ ہو سکتی ہے چنانچہ آپ نے اسلامی علوم و السنہ کے ایک دوسرے فاضل گولڈزیہر نامی سے عربی پڑھنی شروع کی۔

اس کے بعد سے اسلام کی حقیقت آپ پر روز بروز روشن ہونے لگی، اور اہل اسلام کے ساتھ آپ کی ہمدردی اور دلچسپی بڑھتی رہی، ترک چونکہ اسلامی اقوام میں جغرافیائی اعتبار سے سب سے قریب تر تھے، اس لئے آپ کی دلچسپی و ہمدردی کا سب سے پہلے وہی مرکز بنے ۱۹۰۷ء میں آپ نے تیرہویں صدی میں ترکی کے اہل حرفہ و پیشہ پر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جو اس قدر پسند کی گئی کہ آپ کو اس پر ایک انعام ملا۔ ترکوں کی تاریخ کے ساتھ آپکی دلچسپی یہیں تک نہیں رہی، بلکہ برٹش میوزیم میں جہاں تقریباً ہر ملک کی اور ہر زمانہ کی تاریخیں ہیں، آپ نے ترکوں کی تاریخ کے متعلق بہت کچھ مطالعہ کیا اور اس پر کئی مضامین لکھے۔ آپ کی دلچسپیوں کو دیکھ کر ۱۹۰۹ء میں بوداپسٹ کی اورینٹل اکیڈمی نے آپ کو تاریخ مشرق کا پروفیسر مقرر کیا۔ آپ کی یہ دلچسپی اسلامی علوم و فنون ہی کے ساتھ نہ تھی بلکہ اصل اسلام سے بھی اسی قدر تھی، چنانچہ ۱۹۱۱ء میں آپ نے پروٹسٹائی مذہب والوں کی ایک علمی مجلس میں اسلام پر لکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا، جو گزشتہ جنگ عظیم کے شروع تک جاری رہا۔

ان واقعات سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ آپ کی دلچسپی محض علمی حیثیت سے تھی اور عملاً آپ کو کوئی تعلق اور لگاؤ نہ تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جب جنگ عظیم شروع ہوئی اور جرمنی و آسٹریا ہنگری کے ساتھ اتحادیوں کے خلاف ترکی بھی شامل ہوگئی تو آپ کا ایک طرح سے گویا مسلمانوں کے ساتھ ناتا بندھ گیا۔ زمانہ جنگ میں آپ نے اپنے ہاں ترکی مجروحین کی امداد کے لئے "ہلال احمر" کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور اس انجمن کی طرف سے آپ ترکی مریضوں اور مجروحوں کے لئے دوائیں اور ہر قسم کا ضروری سامان مہیا کرتے تھے۔ ہیضہ اور ٹائیفائڈ کے لئے آپ انجکشن کی شیشیاں خرید کرلے جاتے تھے، جو بہت قیمتی ہوتی تھیں۔ ایسے سپاہیوں کے لئے جو جنگ میں ہاتھ پاؤں سے بے کار ہوگئے تھے، آپ جرمنی سے ان کے لئے ربر کے مصنوعی ہاتھ پاؤں فراہم کرتے تھے جو بالکل قدرتی اعضاء کی طرح کام دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ طلعت پاشا نے جو اُس وقت وزیر جنگ تھے، آپ کو اپنے ہم قوموں کی یہ امداد کرتے دیکھا تو ایک بار آپ سے مذاق سے فرمایا کہ "مسٹر گرمانس! کیا آپ اپنے ہاں سے ان ہاتھ پاؤں کی طرح بنے ہوئے سر نہیں لاسکتے؟ جس کی آج کل ہمارے ملک میں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔"

ان ہی ہمدردانہ تعلقات کا نتیجہ تھا کہ ترکوں کے بڑے بڑے اشخاص کے آپ نہ صرف معتمد بلکہ نہایت گہرے دوست ہوگئے۔ انور پاشا سے آپ کے نہایت دوستانہ تعلقات تھے اور اس دوستی میں آپ نے بہت کافی تکلیفیں بھی اُٹھائیں۔ ایک بار کا قصہ ہے کہ جب آپ قسطنطنیہ میں ہا کرتے تھے انور پاشا آپ کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ یکبارگی دروازے سے کچھ فوجی سپاہیوں کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ انور پاشا جو نہایت ذکی اور ذہین شخص تھے، فوراً سمجھ گئے کہ یہ انکی گرفتاری کا سامان ہے جھٹ کھڑکی سے کود کر نکل گئے۔ فوجی سپاہی اندر آئے اور انھوں نے دریافت کیا انور پاشا کہاں ہیں؟ اور اسکے بعد ہر طرف تلاش کرنا شروع کردیا جب کہیں سراغ نہ ملا تو مجبوراً آپکو پکڑ کرلے گئے اور کوئی ۱۰۔۱۱ دن تک حراست میں رکھا۔ لیکن اسوقت چونکہ غیر ملکی طاقتوں کو ترکی میں بہت حقوق حاصل تھے اسلئے ہنگیرین قنصل کے احتجاج پر آپکو فوراً چھوڑ دیا گیا اور اس بے ثبوت گرفتاری پر حکام کو کافی تاوان بھی ادا کرنا پڑا۔ اس طرح ترکان احرار کے ساتھ ہمدردی اور تعلق کی بنا پر آپکو متعدد بار مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن آپ اس سے کبھی نہ جھجکے۔

ترکی کے اس قیام اور ترکوں کے ساتھ ان تعلقات کا یہ اثر تو ضرور ہوا کہ آپ کے دل میں اسلام اور ان سرفروشان اسلام کی محبت والفت کا ایک گہرا نقش بیٹھ گیا جنگ عظیم ختم ہونیکے بعد آپنے یہ ارادہ کیا آپ اپنے ملک ہنگری میں ترکوں کی گذشتہ شوکت وعظمت کی ایک یادگار قائم کریں جو ایک خانۂ خدا کی صورت میں ہوگی۔ بوداپسٹ میں "گل بابا" کے نام سے ایک بزرگ کا مزار ہے جو ترکوں کی گزشتہ سیکڑوں یادگاروں میں سے لے دے کے اب ایک تنہا یادگار باقی رہ گئی ہے۔ آپ نے سب سے پہلے شیخ الاسلام سے یہاں ایک مسجد بنوانے کا فتویٰ حاصل کیا اور اپنے ہاں کی میونسپلٹی سے زمین کا ایک عطیہ لے کر ایک چھوٹی سی مسجد کی بنیاد ڈال دی، اور اس کی توسیع کے لئے مزید سرمایہ اکٹھا کیا جو بدقسمتی سے گزشتہ تبادلہ کی کشمکش میں بہت کم ہوگیا۔

جنگ ختم ہوجانیکے بعد آپ پھر اپنی جگہ واپس کردیئے گئے اور آج کل آپ بوداپسٹ یونیورسٹی میں شعبہ مشرقی کے صدر کی حیثیت سے ہیں اب سے ڈھائی سال پیشتر آپ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی بین الاقوامی یونیورسٹی میں شعبہ علوم اسلامی کے صدر کی حیثیت سے آئے۔ ایک سال پیشتر جامعہ سے راقم الحروف کو آپکے ساتھ کام کرنے کے لئے اس شعبہ میں بھیجا گیا تھا چنانچہ اسی تعلق سے اس سال آپ جامعہ تشریف لائے اور اپنے سابقہ میلانات کی بنا پر جامعہ کے یوم تاسیس کی تقریب میں اپنے باقاعدہ قبول اسلام کا اعلان فرمایا۔ خدائے تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اس صراط مستقیم پر قائم رکھے۔ آمین

جن طالب علموں نے یورپ کا جغرافیہ پڑھا یا نقشہ دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ جزیرہ نمائے اسکنڈے نیویا براعظم یورپ کے شمال میں ایسا نکلا ہوا ہے جیسے کسی نے ایک ٹانگ پھیلا دی ہو۔ اس جزیرہ نما میں دو ملک ہیں۔ اوپر ناروے اور نیچے سوئڈن۔

آج جس سائنسداں کے حالات اور کارنامے ہم بیان کرنا چاہتے ہیں وہ ملک سوئڈن ہی کا باشندہ تھا۔ اس کا نام کارل ولہم شیل تھا۔ اس کا باپ معمولی حیثیت کا ایک تاجر تھا۔

شیل ۱۷۴۲ء میں بائل کے انتقال کے تقریباً پچاس برس بعد پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے لئے باپ نے ایک غیر سرکاری مدرسہ میں داخل کرادیا اس کا باپ چونکہ اتنا خوش حال نہ تھا کہ ہونہار بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلائے اس لئے مدرسہ کی تعلیم ختم کرتے ہی اس کو ایک عطار کے ہاں ملازم رکھا دیا۔ اس عطار کے دواسازی کے کارخانہ میں مختلف دوائیں تیار ہوتی تھیں جہاں سب سے پہلے شیل نے فن دواسازی اور اس کے مختلف طریقوں کا نہایت غور سے مطالعہ کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے ان تمام دواؤں کے خواص، ترکیب اور ماہیت کے متعلق ضروری اور کارآمد معلومات عملی طور پر حاصل کرلیں جو اس زمانہ میں استعمال کی جاتی تھیں۔ عملی کام کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے سائنسدانوں کی تصنیفات کا بھی وہ مطالعہ کرتا رہا۔ اس کے شوق اور انہماک کو دیکھ کر کارخانہ کے مالک نے اسکی صحت کے متعلق جن الفاظ میں خدشہ کا اظہار کیا وہ اس ہونہار نوجوان کی علمی قابلیت اور عملی سائنس کے ساتھ اس کے شغف کا بیّن ثبوت ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"جو گھنٹے اس نوجوان کو سونے اور آرام کرنے میں گذارنے چاہئیں ان کو یا تو وہ ایسی کتابوں کے مطالعہ میں گزارتا ہے جن کا معیار اسکی قابلیت سے بلند ہوتا ہے یا ایسے تجربے کرنے میں گذار دیتا ہے جن میں اس سے زیادہ عمر رسیدہ اور زیادہ تجربہ کار ملازموں کا دماغ بھی چکرا جائے۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں اس محنت سے اس کی صحت خراب نہ ہوجائے۔"

اب شیل کو عملی کام کرتے ہوئے پورے گیارہ برس گذر گئے عطار نے بڑھاپے کی وجہ سے اپنا کاروبار فروخت کردیا۔ ایک دوسرے عطار کے ہاں قلیل عرصہ تک کام کرنے کے بعد سوئڈن کے دارالسلطنت اسٹاک ہالم میں آگیا۔ جہاں اس نے بحیثیت مہتمم دواخانہ کے ملازمت اختیار کرلی۔

اس کی نشست گاہ کھڑکی کے پاس تھی جس میں سے سورج کی کرنیں گزر کر اس کی میز کو روشن اور جسم کو گرم کرتیں۔ ایک روز جب کہ سورج نہایت ہی آب و تاب سے چمک رہا تھا شیل اپنی نشست پر بیٹھا خیالات میں غرق تھا کہ کچھ آوازیں سنائی دیں غور سے سننے پر معلوم ہوا کہ وہی روشن اور خوبصورت کرنیں اس کو خواب غفلت سے ہوشیار کرکے عملی کام کی طرف متوجہ کررہی ہیں کرنیں بزبان حال اس سے یہ کہہ رہی تھیں "جناب! ہم کو ننھی کرنیں دیکھ کر حقیر نہ سمجھئے ہم

میں حرارت اور روشنی ہے، ہمارے نمودار ہوتے ہی تمام کائنات میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے ہم کو اللہ میاں نے تمام کائنات کی خدمت کے لئے مامور کیا ہے۔ ہم نے مسلسل لیکن خاموش پیغامات بھیجے، مگر آپ متوجہ نہوئے۔ ہم نے پیہم آپکی طرف دست اعانت بڑھایا لیکن آپکو جنبش نہ ہوئی۔ کیا اب بھی آپ ہم سے آنکھ چُرائینگے۔ شیل نے چونکے ہوکر کہا نہیں ہرگز نہیں مجھے کل ہی اس تجربہ کو شروع کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ دوسرے روز اسنے چاندی کے ایک مرکب سلور کلورائڈ (silver chloride) کو کرنوں کی ضیافت طبع کے لئے کھڑکی کے سامنے رکھ دیا کرنوں میں جس جماعت کو اس مرکب سے مناسبت تھی وہ فوراً متوجہ ہوئی اور چند ہی لمحوں میں اپنے اثرات کو ظاہر کر دیا۔

اس عجیب وغریب اور اہم مشاہدہ کی صحت سے مطمئن ہوکر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ سورج کی بعض کرنیں سلور کلورائڈ کے تجزیہ پر کم اثر کرتی ہیں اور بعض زیادہ۔ اسی تجربہ کے دوران میں سائنس کے رسالوں میں پہلی مرتبہ اس کا نام بحیثیت موجد کیمیا کے ظاہر ہوا۔

ایک مرتبہ اس نے ایک مرکب کے متعلق اپنے کچھ تجربے لکھ کر اسٹاک ہالم کی اکاڈمی میں بھیجے لیکن اکاڈمی کے سائنسداں برگمین نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اسی طرح اُس نے ایک اور مقالہ جو اس کی جدید تحقیقات پر مشتمل تھا اسی اکاڈمی میں بھیجا۔ وہ پڑھا تو گیا لیکن برگمیں کی مداخلت کی وجہ سے شائع نہیں ہوا۔ شیل کو اکاڈمی کے ذمہ دار عہدہ داروں کا یہ طرز عمل بہت ناگوار معلوم ہوا اس لئے اس نے دارالسلطنت کو خیرباد کہہ کر ایک دوسرے شہر میں ملازمت اختیار کرلی اور وہیں اپنی تحقیقات کا سلسلہ بھی جاری کر دیا۔

اسی اثنا میں برگمیں نے ایک تجربہ کیا جس کے نتائج اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ اس کے دوست نے (جو شیل کی قابلیت سے بھی واقف تھا) کہا کہ فلاں عطار کے ملازم شیل سے دریافت کرو۔ چنانچہ برگمیں نے جب شیل کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کیا تو اس نے مفصل طور پر اس کی حقیقت بیان کر دی۔ وہی برگمین جس کے نزدیک شیل کے مقالات کوئی اہمیت نہ رکھتے اس کی قابلیت کا ایسا معترف ہوا کہ مرتے دم تک اس کی رفاقت نہ چھوڑی۔

بتیس برس کی عمر میں شیل اسٹاک ہالم کی مجلس سائنس کا رکن مقرر ہوا۔ یہ وہ اعزاز تھا جو اس سے پہلے کسی دواسازی کے طالب علم کو حاصل نہیں ہوا تھا ۲۵ برس کی مسلسل محنت کے بعد اس کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچا۔ یورپ کے ہر ملک میں اس کا نام ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ بعض بیرونی سلطنتیں بڑی بڑی رقمیں بطور مشاہرہ کے پیش کرکے اپنے ملک میں بلانے کو تیار تھیں۔ لیکن شیل اپنی مادر وطن کی خدمت کو اپنا فرض اولین سمجھتا تھا۔

سوئڈن سخت سرد ملک ہے۔ کڑاکے کے جاڑوں میں شیل اپنے معمل میں گھنٹوں کام کرتا جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ گھٹیا کے مرض میں مبتلا ہوگیا لیکن اس حالت میں بھی اس نے تحقیقات کو جاری رکھا۔ اپنی عمر کے آخری سال یعنی ۱۷۸۶ء میں اُس نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ شورے کے تیزاب پر سورج کی روشنی کا کیا اثر ہوتا ہے تجربے کرنا شروع کئے لیکن جاڑا شروع ہوگیا۔ چنانچہ اس نے یہ کہہ کر کہ میں ان تجربوں کو آیندہ موسم گرما میں پھر دہراؤنگا اور دیکھوں گا کہ کیا نتائج ظاہر ہوتے ہیں اپنے تجربوں کو ملتوی کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے شیل کو جاڑے کا موسم دیکھنا پھر کبھی نصیب نہ ہوا اور ۴۳ برس کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا

شیل اول تا آخر عملی سائنسداں تھا۔ خیالات یا اصول پیش کرنیکی بجائے اس نے عملی نتائج پیش کئے۔ اس نے کئی ایک نامیاتی اور غیر نامیاتی ترشے تیار کرکے علم کیمیا کے دائرہ کار کو وسیع کیا۔

آکسیجن گیس کا نام اور اس کے بڑے بڑے خواص کو کم وبیش

سب ہی جانتے ہیں۔ انسان اور دوسرے تمام جانداروں کی زندگی کا انحصار اس گیس پر ہے۔ اس کے انکشافات کا سہرا اسی سوئڈنی کیمیا داں کے سر ہے۔ اس نے اس گیس کو سیندور، شورے اور دوسری اشیا کو گرم کرکے تیار کیا۔ اس گیس کے خواص کی جانچ میں اس نے دیکھا کہ اگر کوئلہ گندھک اور فاسفورس اور لوہے کو ذرا سلگا کر اس میں ڈال دیا جائے تو یہ سب اشیا فوراً بھڑک اُٹھتی ہیں اور نہایت ہی تیز روشنی کے ساتھ جلنے لگتی ہیں۔ اس لئے اس کا نام اس نے "آتشی ہوا" اور "عالی ہوا" رکھا۔

جنگ عظیم کے واقعات کے سلسلے میں کلورین گیس کا نام سننے میں آیا ہوگا اور یہ بھی سُنا ہوگا کہ کس طرح جرمنوں نے غنیم کی فوجوں کو اس گیس سے ہلاک کیا۔ لیکن یہ حقیقت بہت ممکن ہے نہ سننے میں آئی ہو کہ یہی مہلک چیز معمولی نمک کا بھی ایک جزو ہے جس کا روزمرہ کا استعمال ہماری صحت کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ اس گیس کا موجد بھی شیل ہے۔

دودھ کا مزا میٹھا ہوتا ہے، اس لئے کہ اس میں نہایت ہی قلیل مقدار میں شکر پائی جاتی ہے۔ شیل نے دودھ سے اس شکر کو ایک سادہ طریقہ سے تیار کیا۔ فاسفورس، ایتھر، گیلول اور بعض دوسری اشیا کے تیار کرنے کے نئے طریقے وضع کئے۔ لوہے کو مینگنیز سے جدا کرنے کا طریقہ بیان کیا جو آج کل بھی معملوں میں رائج ہے۔

شیل کے انکشافات اور ایجادات کو گنانے کے لئے دفتر چاہئیں اس کے علاوہ ان سب کا ذکر ناظرین کو غیر دلچسپ معلوم ہوگا۔ اس لئے ہم انہی بڑی بڑی اہم اور عام فہم چیزوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔ گو شیل نے کوئی قابل ذکر نظریہ یا اصول وضع نہیں کیا لیکن بحیثیت ایک عملی حکیم کے بلاشبہ وہ اٹھارویں صدی کا سب سے بڑا مکتشف اور موجد تھا۔ ۱۷۷۷ء میں اسکی ایک تصنیف "آتش اور باد" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کی مقبولیت کے لئے صرف اتنا ہی لکھ دینا کافی ہوگا کہ یورپ کی تقریباً تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔

شیل کے کارناموں کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ مالی مشکلات اور خانگی پریشانیوں میں گزرا۔ وہ نہایت ہی محنتی قانع اور دھن کا پکا تھا علم کی جستجو میں جان دیدینا اس کے نزدیک شہادت کا مرتبہ حاصل کرلینا تھا۔ لہٰذا آیئے ہم بھی اس کو "شہید سائنس" ہی کے نام سے یاد کریں۔

سویڈن کے "شہید سائنس" کے کارناموں کا مطالعہ کرنے کے بعد آیئے دیکھیں کہ دنیائے سائنس کی فضا اس وقت کیسی تھی اور کون کون سے ستارے اس کو منور کر رہے تھے۔

انگلستان میں پریسٹلے اور کونڈش حکیم مطلق کی حکمتوں کے مطالعہ میں منہمک تھے۔ اول الذکر نے گیسوں کے متعلق نہایت ہی مفید تحقیقات کرکے ہوا کے عنصر ہونے کی تردید اور اس کے گیسوں کا ایک مخلوط ہونے کے ثبوت پیش کئے۔ سوڈا واٹر کی ایجاد کا سہرا بھی اسی سائنسداں کے سر ہے۔ کونڈش نے پانی کے متعلق تحقیقات کرکے ثابت کیا کہ وہ دو گیسوں (آکسیجن اور ہائیڈروجن) کا ایک مرکب ہے۔

ان حکما کے کارناموں پر سرسری نظر ڈالنے سے ہم کو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کس طرح انہوں نے اربعہ عناصر کے نظریہ کی تردید کی اور اپنے انکشافات سے دنیائے سائنس کو چار چاند لگا دئے۔ لیکن یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا انکی تمام تحقیقات اور نظریئے مشاہدات اور انکی توجیہیں بالکل صحیح اور ناقابل تردید تھیں نہیں ہرگز نہیں آیندہ اشاعت میں بتایا جائیگا کہ کس طرح ان کے اصول اور نظریئے بھی بعد میں غلط

مکتب کا ایک بچہ

مصعب عرف محبوب دہلی ضلع بارہ بنکی کا ایک چار سالہ بچہ ہے جو مدرسہ جامعہ کے مکتب میں پڑھتا ہے۔ عبدالغفار صاحب مدہولی کو جو اس مدرسہ کے صدر معلم ہیں بچوں کی نفسیات کا اندازہ کرنے اور اس کے مطابق انہیں تعلیم دینے کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ ذیل کا مضمون انہی استاد و شاگرد کے درمیان ایک گفتگو کا نتیجہ ہے جس سے یہ اندازہ کرنا مقصود تھا کہ بچہ کو کتنے الفاظ معلوم ہیں اور وہ کس کس قسم کے ہیں۔ امید ہے کہ بچوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اسے خصوصیت سے پسند کریں گے۔ (مدیر)

رات کے کوئی ۷½ بجے مصعب اپنے کمرہ میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے اُس سے کہا اگر میں کچھ لکھوں تو پہچانو گے؟ مصعب نے کہا "ہاں" اور پھر لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ میں نے کاغذ پر باری باری سے "رات، بات، جاٹ، سال" لکھا اور بچے نے پہچاننے کی کوشش کی۔ پھر کہنے لگا "لٹو، گھوڑا" لکھیے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر بچے سے پوچھا کہو اور کیا کیا لکھوں؟ بچے نے کہا لکھیے —— "ہوائی جہاز۔ پھول۔ زنجیر، موٹر۔ تانگا۔ یکہ۔ چاقو۔ ریل۔ انجن۔ سوٹر۔ کاپی۔ دروازہ۔ میز۔ پنکھا" اب وہ تھوڑی دیر کے لئے رُکا۔ میں نے کہا بس ہار گئے؟ اُس نے اپنے آپ پر نظر دوڑائی اور کہنے لگا "بٹن۔ آنکھ۔ کرتا۔ ہاتھ۔ واسکٹ۔ ٹوپی۔ پنسل۔ کتاب" پھر دوسری طرف نظر کی اور کہا "لحاف۔ کوٹ۔ رنگ۔ کپڑے" پھر پلنگ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "تکیہ۔ چارپائی۔ پلنگ" پلنگ کے متصل ایک طاق تھا بظاہر اُس میں کچھ نہیں تھا۔ اُس نے طاق کو اچھی طرح دیکھا اور کہنے لگا "دفتی۔ گیند۔ پیپری موتی۔ ڈور" اب وہ پلنگ سے اُتر آیا، دوڑا ہوا گیا اور کہنے لگا "تار۔ چمچہ کیل۔ چاقو" وہ ہر وقت پلنگ پر سے نیچے آتا اور اوپر جاتا۔ وہ کوئی تھکن محسوس نہیں کرتا تھا۔ شاید کسی اور وقت اُسے دو تین دفعہ پلنگ پر جانے اور نیچے آنے کو کہا جاتا تو وہ تھک جاتا۔ پھر آواز دی لکھیے "پری" میں نے کہا پری کیا ہوتی ہے؟ وہ ایک تصویر اُٹھا لایا جس کے بازوؤں میں پر لگے ہوئے تھے۔ اس نے چھت کی طرف دیکھا اور کہنے لگا "بجلی۔ کرنٹ۔ بجلی کا مسالہ۔ بیٹری

اب وہ پھر اُسی طاق کی طرف دوڑا جس کے متعلق میرا خیال تھا کہ اُس میں کچھ نہیں ہے، اور وہ کہنے لگا "ڈبہ۔ نب، ڈوری" ایک اور لڑکا جو چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا مجھ سے کہنے لگا "ماسٹر صاحب آپ کس کے بہکانے میں آ گئے ہیں وہ (مصعب) تو کھیلتا جاتا ہے" پھر مصعب نے آواز دی لکھیے "ہیٹر بیڑی، گلوبند۔ لکڑی۔ بلم۔ آدمی" اب وہ یکایک رُک گیا اور کچھ سوچنے لگا اُتنے میں اُسے کچھ خیال آیا۔ اُس نے اس دروازہ کو کھولا جس کا رُخ سڑک کی طرف تھا اور کہنے لگا "زمین، ہوا، بائیسکل" وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کی بوا بول اُٹھیں :-

"بیٹا ہوا لگے گی طبیعت کھراب (خراب) ہتی۔ ہیاں (یہاں) آجاؤ"

مصعب نے کہا لکھیے "آدمی۔ زمین"

"مصوا۔ ہم کا کہین" (ہم نے کیا کہا؟)

اب کی دفعہ مصعب نے چپکے سے دروازہ بند کر دیا اور پلنگ کے نیچے ہو گیا اور کہنے لگا "جھاڑو۔ ازار بند۔ تکیہ۔ صندوق"

اب اُس نے دوسری الماری کھولی اور کہنے لگا "بستہ۔ پیام تعلیم۔ بلم۔ ڈھکن۔ رسّی۔ روٹی" سڑک والے دروازے کو پھر کھولا اور کہنے لگا "سڑک" اب وہ ایک کونے میں گیا اور کہا "تشتری، بسکٹ، نان پاؤ۔ نعمت خانہ۔ پتیلی۔ کرچھا" پھر وہ پہلے طاق کی طرف دوڑا۔ وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر اب کی دفعہ اُس کے چوٹ لگ گئی ایک بار

اور کوشش کی اور لکھوایا "رنگ۔ تارہ"۔ وہ یکایک رک گیا۔ میں نے اُس سے کہا کیا ہار گئے؟ وہ دوسری الماری کی طرف بڑھا اور کہنے لگا "انگریزی" میں نے کہا انگریزی کیا ہوتی ہے؟ وہ ایک ڈبہ اُٹھا لایا جس پر انگریزی میں عبارت لکھی ہوئی تھی پھر کہنے لگا "جھنڈا۔ پاندان۔ سلیٹ۔ دری۔ درزی۔ لوٹا کٹورہ۔ سفیدی۔ کالا رنگ" پھر وہ پلنگ کے نیچے چھپ گیا اور ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"بوا وہ کیا ہے؟"

"ہم کا جانیں تم بوجھو" (ہم کیا جانیں)

اب کی دفعہ وہ پن کٹی اُٹھا لایا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور کہا مجھے سمجھاؤ وہ کیا ہے؟ کہنے لگا "پان کٹی" میں نے کہا میری آنکھیں بند ہیں سمجھاؤ

"وہ جو پان کھاتے ہیں"!

"وہ جو پان کھاتے ہیں"

"میں نہیں سمجھا"

"لمبی۔ لمبی"

"لمبی لمبی کیا ہے؟"

اُس نے پن کٹی پھینک دی اور کہا لکھیئے "دوات۔ کنگھی۔ ہولڈر بوتل۔ جوتا۔ رجسٹر۔ صابن۔ طشتری" اب وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ تھک گیا ہے میں نے کہا بس؟ وہ دوڑا ہوا ایک تیسری الماری کی طرف گیا اور اُسے کھولا اُس میں بے شمار چیزیں تھیں۔ میں ڈر گیا کہ یہ سلسلہ آخر کب تک ختم ہوگا۔ میں نے مصعب کو گود میں اُٹھا لیا اور کہا بھائی تم جیتے تم تو بڑے ہوشیار ہو"

اتنے میں آدمی کھانا لایا۔ بوا نے مصعب سے کہا۔

"لو ہاتھ دھولو۔ بہت کھیل چکے۔ کھانا کھاؤ"

ایک کامیاب اُستاد

یوں تو ایک استاد کو تمام انسانی اوصاف کا مجموعہ ہونا چاہئے لیکن ایک کامیاب استاد بننے کے لئے چند کم سے کم خصائص کا ہونا ضروری ہے۔ یہ خصوصیتیں یہ ہیں:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ استاد کو ایسا ہونا چاہئے کہ وہ اپنے علم کو بچوں کے دل کے اندر اچھی طرح ڈال سکے۔ اسے بچوں کی ضروریات اور دلچسپیوں کا پورا پورا اندازہ ہونا چاہئے۔ وہ خود ایسا ہو کہ بچوں میں مل کر بچہ ہو سکے۔ یہ خوبی کچھ تو قدرتی طور پر ہوتی ہے اور کچھ کوشش سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک استاد اگر یہ خوبی اپنے اندر پیدا کرنی چاہے تو وہ بچوں کے نہایت گہرے مطالعے سے بہت کچھ پیدا کر سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کے پاس ہر قسم کی معلومات کا ذخیرہ ہونا چاہئے سطحی معلومات سے کوئی چاہے کہ وہ اچھا استاد بن سکے تو یہ ناممکن ہے۔ اس کے پاس معلومات کا خزانہ ہونا چاہئے اور وہ اس خزانے کو فیاضی سے خرچ بھی کر سکے کم معلومات کے ساتھ اس میں خود بھی اعتماد نفس اور اطمینان قلب نہیں پیدا ہو سکتا۔

تیسری چیز ایک پُر اثر شخصیت ہے۔ گو اس میں بچوں کے ساتھ دلچسپی پیدا کرنے کا مادہ اور کافی ذخیرہ معلومات بھی ہو، لیکن اگر وہ ایک با اثر شخصیت نہیں رکھتا ہے تو وہ اپنی معلومات سے تشنہ کام بچوں کی پیاس ہرگز نہیں بجھا سکتا۔ اس لئے اسے اپنی شخصیت اور ظاہری حالت بھی ایسی رکھنی چاہئے جو بچوں کے لئے دلچسپی اور توجہ کا باعث ہو۔

چوتھی چیز جو نہایت ضروری اور اہم ہے، یہ ہے کہ اسے اپنی شخصیت کو بچوں کے اندر بالکل فنا بھی کر دینا ہے، یعنی وہ ان میں گھل مل کر ایسا ہو جائے کہ بچوں کو استاد کا بھوت ہر وقت سر پر سوار نہ نظر آئے۔ وہ اپنی شخصیت کو تعلیمی اصولوں اور نظریوں کے ان تک پہنچانے کا ایسا ذریعہ بنائے کہ بچے اس مقصد کے آگے اس ذریعہ کو نہ دیکھ سکیں۔ اسے صرف ایک نگراں اور رہبر ہونا چاہئے اور بس!

(ماخوذ)

کوائف جامعہ

۱۰ ارنومبر کو ڈاکٹر جولیس گرمانس صاحب جن کا اسلامی نام عبدالکریم گرمانس ہے، شانتی نکیتن واپس گئے۔ آپ جامعہ سے بہت اچھا اثر لے گئے ہیں۔ اپنے ایک کرمت نامہ میں لکھتے ہیں کہ "جامعہ اپنے نظم وضبط کے لحاظ سے ہندوستان میں بہترین درسگاہ ہے۔ جامعہ میں ایک ماہ کا قیام میرے ہندوستان کی طویل مدت اقامت کا سب سے خوشکن اور مسرت بخش زمانہ ہے۔ جامعہ والوں کے اخلاق ومحبت کا میرے دل پر نہایت گہرا نقش ہے اور مجھے امید ہے کہ اہل جامعہ کا ہندوستان کی آیندہ زندگی میں بہت بڑا حصہ ہوگا۔"

آپ کے ہمراہ چند دنوں سے شانتی نکیتن کے ایک دوسرے امریکن پروفیسر مسٹر پوائنڈ کر بھی مقیم تھے۔ آپ اس سے پیشتر بھی ایک بار جامعہ آچکے ہیں۔ جامعہ کے کاموں کے دیکھنے اور کارکنان جامعہ سے ملنے کے بعد آپ پر ہندوستان کے مسلمانوں کا بہت اچھا اور گہرا اثر پڑا ہے اس سے پہلے آپ کو صرف بنگال کے مسلمانوں کا تجربہ تھا، لیکن شمالی ہند کی اس سیر کے بعد آپ ہندوستان میں اسلام کا نہایت گہرا نقش اپنے دل پر لے گئے ہیں۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں،

"میں نے وہ چند دن نہایت خوشی اور مسرت سے بسر کئے، کاش ایسے ہی اور دن گزارنے کو ملتے! ان چند دنوں میں میں نے اسلام کو جیسا سمجھا، مجھے اس سے پیشتر کبھی اسکا موقعہ نہیں ملا تھا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی آیندہ تہذیب میں اسلام کا بھی بہت بڑا حصہ ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ جذبات وخیالات جو جامعہ ملیہ میں پائے جاتے ہیں، کاش ہندوستان کے دوسرے حصوں اور گوشوں میں پھیل جاتے"۔

آپ کے علاوہ گزشتہ ہفتہ امریکہ کے ایک اور ممتاز شخص پروفیسر ہاکنگ مع اپنی بیوی کے جامعہ دیکھنے کے لئے تشریف لائے۔ آپ ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے ایک بہت مشہور اور لائق پروفیسر ہیں اور امریکہ کے چند ممتاز فلاسفہ میں سے ہیں، آپ بچوں کی تعلیم کے اس مخصوص طریقہ تعلیم کے بانیوں میں سے بھی ہیں جو ہمارے یہاں ابتدائی جماعتوں میں "مقصدی طریقہ" (یا پروجکٹ میتھڈ) کے نام سے رائج ہے۔ آپ اور آپکی بیوی جو خود بھی تعلیم سے بہت دلچسپی رکھتی ہیں، جامعہ کے کاموں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور دوبارہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔

آپ ہندوستان میں اس کمیشن کے ساتھ آئے ہوئے ہیں جو عیسائی مبلغین کے کاموں کی تحقیقات کے لئے آیا ہے۔

ان کے علاوہ اور دوسرے بزرگوں نے بھی جامعہ کو اپنی تشریف آوری سے ممنون فرمایا اور جامعہ کے کاموں سے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماکر کارکنان جامعہ کی ہمت افزائی فرمائی۔ ان بزرگوں میں سر محمد یعقوب صاحب ممبر اسمبلی، خان بہادر قاضی عزیزالدین صاحب، میر ولایت حسین صاحب، مولوی اکرام اللہ خاں صاحب، مولوی طفیل احمد صاحب مولوی ابن حسن صاحب ایم اے اور غلام قادر معلم صاحب جو رنگون کے ایک تاجر اور جامعہ کے ہمدرد ہیں۔ ان بزرگوں کی تشریف آوری اور جامعہ کے کاموں کے ساتھ دلچسپی یقیناً کارکنان جامعہ کے لئے بہت تقویت اور حوصلہ افزائی کا موجب ہوگی۔

قیمت سالانہ
ڈھائی روپیہ
(؏؍)

پیامِ تعلیم

قیمت فی پرچہ
دو آنے
(۲؍)

جلد ۱۱	یکم جنوری سنہ ۱۹۳۲ ع	نمبر ۵

فہرست مضامین

تصویری معمّے کا انعام

گزشتہ پرچہ میں جو تصویری معمّا شایع ہوا تھا، اس کا حل "پیام تعلیم" کے بہت سے بھائی بہنوں نے بھیجا ہے، جن کے نام اور پتے یہ ہیں:-

۱- عبدالناصر صاحب (جامعہ دہلی)
۲- حبیب اللہ خاں " (گجرانوالہ)
۳- چارلی۔ سی۔ لال " (مین پوری)
۴- ممتاز علی " (برہان پور)
۵- شمس الدین " (گونڈہ)
۶- محبوب احمد " (ملتان)
۷- شیخ مستان " (آکولہ)
۸- محمد صدیق آزاد " (دہلی)
۹- خلیل احمد خاں " (جے پور)
۱۰- محمد میاں خاں " (دہلی)
۱۱- پیرزادہ محمود حسین خاں " (رامپور)
۱۲- سلام حسین " (برہان پور)
۱۳- ابوالکلام " (دہلی)
۱۴- ارجمند بیگم " (جودھ پور)
۱۵- رشید الدین خاں " (لاہور)
۱۶- محمد ایوب " (ضلع میرٹھ)
۱۷- ایم اے، قیوم فاروقی " (فرخ آباد)
۱۸- شبیر احمد " (پلکھوہ)
۱۹- محمد ایوب صاحب (پلکھوہ)
۲۰- محمد یٰسین " (پلکھوہ)
۲۱- مظہر حسن " (پیلی بھیت)
۲۲- ناصر بن سالم " (جامعہ دہلی)
۲۳- مظہر الحق " (جامعہ دہلی)
۲۴- عطاء الرحمٰن "
۲۵- صدیق آزاد " (جامعہ دہلی)
۲۶- عبدالغفار " (امراؤتی)
۲۷- نام ندارد (لامعلوم)

اس میں صحیح حل تو تقریباً سب نے کیا ہے لیکن چند کا قصہ بہت ہی اچھا ہے بالآخر عبدالناصر ابتدائی چہارم تعلیمی مرکز نمبر۱ جامعہ دہلی کا حل سب سے زیادہ پسند کیا گیا چونکہ جامعہ ملیہ کے طلبہ کو اس انعام میں شریک نہیں کیا گیا ہے اس لئے عبدالناصر کے بعد اول انعام کے مستحق چارلی، سی، لال جماعت ششم مشن ہائی اسکول مین پوری قرار دے جاتے ہیں۔ انعام ان صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا ہے اور "پیام" بھائی بہنوں کی دلچسپی کے لئے ہم دونوں بچوں کے قصے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

عبدالناصر ابتدائی چہارم کا قصہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک تالاب میں دو بطخیں رہا کرتی تھیں۔ گرمی کا

موسم جو آیا تو تالاب کا پانی سوکھنے لگا اُس تالاب میں بارش کا پانی ہر سال بھر جاتا تھا اور گرمیوں میں سوکھ جاتا تھا ایک روز دونوں بطخیں آپس میں باتیں کرنے لگیں ایک بولی کہ یہاں سے دو تین میل کے فاصلہ پر دوسرا تالاب ہے اُس میں سے تالاب کا مالک کسی کو بطخیں اور مچھلیاں پکڑنے نہیں دیتا اور نہ اُس کا پانی گرمیوں میں سوکھتا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ہم وہاں جا کر رہیں دوسری بطخ بولی یہ تجویز بالکل ٹھیک ہے کل ہی کو دوسرے تالاب چلے جائیں گے۔

باہر خشکی پر ایک کچھوا پڑا ہوا یہ باتیں سن رہا تھا جب بطخیں چپ ہوگئیں تو وہ رونے لگا بطخوں نے کہا میاں کچھوے کیوں روتے ہو کچھوا بولا تم تو یہاں سے چلی جاؤ گی اور جب یہاں کا پانی سوکھ جائیگا تو میں خشکی میں پڑا پڑا مر جاؤں گا۔ اس لئے روتا ہوں. میں یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ بطخوں نے کہا تم خوشی سے ہمارے ساتھ چلنا مگر یہ تو بتاؤ کہ چلوگے کس طرح. یہ سُن کر کچھوے کو مایوسی ہوئی اور وہ پھر رونے لگا۔ یکایک ایک بطخ بولی اوہو! مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی کچھوا اور دوسری بطخ خوشی سے اچھل پڑے اور پوچھنے لگے۔ کہ وہ ترکیب کیا ہے دوسری بطخ بولی وہ ترکیب میں اُس وقت بتاؤنگی جب کچھوا وعدہ کرے کہ وہ ایک شرط پوری کرے گا کچھوا بولا کہ ہاں میں وہ شرط ضرور پوری کردوں گا یہ وعدہ لے کر بطخ نے کہا وہ ترکیب یہ ہے کہ میں اور میری بہن دونوں ایک لکڑی لے آئیں اُس کے بیچوں بیچ تم لٹک جاؤ اور ہم اُس کے سرے پکڑ کر اُڑ جائیں اور تمہیں دوسرے تالاب میں پہنچا دیں مگر شرط یہ ہے کہ تم اُس لکڑی کو مضبوط پکڑے رہنا۔ اگر منہ کھولا تو گر پڑو گے کچھوا بولا کہ واہ تم نے کیا مجھے ایسا بے وقوف سمجھا ہے کہ میں منہ کھول دوں گا۔

اگلے روز بطخیں ایک مضبوط سی لکڑی لائیں کچھوے نے لکڑی کو مضبوطی سے پکڑا اور بطخوں نے اُس کے دونوں سرے پکڑے اور اسی طرح کچھوے کو لٹکا کر دوسرے تالاب کی طرف اُڑیں۔ یہ ماجرا چند چڑیوں نے دیکھا ان میں سے ایک بولی میں تو جا کر شہر والوں سے کہتی ہوں کہ ایک کچھوا جو فلاں تالاب میں رہتا ہے اُس کو ضرور پکڑیں کیونکہ وہ بہت موٹا تازہ ہے دوسری بولی میں گاؤں والوں سے کہہ آتی ہے کہ وہ کچھوے کو غلیلوں اور پتھروں سے مار کر خوب مزے سے کھائیں تیسری بولی کہ میں تالاب کے مالک کو مروا ڈالوں گی جب کہ وہ مر جائے گا پھر کون منع کرے گا کہ اس تالاب میں سے بطخیں اور کچھوے وغیرہ نہ پکڑو اب تک تو کچھوا چپ چاپ رہا مگر اب اس سے نہ رہا گیا غصے میں آکر بولا کم بختو! اللہ کرے تم تینوں ابھی مر جاؤ۔ بس کچھوے کا منہ کھولنا تھا کہ دھڑام سے نیچے گر پڑا اور مر گیا۔

چارلی سی لال جماعت ششم کا قصہ

کسی جنگل میں ایک تالاب تھا اس میں ایک کچھوا بہت عرصہ سے رہتا تھا اسی تالاب میں ایک بطوں کا جوڑا روزانہ صبح کو تلاش معاش کی غرض سے آیا کرتا تھا اور تالاب کی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو اور کیڑوں کو پکڑ کر کھایا کرتا تھا اور شام کو اپنے آشیانے کی راہ لیا کرتا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد دونوں بطوں اور کچھوے میں دوستی ہوگئی اور یہ دوستی اتنی بڑھی کہ بطوں نے اپنے آشیانے کو تیاگ دیا اور صبح سے لے کر دوسری صبح تک وہیں پڑے رہنے لگے اس طرح سے کچھ عرصہ گزر گیا اور تینوں کی محبت روز بروز بڑھتی ہی گئی اور بغیر ایک دوسرے کے دیکھے ان کے دلوں کو خوشی نصیب نہ ہوتی۔

رفتہ رفتہ اس تالاب کا پانی بھی سوکھنے لگا۔ اور بہت ہی کم ہوگیا۔ ان کے لئے غذا میسر نہ ہوتی تھی بیچارے بہت ہی غمگیں تھے کہ

کیا کریں۔ ایک دن کچھوے نے بطوں سے کہا کہ اس تالاب کا پانی بہت کم ہے اور چند دنوں میں سوکھ جائے گا تو تم لوگ کہاں چلے جاؤگے بط نے کہا کہ میں نے ایک بڑا تالاب دیکھا ہے۔ وہاں پر چلے جائیں گے۔ کچھوے نے کہا میں بھی تمہارے پاس چلوں گا۔ بطوں نے کہا کہ ہمارے پر باز و ہیں ہم اُڑ کر جا سکتے ہیں۔ پر تم کسی طرح سے نہیں جا سکتے اور تمہارا جانا بھی بہت ناممکن ہے۔ خیر ہم تم کو وہاں لے جانے کے لئے کوئی تدبیر سوچیں گے۔ انھوں نے تدبیر سوچی کہ ایک لکڑی لائیں اور دونوں سروں کو ہم دونوں خوب مضبوطی سے پکڑلیں اور بیچ کا حصہ کچھوے کو پکڑا دیں اور کہہ دیں کہ منہ سے خوب زور سے پکڑلو۔

آخر کار بط ایک لکڑی لائی اور ایک سرے پر ایک نے اور دوسرے سرے پر دوسرے نے پکڑلیا اور کچھوے سے کہا کہ بیچ کے حصے کو اپنے منہ سے خوب زور سے دبا لو۔ اور کبھی منہ نہ کھولو۔ چاہے کتنے ہی آدمی شور کریں اور چڑیاں ہمارے پیچھے اڑکر آویں اور شور مچاویں۔ کچھوے نے وعدہ کیا اور قسمیں کھائیں کہ میں اپنا منہ کبھی نہ کھولوں گا چاہے کتنے ہی آدمی اور چڑیاں شور وغل کریں۔

یہ وعدہ کرکے دونوں بطیں کچھوے کو لے کر اُڑنا شروع ہوئیں تالاب جلد اُن سے چھوٹ گیا۔ اور جب میدان میں پہنچے تو لوگوں نے نیچے زمین پر بہت ہی شور کیا اور چڑیاں بہت سی ان کے پیچھے ہولیں اور شور مچانے لگیں، جب وہ اپنے مسکن سے کچھ فاصلہ پر رہ گئے تھے اس وقت چڑیوں نے بہت ہی شور کیا اور کہا کہ دیکھو! یہ بطیں کچھوے کو اُڑائے لئے جاتی ہیں۔ یہ بات کچھوے کے دل میں چبھ گئی اور کچھوا غصہ میں آکر کہنے لگا " جو نہ دیکھ سکے اُس کی آنکھیں پھوٹ جائیں" کچھوے کا یہ کہنا تھا کہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا اور مر گیا۔

ذیل میں چند طلبہ کے اقتباس کا اقتباس مختصر نوٹ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے

ایم۔ اے قیوم فاروقی

کچھوے کا مرغابیوں کے ساتھ لکڑی میں لٹکے جانے پر اس طالب علم نے نئی قسم کا خیال باندھا ہے۔ ہر ایک لڑکے علم نے کچھوے کی اس حرکت کو بے وقوفی پر محمول کیا ہے لیکن یہ طالب علم اس کی دانائی اور فراست کی داد دیتے ہوئے اُس کا غرور ظاہر کرتا ہے

اُس وقت کوؤں اور جانوروں نے بہت شور مچایا اور کچھوے کی بہت تعریف کی جب کچھوے نے یہ سُنا غرور میں آکر بولنے ہی کو تھا ویسے ہی وہ بہت اونچائی سے نیچے گرا اور مر گیا۔

آخر طالب علم نے اسی خیال کے ماتحت نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے

محمد عطاء الرحمٰن

محبت کی اُستواری کے لئے یہ بچہ جگہ کی قید ضروری سمجھتا ہے ایک جگہ لکھتا ہے

ایک جگہ رہنے سہنے کی وجہ سے تینوں میں بڑی محبت ہوگئی۔

کہانی کا خاتمہ اس طرح کرتا ہے۔

ناسمجھ دوست کی حالت پر مرغابیوں نے بہت غم کھایا اور یوں کہتی ہوئی اُڑی چلی گئیں۔ جو عقلمند دوستوں کی نصیحت پر کان نہیں دھرتا اُس کی ایسی ہی بری گت ہوتی ہے۔

ممتاز علی

خطرہ کے موقعہ پر عام طور پر ایسا ہی بولتے ہیں کچھوے سے متعلق خطرہ کے سلسلے میں یہ لکھتا ہے :۔

اس کو اپنے منہ میں پکڑ کر لٹک جا۔ لیکن رستہ میں بولا تو تُو جائے گا

حبیب اللہ خان (گوجرانوالہ)

ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے پر دوست سے اجازت لینا ضروری ہے ایک جگہ لکھتا ہے :۔

بطخوں نے کسی دوسرے تالاب میں جانے کی تیاری کی اور اپنے دوست کچھوے سے اجازت مانگی کچھوے نے درخواست کی کہ مجھے بھی لے چلو

شیخ مستان (آکولہ)

کچھوے کی درخواست کے متعلق لکھتا ہے :۔

مرغابیوں نے اس عجیب درخواست کو منظور کرنے سے عذر کیا کہ ہم زمین پر چل نہیں سکتے اور تو ہوا میں اُڑ نہیں سکتا پھر ہمارا تیرا ساتھ ہو تو کیوں کر ہو

نام ندارد

دوستی کی وجہ روزانہ کی ملاقات تبلائی ہے ایک جگہ لکھتا ہے :۔

ہر روز کی ملاقات سے کچھوے اور مرغابیوں میں بہت گہری دوستی ہوگی۔ وہ مرغابیوں کا معمول تھا کہ ہر روز پانی پینے کی غرض سے چشمہ پر آتیں اور اپنے پیارے محب سے ملاقات کر کے چلی جاتیں

ارجمند بیگم (جودھ پور) کچھوے کو اُڑا لے جانا آسان کام نہ تھا اس لئے دونوں مرغابیوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ لکھتی ہیں :۔

چنانچہ اسکی منت سماجت سے مرغابیوں نے آپس میں مشورہ کیا۔

راستے کے مناظر کے سلسلہ میں ایک جگہ لکھتی ہیں

پہاڑی حصہ ختم کر چکنے بعد سبزہ زاروں اور جنگلوں میں ہوتی ہوئی کسی بستی کے قریب پہنچیں۔

عبدالناصر (جامعہ۔ دہلی) کہانی ایک خاص خیال کے ماتحت لکھی ہے شروع سے آخر تک کہانی کے سلسلہ کا خیال رکھتے ہوئے خوب نبھایا ہے۔ بطخیں نقل مکان کرنا چاہتی مگر پچھلے تجربے سے فائدہ اُٹھا کر ایک جگہ لکھتا ہے۔

ایک روز دونوں بطخیں آپس میں باتیں کرنے لگیں ایک بولی کہ یہاں سے دو تین میل کے فاصلہ پر دوسرا تالاب ہے اُس میں سے تالاب کا مالک کسی کو مچھلیاں اور بطخیں پکڑنے نہیں دیتا اور اُس کا پانی گرمیوں میں سوکھتا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ہم وہاں جا کر رہیں۔

اپنی غرض نکالنے اور دکھڑا سنانے کے لئے بجائے درخواست کرنے کے جو رویہ کچھوے نے اختیار کیا تھا اس کے متعلق کیا خوب لکھتا ہے

جب بطخیں چپ ہوگئیں تو وہ رونے لگا۔ بطخوں نے پوچھا میاں کچھوے کیوں روتے ہو۔ کچھوا بولا تم یہاں سے چلی جاؤ گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

چارلی (مین پوری)

دوستی کے متعلق لکھتا ہے :۔

اور یہ دوستی اتنی بڑھی کہ بطخوں نے اپنے آشیانے کو تیاگ دیا اور صبح سے لیکر دوسری صبح تک وہیں پڑے رہنے لگے۔

آدمی کی کہانی
ایک ستارہ کی زبانی

"چلو بھائی چلو، نانی اماں چرخے پر بیٹھ گئی ہیں، چلو، جلدی چلو، کہانی شروع ہوتی ہے" ایک ننھے سے تارے نے مہین سی آواز سے ادھر اُدھر چلانا شروع کیا اور سب تارے جلدی جلدی اپنے اپنے گھروں میں سے نکل کر نانی اماں کی طرف دوڑنے لگے۔ تھوڑی دیر میں سب اکٹھا ہو گئے اور نانی اماں پر کہانی کا تقاضا شروع ہو گیا۔ نانی اماں نے کہا "اچھا، اچھا، ذرا میری پونیاں سر دیا گئی ہیں، تھوڑا سا تار ٹھیک نکل لے تو کہانی کہتی ہوں" سب تارے سنبھل سنبھل کے بیٹھے، چہروں سے بے صبری ٹپکتی تھی، جھک جھک کر تاگے کو دیکھتے تھے کہ ٹھیک نکلا کہ نہیں، دو ایک تارے مارے بے چینی کے کھڑے ہو ہو جاتے کہ نانی اماں نے کہا "ہاں اب تار ٹھیک آنے لگا، لو اب کہانی سنو"

"تو نانی اماں، آج کہانی کہاں سے ہوگی؟" ایک تارے نے پوچھا، کئی اور ساتھ ساتھ بولے "ہاں، کہاں سے؟" نانی اماں نے جواب دیا "بیٹا وہ دیکھو، وہ نیچے اُدھر جو نیلی سی ایک لکیر سی دکھتی ہے نا، وہ نیل دریا ہے۔ میں تم سے پہلے کہہ چکی ہوں کہ یہ آدمی پانی کے پاس رہنا بہت پسند کرتا تھا۔ یہ بیچارہ کھانے کی تلاش میں ہمیشہ مارا مارا پھرتا اور پانی کے کنارے کھانا ملنے میں آسانی ہوتی۔ پانی کے پاس کھیتی باڑی سہل ہوتی ہے اور کھانے کی چیزیں آسانی سے پیدا ہو جاتی ہیں اس لئے نیل دریا کے کناروں پر بہت سے آدمی بستے تھے۔ ذرا دھیان سے نظر کرو تو تم دیکھ سکتے ہو کہ اس دریا کے دونوں طرف ریگستان ہی ریگستان ہے" نانی اماں یہ کہہ بھی نہ پائی تھیں کہ ایک تارے نے سوال کیا "تو کیا ریگستان میں بھی کھیتی باڑی سہل ہوتی ہے؟ وہاں تو ساری کھیتی سوکھ کر جل جاتی ہوگی!" نانی اماں نے کہا "بیٹا، میں بتاتی ہوں بتاتی ہوں۔ جلدی مت کرو۔ اس دریا میں ہر سال ایلا آتا ہے اور کناروں پر دور دور تک پانی بہہ نکلتا ہے۔ گرمی کے موسم میں اس دریا کی ساری وادی ایک اتھلی سی جھیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ پھر جب پانی اتر جاتا ہے تو اس ساری وادی میں کئی کئی انگل اچھی باریک دریائی مٹی جم جاتی ہے اور اس میں جب کھیتی ہوتی ہے تو زمین یوں سمجھو کہ رزق اگلتی ہے اگلتی! اس لئے آدمی یہاں آ کر بسے۔ اور یہاں بڑی بڑی ترقیاں کیں۔

پہلے آدمی کو چوبیس میں سولہا گھنٹے پیٹ پالنے کے لئے مشقت کرنی پڑتی تھی، یہاں کم کام سے کام نکلنے لگا اور آدمی کو کچھ تھوڑی بہت فرصت رہنے لگی۔ اس فرصت میں اس نے نئی نئی، آنکھوں کو بھلی لگنے والی چیزیں بنائیں۔ اور نہ جانے کن کن چیزوں پر سوچ بچار شروع کر دیا۔ یہ لگا فرصت میں پوچھنے کہ یہ ستارے کہاں سے آئے؟ بجلی کی کڑک اصل میں کس کی آواز ہے؟ نیل میں ٹھیک اسی وقت پر ایلا کون لاتا ہے، کون پھر پانی کو اتارتا ہے؟ یہ لگا سر دھننے کہ میں خود کون ہوں اور یہاں کیوں آیا ہوں، میرے چاروں طرف بیماری ہے،

تکلیف اور موت پھر بھی میں ہنستا بولتا اور جب تک بن پڑتا ہے مزے کرتا ہوں"۔
اس کے ان سوالوں کا جواب ان کے سب سے ہوشیار اور عقل والے لوگوں نے دیا۔ انھوں نے اس کا دھیان اس دنیا سے ہٹا کر آنے والی دنیا پر جما دیا۔ یہ دنیا انھیں آنے والی دنیا کی تیاری دکھائی دینے لگی جہاں جاکر اپنے سب اچھے برے کاموں کا حساب دینا ہوگا۔
یہ دل سے سورج کے دیوتا را کو ماننے لگے جو سب چیزوں کا خالق ہے، اوسیرس کے سامنے سر جھکانے لگے جو ان کے نزدیک نیل کا دیوتا تھا اور موت کے بعد آدمیوں کے کاموں کی جانچ کرنے والا۔ اس کی ایک بیوی آئی سس کو بھی یہ مانتے اور ایک بیٹے ہورس کو بھی۔ ساری برائیوں کا سرچشمہ ان کے نزدیک دیوتا ست تھا۔ غرض ان کے پجاریوں نے آدمی کی حیرت اور تلاش کے جواب طرح طرح سے دئے اور اس کے دل میں آنے والی دنیا کی لگن لگا دی۔

اس آنے والی دنیا کے انتظار میں ان کا ایک خیال بھی نہ جانے کیسے پختہ ہو گیا کہ اس دنیا میں داخلہ اس وقت تک نہ ہوگا جب تک آدمی کا جسم صحیح سلامت نہ ہو۔ اور جسم مرنے کے بعد سڑ گل کر برابر ہو جاتا تھا۔ میں تمھیں ان کی بیتابی کا حال کیا بتاؤں، جب یہ اپنے عزیزوں پیاروں کے بدن کو سڑ کر خاک میں ملتے دیکھتے اور سمجھتے کہ بس اب یہ اس نئی دنیا میں نہ جا سکیں گے۔ ان کی یہاں کی ساری زندگی اکارت گئی اور اب ہم سے پھر کیسے میل ہوگا۔ آخر اس نے اپنے مردوں کے بدن برقرار رکھنے کی تدبیر نکال ہی لی۔ یہ لوگ مردہ کی لاش کو پہلے نا ترون میں بھگو دیتے اور پھر اس میں مومیائی بھر کر نہ جانے کتنے کپڑے میں جو خاص طور پر بنتا تھا لپیٹ لپاٹ کر رکھ دیتے اور اس کے ارد گرد اس کی ساری محبوب چیزیں جمع کر دیتے۔ طرح طرح کے ساز و سامان، گہنا زیور، باجے، رنگ رنگ کے کپڑے، بھانت بھانت کی مٹھائیاں، مٹی کے بنے ہوئے نوکر چاکر، غرض نئی دنیا کا سفر شروع ہونے تک جو انتظار کا وقت ہے اس کے لئے دنیا کا سا سارا سامان کر دیتے تھے! اور یہ قبریں کیا ہوتیں اچھے خاصے عجائب گھر ہوتے تھے"۔

ممی کی تصویر

ایک تارا بولا "نانی، تو یہ قبریں تو بڑی بڑی ہوتی ہوں گی؟"
نانی نے جواب دیا: "بیٹا، پہلے تو کچھ ایسی بڑی نہ ہوتیں۔ لاکھ کرو پھر بھی شروع شروع میں ان آدمیوں کے پاس بھی کچھ ایسا بہت سا ساز و سامان نہ ہوتا تھا۔ پہلے یہ پہاڑوں کی چٹانوں میں چھوٹے چھوٹے کھود کھود لیتے اور اس میں اپنے مردوں اور اُن کے سامان کو بند کر دیتے تھے پھر جب ریگستان میں مقبرے بنانے پڑے تو اچھا خاصہ گھر سا بنانا ہوتا۔ ساز و سامان کی وجہ سے چور چھپکر ان قبروں کو کھول کر سب نکال لے جاتے۔ تم جانو اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان لوگوں نے قبروں پر پتھر کے ڈھیر سے بنانے شروع کئے۔ امیروں نے غریبوں سے اونچے مقبرے بنائے غرض ساری وادی میں مقبرے ہی مقبرے ہو گئے جنھیں آدمی اپنی زبان میں "اہرام" کہتے ہیں۔ ان میں بعض تو سچ مچ بہت بڑے ہیں، بادشاہ خوفو کا مقبرہ جو کوئی تین ہزار برس ہوئے بنا تھا، ۱۳ ایکڑ زمین میں پھیلا ہوا تھا اور کوئی بیس برس تک کچھ نہیں، کچھ نہیں تو ایک لاکھ آدمیوں نے اس پر کام کیا ہوگا۔ آدمی آج تک حیرت کرتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگ اتنے پتھر دریا پار کیسے لائے، ریگستان میلوں انھیں کیسے لے گئے اور انھیں کاٹ چھانٹ کر کس طرح جمایا کہ آج تین ہزار برس

گذرے پیچھے بھی وہ تنگ راستہ جو اندر اصلی قبر تک جاتا ہے، اس کروڑوں من پتھر کے نیچے جیسا کا تیسا ہے۔
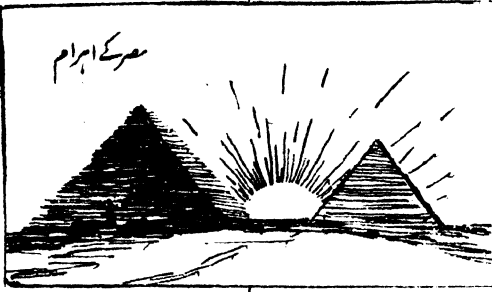
ایک تارا بولا "اماں، آپ نے تو کہا تھا کہ آدمی نے یہاں بڑی بڑی ترقیاں کیں، ہم وہ سننا چاہتے تھے آپ نے یہ قبروں کا ذکر چھیڑ دیا۔ مجھے رات کو مردوں کا حال سن کے ڈر لگتا ہے۔ اماں وہ ترقی والی بات پوری کیجئے"

مصر کے اہرام

"اچھا، اچھا، بیٹا وہ بھی کہتی ہوں۔ تم جانو کہانی میں تو یونہی بات میں بات نکل آتی ہے۔ ہاں تو اس وادی میں جسے آج کل مصر کا ملک کہتے ہیں، آدمی نے بڑی ترقی کی۔ سب سے پہلے تو انھوں نے اپنی کھیتی باڑی میں بڑی ترقی کی۔

دریائے نیل کا فیض تو تھا ہی پر آدمی نے اس کے فائدے کو اور بھی بڑھایا۔ اچھی اچھی نہریں بنائیں اور پانی کو نیچے سے اوپر اٹھانے کی انوکھی تدبیروں سے نیل کے پانی کو نہ جانے کہاں کہاں پہنچا دیا۔ انھوں نے گھڑی بھی بنائی اور جنتری بھی، مکان بنانے میں بھی انھوں نے بڑی ترقی کی۔ بھلا تم خود سمجھو جو آدمی اپنے مردوں کے لئے ایسے عجیب عجیب گھر بناتے ہوں گے وہ زندوں کے لئے بھی تو مکان اچھے خاصے ضرور بناتے ہوں گے۔ پھر انھوں نے اپنے دیوتاؤں کے لئے مندر بھی بڑے عجیب عجیب بنائے جن کی نقل بعد کو بہتیری قوموں نے کی۔ کرنک کا جو مندر ہے اس کے کھنڈروں کو دیکھ دیکھ کر آدمی کی اولاد اب تک دنگ رہ جاتی ہے۔

ان لوگوں کو مکان بنانے اور پتھر تراشنے کے کام میں اس سے بھی بڑی مدد ملی کہ انھوں نے دھاتوں کا استعمال خوب اچھی طرح معلوم کر لیا تھا۔ اس سے انھوں نے پتھر کے بت بھی خوب خوب تراشے جن سے یہ مقبروں کو زینت دیتے تھے، انہی مردوں کی میموں کو لئے صندوق بھی کیسے کیسے بنائے اور بڑے بڑے پتھروں پر اپنے بادشاہوں کے کارنامے لکھ لکھ کر یادگار چھوڑ گئے۔"

ایک تارے نے بات کاٹ کر کہا: "تو اماں، کیا یہ لوگ ان دنوں میں بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے؟" "تیری عمر بڑی ہو بیٹا، خوب یاد دلایا، یوں تو بھولے ہی جاتی تھی۔ ان لوگوں کی سب سے بڑی ترقی تو یہی تھی کہ یہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، بیٹا لکھنے کی ایجاد آدمی کے لئے بہت بڑی بات ہے۔ اس سے یہ اپنے تجربے اپنی اولاد کے لئے جمع کر کے چھوڑ سکتا ہے، نہیں تو اور جانوروں کی طرح ہر ایک کو پھر سرے سے زندگی میں تجربے کرنا پڑتے اور جہاں تک باپ پہنچا تھا وہیں تک مر گر کر بیٹا پہنچتا اور ختم ہو جاتا، اب بیٹا وہاں سے شروع کرتا ہے جہاں سے باپ چھوڑتا ہے۔ ہاں تو لکھنے کا ان مصریوں میں بڑا چرچا تھا۔ ان کے پجاری سب لکھا پڑھا کرتے تھے۔ ان کے لکھنے کا انداز بھی نرالا تھا جسے آج تک پجاریوں کی لکھن کہتے ہیں" "نانی اماں، وہ کیسا تھا۔ یہ کیسے لکھتے تھے، ذرا ہمیں بھی تو بتائیے" تو
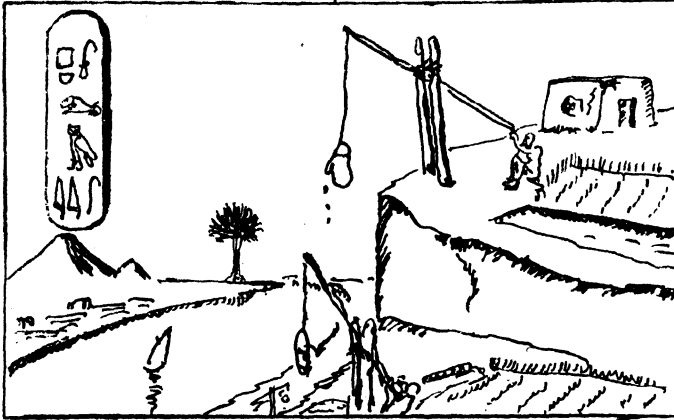
نانی اماں نے کہا: "بیٹا، اب تو دیر ہو گئی ہے۔ یہ کل بتاؤں گی"

فاطمہ اور رحیم الدین

(گذشتہ سے پیوستہ)

جب باپ نے اس طرح لڑائی کا قصہ یاد دلایا تو فاطمہ کے چہرہ پر متانت آگئی اور اس نے کہا۔

"بُرا کیسے نہ لگتا، میں تو ان کے ساتھ ایسا اچھا سلوک کرتی تھی، ان کے کمرہ کو روزانہ صاف کراتی تھی، اپنی رضائی کی روئی نکال کر ان کی کرسیوں کے لئے گدّے بنوائے، اپنے سب سے اچھے ریشم کے گولے سے ان کی میز کی چادر پر بیل بوٹے بنائے، اور ان کو ایک تصویر والی کتاب انعام میں ملی تو انہوں نے مجھے دکھایا تک نہیں۔ اور پھر ان کو معلوم نہیں گھمنڈ کس بات کا تھا۔ مجھ کو یہ باتیں بُری لگتی ہیں"۔

رحیم الدین تو جیسا ہم بتا چکے ہیں سمجھتا تھا کہ ماں نے اس کی تعلیم کی تعریفیں سُن کر اس کے کمرہ کو سجایا ہے۔ اور اسے یہ باتیں سُن کر بہت تعجب ہوا۔ پھر باپ نے بھی اس طرح فاطمہ کی ہاں میں ہاں ملائی کہ اسے کچھ کہنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔

"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو" فاطمہ سے باپ نے مخاطب ہو کر کہا "تم نے واقعی رحیم الدین پر احسان کیا تھا، اور رحیم الدین نے اپنا حق ادا نہیں کیا لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی وقت تمہاری غلطی ہو، اور رحیم الدین کو یہ کہنے کا یہ موقعہ ملے کہ تم نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس لئے میں تم دونوں کو کچھ سمجھانا چاہتا ہوں۔ اگر تم غور سے سننے کا وعدہ کرو تو سمجھاؤں"۔

"جی ہاں، ہم خوب غور سے سنیں گے"، فاطمہ اور رحیم الدین ایک ساتھ بول اُٹھے، فاطمہ بڑے جوش سے، رحیم الدین کچھ دھیمی آواز میں۔

"بات اصل میں بہت سیدھی سادی اور آسان ہے۔ اسے بچے بھی سمجھ سکتے ہیں، لیکن اسے یاد رکھنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے تم دونوں یہ بھی وعدہ کرو کہ تم اپنی روزمرہ زندگی میں اسکا خیال رکھو گے"۔

پھر بھائی بہن نے کہا "جی ہاں، ہم خیال رکھیں گے"۔

"اچھا تو سنو۔ تم دونوں بچے ہو، لیکن تم بھی یہ جانتے ہو کہ آدمی مل جل کر ساتھ رہتے ہیں، چاہے شہر میں رہیں، چاہے گاؤں میں، اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سوا وہ اور کسی طرح زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ تم کو یاد ہوگا ہمارے پڑوس میں ایک فقیر رہتا تھا جو کبھی کبھی چوری بھی کر لیتا تھا۔ اس کی چوریاں پکڑی گئیں، محلے والوں نے اس کو اپنے یہاں سے مار پیٹ کر نکال دیا، اور یہاں سے وہ جس محلے میں گیا لوگوں نے اس کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ لیکن پھر بھی اس سے شہر نہ چھوڑا گیا اور وہ دو برس ہوئے یہیں مرا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسے انسان دانہ پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ویسے ہی وہ صحبت کے بغیر بھی زندگی نہیں بسر کرتا۔ یہ ایک ضرورت ہے جو اسے ہر حالت میں محسوس ہوتی ہے اس لئے اب سوال یہی رہ جاتا ہے کہ ہم ایک ساتھ رہیں تو کس طرح سے

رہیں، ہے نہ؟

فاطمہ نے کچھ دیر سوچ کر کہا: "جی ہاں"

"اچھا" باپ نے کہا: "اب پھر یہ دیکھو کہ آدمی کو اور کس کس چیز کی حاجت ہوتی ہے۔ فاطمہ، تم اب دس برس کی ہو، تمہیں یاد ہے کہ پانچ برس پہلے تم کتنی چھوٹی تھیں، اور اس سے پہلے تو تمہارا یہ حال تھا کہ اپنے ہاتھ سے کھا پی نہیں سکتی تھی، اور اس سے کچھ پہلے تم سے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا تھا۔ تو گویا تم دس برس میں اس لائق ہوئی ہو کہ خوب چل پھر سکو، ماں بتاتی جائیں تو کھانا پکا لو، مولوی صاحب مدد کرتے رہیں تو کچھ پڑھ ڈالو۔ لیکن اب بھی، اگر میں دفتر سے کسی دن نہ آؤں اور تمہاری ماں خالہ کے یہاں چلی جائیں اور رات کو دیر تک نہ آئیں تو تم کو کھانے کا سامان کرنے میں بڑی دشواری ہوگی۔ اس لئے تم سوچو کہ اگر تمہاری ماں نہ ہوتیں اور میں بھی نہ ہوتا تو تمہارے لئے کیسی مصیبت ہوتی۔ جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو تمہیں کسی کی مدد کی حاجت نہ رہے گی، اور ماں کے بغیر بھی تم گھر کا کام سنبھال لو گی اور ضرورت ہوئی تو بیس آدمیوں کی اور دیکھ بھال کر لو گی، مگر جب تک تم چھوٹی ہو تم سے یہ نہیں ہو سکتا۔ زندگی ایک فن ہے جو سیکھے بغیر کسی کو نہیں آتا، اور جب تک یہ فن نہ آجائے، آدمی کی حالت جانوروں سے بھی بدتر ہوتی ہے اس زمانے میں ہم لوگ بہت اچھی طرح سے رہتے ہیں، لیکن ہم جانوروں کی طرح رہتے تھے۔ تب بھی اس انداز سے کہ ماں باپ اور بچے ساتھ رہیں۔"

"جی ہاں، ابا جان" رحیم الدین بیچ میں بول اُٹھا، "میں نے کتاب میں پڑھا ہے۔ پرندے اور چوپائے بھی اسی طرح سے رہتے ہیں، ماں باپ اور بچے"

"ہاں، مگر پرندے اور چوپائے بہت جلدی بڑھ جاتے ہیں اور آدمی کو سیانا ہوتے ہوتے کئی برس گزر جاتے ہیں۔ پرندا پنے گھونسلے بناتے ہیں، چار پانچ مہینے میں بچے بڑے ہو گئے تو سب اُڑ کر چلے جاتے ہیں، اور گھونسلے کی فکر نہیں کرتے۔ مگر آدمی تو یہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کو مضبوط بنے ہوئے گھر کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیڑوں کی، پرندوں اور جانوروں کی طرح وہ یہ تو کر نہیں سکتا کہ جب بھوک لگے تو ذرا سا دانہ چگ آئے، اسے روٹی کی لئے محنت کرنی پڑتی ہے، اور جب وہ اطمینان سے ایک جگہ نہ رہے تو وہ محنت نہیں کر سکتا۔ کسان کو گھر کی ضرورت ہوتی ہے وہ کھیت اور بیلوں کی جب یہ سب چیزیں ہوں تبھی وہ کھیتی کر سکتا ہے۔ تو آدمی کی زندگی کے لئے ماں باپ اور بچوں کا ساتھ رہنا ضروری ہے اور ایک گھر اور پیٹ پالنے کے ذریعہ تو بہت ہوتے ہیں، انہیں ہم پیشے کہتے ہیں، لیکن ماں باپ بچے اور گھر کا جو قاعدہ ہے وہ سب کے لئے ایک ہے۔ اچھا بتاؤ، ماں باپ اور بچوں کے لئے ایک لفظ کیا ہے؟"

رحیم الدین کو اپنی قابلیت دکھانے کا موقع ملا تھا وہ بھلا کیسے چپ رہ سکتا تھا، وہ جھٹ سے بول اُٹھا "خاندان"۔

"ہاں" باپ نے کہا اور اس میں گھر کو شامل کر لو تو وہ گھر بار ہو جائے گا۔ اچھا، تو آج ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ آدمی کی زندگی خاندان سے شروع ہوتی ہے۔ اب کل تم کو بتائیں گے کہ بستی کیا چیز ہوتی ہے۔"

دوسرے دن باپ کے کہنے سے پہلے ہی فاطمہ اور رحیم الدین اس کے پاس آکر بیٹھ گئے، اور فاطمہ نے کہا،

"ابا جان! آپ نے کہا تھا ہم کو بتائیں گے کہ بستی کیسے بنتی ہے، اب بتائیے۔"

باپ بہن بھائی کا یہ شوق دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے دونوں کو گود میں بٹھایا اور باتیں شروع کر دیں۔

لالچ

(افسانہ)

شام کا سہانا وقت ہے۔ آفتاب غروب ہونے کو ہے۔ پرندے درختوں پر بیٹھے ہوئے چہچہا رہے ہیں۔ مسافر اندھیرا ہونے کی وجہ سے قدم بڑھائے جا رہے ہیں۔ وہ سائل جو در در صدائیں لگا رہے تھے انہوں نے بھی اپنے مکان کا راستہ لیا۔

ایک آدمی جو بظاہر فقیر معلوم ہوتا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے زیب تن کئے ہوئے بسرعت تمام قدم بڑھائے۔ چلا جا رہا ہے جس کے کاندھے پر کچھ تھیلیاں بھی ہیں اسی اثنا میں ناگہاں ایک مسافر کے ساتھ اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ جن میں باہم حسب ذیل گفتگو ہوئی:۔

"تمہارا کیا نام ہے؟ اور کہاں جا رہے ہو؟"

میرا نام پوچھ کر کیا کرے گا؟ میں ایک ستم رسیدہ فقیر ہوں در در صدائیں لگاتا ہوں لوگ کچھ دے دیتے ہیں، یہی میرا نام ہے۔ اور جہاں رات ہو جاتی ہے وہیں میرا مکان ہے۔"

"ہمارے ساتھ چلو تو دولت کی کنجی عطا کر دیں۔"

پہلے تو فقیر کو سخت تعجب ہوا کہ اگر خود ان حضرت کو دولت کی کنجی میسر ہوتی تو گھر بیٹھے حکومت نہیں کرتے۔ ننگے سر، ننگے پیر، ادھر اُدھر ٹھوکریں کیوں کھاتے؟ لیکن کچھ سوچ کر اور کچھ اس کے اصرار سے بادل ناخواستہ اس کے ہمراہ چلنے پر تیار ہو گیا۔

یہ دونوں چلتے رہے۔ کچھ دور آگے چل کر ایک پہاڑی ملی۔ جس پر یہ دونوں چڑھ گئے۔ اور ایک جگہ جا کر رک گئے۔

رات زیادہ گزر چکی ہے۔ زمین پر اچھی خاصی چاندنی پھیلی ہوئی ہے جس کی روشنی میں راہ گیر بے کھٹکے چل سکتا ہے۔ نزدیک اور دور کی ہر چیز بہ آسانی نظر آتی ہے۔ آسمان بالکل صاف ہے۔ نہ بادل ہے نہ گرد و غبار۔ نہ ہوا کے تیز تیز جھونکے۔ نہ جانوروں کا شور و غوغا۔ بس ایک ہو کا عالم ہے، جو ہر چہار طرف پھیلا ہوا ہے۔

ذرا ادھر اُدھر دیکھو لکڑیاں ہوں گی جن کو جمع کر کے لیتے آؤ۔

فقیر نے فوراً حکم کی تعمیل کی جب کافی لکڑیاں جمع ہو گئیں تو مسافر نے ان کو ایک جگہ رکھا اور ان کو دیا سلائی سے جلا دیا جب لکڑی خوب زوروں سے جلنے لگی تو مسافر نے کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکنا شروع کیا تھوڑی دیر میں وہاں سے ایک پتھر ہٹا اور راستہ صاف ہو گیا یہ لوگ تھوڑی دور چلتے رہے۔ بلا کی تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا چند ہی قدم کے چلنے کے بعد انھیں صاف ستھری سیڑھیاں ملیں۔ فقیر یہ تماشا دیکھ کر محو حیرت تھا لیکن مسافر کے ساتھ ساتھ نیچے اُترتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ ایک شاندار عمارت کے برآمدے میں تھے۔ اس عمارت کی نظر فریبیاں بے حد حیرت انگیز اور قابل دید تھیں۔ لیکن ساری فضا خاموش تھی اور ہر طرف سناٹا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر فقیر کی ہمت شکست ہوئی جاتی تھی۔ لیکن

تھا۔ قہر درویش برجان درویش۔ کشاں کشاں مسافر کے ساتھ چلتا رہا۔ تھوڑی دور پر ایک صندوق ملا۔ مسافر نے اس میں سے کنجی نکالی اور کنجی کو لے کر آگے بڑھا۔ سامنے ایک بند کمرہ ملا۔ مسافر دروازہ کھول کر مع فقیر کے اندر داخل ہوا۔ اندر ایک بت کی طرح پتھر رکھا ہوا تھا۔ دونوں نے مل کر بڑی محنت سے اس پتھر کو توڑا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا صندوق ملا۔ اس کو کھولا تو اس کے اندر ایک اور چھوٹا صندوق ملا۔ اسی طرح صندوق کھولتے گئے۔ اخیر میں ان کو بڑی ڈبیہ ملی۔ ڈبیہ کے اندر سرمہ تھا جس کو لے کر یہ دونوں کمرہ کے باہر آئے۔

(ڈبیہ دکھلاتے ہوئے) دیکھو۔ یہ سعادت کی کنجی اور دولت کثیر کی متکفل ہے۔

(حیرت و استعجاب سے) یہ کیسے؟

اس ڈبیہ کے سرمہ کا خاصہ یہ ہے کہ جس شخص کی آنکھ میں لگا دیا جائے اس کو زمین کے مدفون خزانے نظر آنے لگتے ہیں۔ مگر اس کی شرط یہ ہے کہ ایک ہی آنکھ میں لگایا جائے۔ اگر دونوں میں لگا دیا جائے تو بجائے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ کیونکہ دونوں آنکھوں کی روشنی زائل ہو جائیگی"

یہ سُن کر فقیر کا دل امیدوں سے معمور ہو گیا۔ رات آچکی تھی اس لئے فقیر اور مسافر دونوں بستر پر دراز ہو گئے۔ لیکن صبح سعادت کے انتظار میں فقیر نے رات نہایت بے صبری کے ساتھ بسر کی۔ صبح ہوتے ہی مسافر نے فقیر کو کچھ روپیہ دے بازار روانہ کر دیا۔ تاکہ وہاں سے مال و دولت کا خزانہ لاد کر لے جانے کے لئے چالیس اونٹ خرید لائے۔ فقیر برق کی رفتار گیا اور نظر کی صورت چالیس اونٹ کے ساتھ حاضر ہو گیا۔

مسافر نے فقیر کی آنکھ میں سرمہ لگا دیا جس کے ساتھ ہی اس کے آنکھ کے پردے کھل گئے۔ اور زمین کے سارے مدفون خزانے اسکی نظروں کے سامنے تھے۔ یہ دیکھ کر فقیر کا دل باغ باغ ہو گیا۔ سمجھا اب مصیبت کا خاتمہ ہوا اور بادشاہی ملی۔ خوشی خوشی ان مخفی خزانوں کو کھودا اور جہاں تک ہو سکا اونٹوں پر بار کر کے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں رائے قرار پائی۔ کہ ان کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ چنانچہ ہر ایک کو حصہ رسدی ملا جسے لے کر دونوں دو طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن فقیر کی حرص اتنے ہی پر قانع نہ تھی۔ تھوڑی دور جا کر فقیر مسافر کے پاس واپس گیا۔

بھائی۔ دس اونٹ مجھے اور دیدو تم کیا کرو گے؟ میری ضروریات کا تو تمہیں علم ہی ہے۔ ہر ایک چیز کا از سرِ نو انتظام کرنا ہے" مسافر نے اسے بھی دیدیا۔ فقیر اسے لیکر کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ اسے پھر لالچ دامن گیر ہوا۔ شرم و حیا کو رخصت کر کے پھر مسافر سے اونٹ مانگنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے اس نے تمام اونٹ مانگ لئے۔ مسافر رحم و کرم کا پتلا، جود و سخا کا مجسمہ تھا اس نے اپنے لئے صرف قناعت کی دولت باقی رکھی اور سب کچھ فقیر کو دے دیا لیکن فقیر اس کے تمام اونٹ اور مال و زر لینے کے بعد بھی قانع نہ رہا اس نے خیال کیا کہ شاید مسافر نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ ایک آنکھ میں سرمہ لگانے سے اگر اتنے خزانے نظر آتے ہیں تو ضرور ہے کہ دونوں آنکھوں میں لگانے سے اس سے دوگنے نظر آئیں گے۔ اس نے یہ خیال کیا کہ مسافر نے یہ چال محض اس کو دھوکہ دینے کے لئے اختیار کی ہے۔ تاکہ وہ تنہا جا کر تمام خزانے لاد لائے۔ ورنہ وہ کیا تمام مال دیدیتا آخر کار شبہ یقین سے بدل گیا۔ اور پھر مسافر کا قصد کیا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس سے ملاقات ہوئی۔

"بھئی ذرا دوسری آنکھ میں بھی سرمہ لگا دو"

"تمہیں کیا سودا سمایا ہے؟ ارے اس سے بینائی جاتی رہیگی"

مسافر نے ہر چند انکار کیا لیکن وہ جوں جوں انکار کرتا، فقیر کا شبہ اور بڑھتا رہا۔ بالآخر مسافر نے مجبور ہو کر اسکی دوسری آنکھ میں بھی سرمہ لگا دیا

مراکش

مراکش (صحیح مَراکُش) یا مراکو (انگریزی تلفظ) شمالی افریقہ کا ایک نیم آزاد اسلامی ملک ہے جس کو عرب جغرافیہ نویس مغرب اقصیٰ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ مراکش دراصل مشہور شہر ہے جسے سلطان المرابطین یوسف بن تاشفین نے ۴۵۴ھ میں تعمیر کیا اور بجائے فاس (قدیم ادریسی دار السلطنت) کے اپنا مرکز حکومت بنایا۔ اس کے شمال میں بحر متوسط، مشرق میں الجزائر، جنوب میں صحرائے اعظم اور مغرب میں بحر ظلمات واقع ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کا کل رقبہ ۳۰۰۰۰۰ مربع میل ہے۔ شمالی حصہ جو الریف[1] کہلاتا ہے، اسپین کے ماتحت ہے۔ الریف ایک نہایت ہی زرخیز اور شاداب ساحلی میدان ہے جس کی آزادی کے لئے ابھی چند سال ہوئے اسلام کے بطل جلیل غازی عبدالکریم اور ان کی جماعت نے دو برس تک اسپین اور فرانس سے جنگ کی تھی۔ غازی موصوف اگرچہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوسکے لیکن اب انقلاب اسپین کی بدولت جدید جمہوری حکومت میں الریف کو تقریباً ایک آزاد علاقے کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ باقی ملک فرانس کے زیر سیادت ہے۔

مراکش کا زیادہ تر حصہ پہاڑی ہے۔ کوہ اطلس کی شاخیں تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہیں اس سلسلۂ کوہ کی انتہائی بلندی ۱۴۰۰۰ فیٹ ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی اکثر چوٹیاں سال بھر برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ مراکش کی تمام ندیاں اطلس ہی کی مختلف شاخوں سے نکل کر بحر ظلمات یا بحر متوسط میں جا گرتی ہیں۔ اس لئے کہ سلسلۂ اطلس سواحل مراکش سے نہایت قریب واقع ہوا ہے لہٰذا ان سب ندیوں کا طول اور حجم اس قدر کم ہے کہ ان کو دریا کہنا مشکل ہے باایں ہمہ ان سے ملک کا اکثر حصہ سیراب ہوتا رہتا ہے۔

یہاں کی آب و ہوا گرم مگر صحت بخش ہے۔ بارش اپریل سے ستمبر تک ہوتی ہے۔ زیادہ تر مغربی ساحل پر جنوب مغربی ہواؤں کی بدولت اور کبھی کبھی شمال میں جہاں "مشرقی" ہوائیں اس کا سبب بنتی ہیں۔ اندرونی شہروں کا درجہ حرارت گرمیوں میں بہت بڑھ جاتا ہے۔ البتہ کوہ اطلس پر جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے سال بھر برف باری ہوتی رہتی ہے۔

(۱) ریف کے معنی زرخیز اور شاداب ساحلی علاقے کے ہیں۔

مراکش میں جنگل بالکل نہیں ہیں لہذا جانوروں کی بھی کمی ہے۔ البتہ شیر کہیں کہیں ضرور مل جاتا ہے۔ عام جنگلی جانوروں میں دھاری دار چیتا، گلدار، بجو، گیدڑ، جنگلی سور، لومڑی، ساہی، غزال اور بارہ سنگھا کی کثرت ہے۔ اطلس کے دشوار گزار حصوں میں جنگلی بھیڑیں پائی جاتی ہیں۔ خرگوش اور چوہے (جو اکثر نہایت تکلیف کا موجب ہوتے ہیں) بہت ہیں۔ جنوب میں ایک خاص قسم کی گلہری ہوتی ہے جسے اہل مراکش "سبب" کہتے ہیں۔ پرندے تقریباً ہر قسم کے پائے جاتے ہیں۔ علاقہ "السویرہ" میں ایک نہایت خوبصورت چڑیا ہوتی ہے جو اس نواح میں طبیب کے نام سے مشہور ہے۔ مچھر بہت کم ہیں۔ سانپ بھی شاذ ہی ملتا ہے۔ ٹڈیاں کبھی کبھی دل کے دل آتی ہیں۔ سواحل بحر میں طرح طرح کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں کے باشندے شکار کے بہت شوقین ہوتے ہیں اور کثرت سے شکاری کتے اور باز وغیرہ پالتے ہیں۔

بار برداری کا سب سے بڑا ذریعہ ٹٹو ہے۔ اونٹ، گدھا، گھوڑا اور خچر بھی عام ہیں، لیکن گھوڑے اب ویسے عمدہ نہیں ہوتے جیسے کسی زمانے میں ہوتے تھے۔ جبل موسیٰ میں بندروں کی بہت کثرت ہے۔ جہاں تک پیداوار کا تعلق ہے مراکش میں معمولی فرق کے ساتھ ان تمام غلوں اور پھلوں کی کاشت ہوتی ہے جو ایران و افغانستان سے لے کر بحر متوسط کے ارد گرد کے ممالک میں ہر جگہ پیدا ہوتے ہیں۔ کھانے میں زیادہ تر جو استعمال کیا جاتا ہے لیکن گیہوں، مکی، باجرہ وغیرہ کی بھی کاشت ہوتی ہے۔ سبزیوں میں آلو، ٹماٹر، گوبھی، شلجم، لہسن، پیاز اور گاجر خوب پیدا ہوتی ہیں۔ چائے اور سالے کی غرض سے طرح طرح کی شیریں بوٹیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ پھلوں میں انگور نہایت کثرت سے پیدا کیا جاتا ہے۔ خوبانی، شفتالو، تربوز، سردا، شہتوت، اخروٹ اور چکوترہ بہت عام ہیں۔ طیطوان کے سنترے مشہور ہیں، اسی طرح کناس کی ناشپاتی مراکش کے انار، تاس کی انجیر، سجلماسہ کی کھجور، سوس کے بادام اور رباط کے انگور کی بہت شہرت ہے۔ کسی زمانے میں حشیش اور تمباکو کی کاشت حکومت کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ نیل اور کپاس اب مفقود ہے۔ یہی حال شکر کا ہے جو کسی زمانے میں سوس میں تیار کی جاتی تھی۔ قدرتی پیداوار کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مراکش میں جنگلوں کی بہت کمی ہے۔ البتہ بعض حصوں میں طرح طرح کے درخت پائے جاتے ہیں۔ مثلاً "عرار" جو سرو سے ملتا جلتا ہے اس کی لکڑی نہایت عمدہ اور خوبصورت ہوتی ہے۔ جامعہ قرطبہ کی چھت میں اسی کو استعمال کیا گیا ہے اور "ارگان" مراکش کا خاص درخت جو دنیا میں اور کہیں نہیں ہوتا اس میں زیتون کی قسم کا ایک پھل لگتا ہے جس کا تیل غریب لوگ کھانے میں استعمال کرتے ہیں۔

اب تک ہم نے اس امر کی طرف اشارہ نہیں کیا کہ باعتبار مناظر مراکش کے پہاڑ اور نہروں کی کیفیت کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مراکش کے جنوبی مشرقی حصص صحرائے اعظم سے ملے ہوئے ہیں۔ ان سیاحوں کے لئے کوئی خاص دلکشی نہیں، لیکن اس علاقے سے قطع نظر کر لیجئے تو باقی حصہ ملک میں دشت و صحرا کے باوجود نہایت زرخیز اور شاداب وادیاں نظر آئیں گی۔ کوہ اطلس کی برف پوش چوٹیاں اور سبزہ و اشجار کا وہ سلسلہ جو دامن کوہسار میں اکثر دور تک چلا گیا ہے، ارباب نظر کو بے اختیار اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ جب بہار کا زمانہ قریب ہوتا ہے تو بعض مقامات پر پھولوں کی یہ کثرت ہوتی ہے کہ سطح زمین کا کوئی گوشہ ان سے خالی نہیں رہتا۔ چنانچہ ایک سیاح کا بیان ہے کہ جب وہ قصر فراعون میں پہنچا تو اس نے میلوں تک تختہ ہائے گل کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔

مراکش کی کل آبادی ۰۰۰۰۰۰ ہے جس میں غالب حصہ بربر قبائل کا ہے جو زیادہ تر کوہستانی اضلاع میں آباد ہیں، البتہ شہری آبادی زیادہ تر عرب شرفا اور ان کی اولاد کی ہے جو ابتدائے اسلام میں یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اور جن کی موجودگی نے در اصل مراکش کو موجودہ مراکش بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی معاشرت اور زبان بھی عربی ہے اگرچہ اس میں اور دوسرے ممالک کی عربی میں لب و لہجہ اور محاورے کا تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس خالص اسلامی آبادی کے علاوہ کہیں کہیں یہودی بھی

بستے ہیں جو عیسائیوں کے مظالم سے تنگ آ کر یہاں پناہ گزیں ہوگئے تھے حال میں مغربی تجارت اور سیاسی اثرات کی بدولت سواحل پر کسی قدر یورپین بھی نظر آجاتے ہیں۔

مراکش ایک تاریخی علاقہ ہے جس میں بہت سی تہذیبوں کے آثار پائے جاتے ہیں اکثر رومی شاہراہوں اور عمارات کے نشانات بھی پائے جاتے ہیں جن کا قبضہ یہاں پانچویں صدی مسیحی تک رہا۔ ان کے بعد وندال اور قوطی قوموں (Vandals and Goths) کا عمل دخل شروع ہوا لیکن یہ لوگ اہل رومہ کی شان و شوکت کو نہیں پہنچ سکے۔ قدیم رومی حکومت کا ربط انتظام مملکت اور تہذیب و تمدن میں بہت مشہور رہاہے۔ اس کے برعکس قوطی اور وندال قومیں نیم وحشیانہ حالت میں تھیں بالخصوص وندال کہ جن سے منسوب ہوکر انگریزی میں لفظ Vandalism بربریت کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

قوطی حکومت جس کی ابتدا قبیلہ وندال کے بعد ۴۶۱ء میں ہوئی اور ۶۸۲ء میں تقریباً اس کا خاتمہ بھی ہوگیا۔ تقریباً اس لئے کہ ۶۸۲ء میں عقبہ بن نافع فہری کی یلغار کے بعد خلافت دمشق کو یزید کی جانشینی پر ایسے المناک واقعات کا سامنا پڑا کہ آئندہ بیس برس تک مسلمان اس ملک کی طرف توجہ نہیں کرسکے۔ یہ عقبہ بن نافع فہری وہی بزرگ ہیں جنھوں نے سوس کے قریب بحر ظلمات میں یہ کہہ کر اپنا گھوڑا ڈال دیا تھا کہ اگر "زمین اور ہوتی تو تیرے نام کی تقدیس کے لئے اور آگے چلا جاتا"، بہر حال رفع فتنہ کے بعد جب مشہور اموی خلیفہ عبدالملک اور اس کے لائق جانشین ولید بن عبدالملک کا زمانہ آیا تو مغرب (اسلامی تاریخ میں مراکش کو مغرب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) کی حکومت موسیٰ بن نصیر کے سپرد کی گئی۔ جس نے ۷۰۸ء میں تفیلات اور درعہ تک کا سارا علاقہ مسخر کرڈالا لیکن موسیٰ بن نصیر کی فتحمندیوں کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی کشش بے اختیار اہل بربر کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور یہ غیور اور حریت پسند قوم جن پر اس وقت تک نہ رومہ کا جادو چلا تھا نہ مسیحیت کا، جلد ہی اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے۔ اور خدمت دینی کی آرزو میں عربوں سے بھی بڑھ گئے طارق بن زیاد جس نے ۷۱۱ء میں دیکھتے ہی دیکھتے کل اسپین کو فتح کرڈالا اہل بربر ہی سے تھا۔ غالباً پیام بھائیوں کو یہ واقعہ اچھی طرح معلوم ہوگا کہ اسلام کے اس مشہور سپہ سالار نے کس طرح ساحل جبل طارق پر جو آج تک اسی کے نام سے موسوم ہے یہ کہہ کر اپنی کشتیاں جلا ڈالی تھیں کہ "ہمیں اپنے ملک کو جانے کا کوئی خیال نہ ہونا چاہئے یہ ملک بھی ہمارا ہے اس لئے کہ سبھی ملک خدا کے ہیں"، بہر حال موسیٰ بن نصیر کے زمانے سے مراکش باقاعدہ خلافت امویہ کا ایک صوبہ بن گیا اور پھر ۷۵۰ء میں جب خلافت عباسیہ قائم ہوئی تو یہاں بھی ان کی سیادت قائم ہوگئی۔ لیکن عباسی بہت دنوں تک اس ملک پر اپنا قبضہ نہیں کرسکے۔ امام ادریس بن عبداللہ جن کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ بنی عباس کی مخالفت سے تنگ آکر مراکش میں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی۔ امام ادریس سے پہلے ان کے بھائی خلیفہ منصور کے ہاتھوں جام شہادت پی چکے تھے۔

یہ پہلا موقعہ تھا جب سلطنت اسلامی میں ایک ساتھ تین فرمانروا برسر حکومت تھے یعنی مشرق میں ہارون الرشید اعظم۔ اندلس (اسپین) میں عبدالرحمٰن الداخل اور مراکش میں ادریس بن عبداللہ جن کا ۷۹۱ء میں انتقال ہوا انکے جانشین ادریس ثانی ہوئے جنھوں نے مراکش کے قدیم دار الخلافت فاس کی بنیاد ڈالی جن کو عربی سے نابلد لوگ غلطی سے فیض کہتے ہیں۔ ادریسی خاندان کے بعد مراکش کا شمالی حصہ خلافت اندلس کا جزو بن گیا اور مشرقی حصہ خلفائے فاطمیہ کے قبضے میں آگیا۔ لیکن فاطمی خلفا مشرق کے معاملات میں اس طرح منہمک ہوئے جس سے ان کو اس دور دراز صوبے پر بہت کم توجہ کا موقعہ ملا۔ بالآخر ۱۰۶۱ء میں اہل بربر نے یوسف بن تاشفین کے ماتحت جو خاندان مرابطین کا بانی ہے اپنی حکومت قائم کرلی۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد اسپین بھی فتح کرڈالا۔ یوسف ہی نے قدیم دار الخلافت کی بجائے مراکش کے نام سے ایک نیا شہر تعمیر کرایا۔ جس کی وجہ سے اب پورے ملک کو مراکش ہی کہتے ہیں۔ مرابطین کے بعد دوسرے بربر خاندان

موحدین کا زمانہ آیا جو اپنے پیشروؤں کی طرح اسپین کے بھی حاکم تھے۔ بلکہ ان کی سیاسی اور تمدنی قابلیت ان سے کہیں بڑھ کر تھی۔ موحدین کا خاتمہ ۱۲۶۹ء میں ہوا اور اب زمام سلطنت بن مرین کے ہاتھ میں آئی۔ یہ بھی بربر تھے اور ۱۴۶۵ء میں جب ان کا زوال ہوا تو ایک چوتھے بربر خاندان یعنی بنو وطاس کی حکومت شروع ہوئی جنھوں نے ازسرنو فاس کو دار السلطنت بنایا۔ بنو مرین کا مرکز حکومت فاس رہتا تھا۔ کبھی مراکش اور کبھی مکناس لیکن چار صدیوں کے عروج کے بعد مراکش کی حکومت بربر شرفا کے ہاتھ سے نکل گئی اور ائمہ بنی ہاشم پھر اس ملک کے وارث ہوئے جو اپنا سلسلہ نسب ادریسیوں کی طرح حضرت امام حسنؓ سے ملاتے ہیں۔ حسنی شرفا کا عروج ۱۵۰۰ء میں عبد اللہ المخاطب کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے ۱۶۶۸ء تک حکومت کی۔ مراکش کا موجودہ حکمراں خاندان کا بانی جو دراصل شرفائے حسنی ہی کی ایک شاخ ہے مولائی محمد تھا جس کی حکومت ۱۶۲۹ء ہی سے سنجلماسہ پر قائم تھی ۱۶۶۸ء میں اس کا بیٹا رشید ثانی تمام مراکش کا حاکم ہوا۔ مولائی اسماعیل جس نے ۱۶۷۲ء سے ۱۷۲۷ء تک حکومت کی یہ مراکش کا سب سے زیادہ زبردست سلطان ہوا ہے۔ مراکش کے حسنی امام ہمیشہ سے خلافت کے مدعی رہے ہیں۔ اور بربر خاندانوں کے سوا کسی نے خلافت عباسیہ و فاطمیہ یا امویہ (اندلس) کو تسلیم نہیں کیا۔

بقیہ صفحہ نمبر ۱۲

سر میں لگا تھا کہ دنیا اس کے سامنے تاریک ہوگئی۔ اب کیا تھا قسمت کا لکھا پورا ہوا۔

فقیر چیخ چیخ کر رونے لگا "مسافر! مسافر!! اے میرے دوست مسافر!!! تیرا کوئی قصور نہیں آہ! یہ سب میری وجہ سے ہوا تو نے بہت سمجھایا لیکن میں نے تیری باتوں کو ٹھکرا دیا، تو نے میرے ساتھ شفقت کی لیکن میں اس کو صرف دھوکہ سمجھتا رہا۔

آہ! یہ سب لالچ اور بے صبری کا پھل ہے، قناعت نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر میں ہیں اونٹ پر قناعت کرتا تو کیا یہ میرے لئے کافی نہ ہوتے؟ ضرور تھے۔ اس میں اتنے قیمتی اور بیش بہا جواہرات تھے۔ کہ میرے اور میری سات پشت کے لئے کافی ہوتے۔ اے میرے شفیق دوست!! اب میں تم سے کسی چیز میں اختلاف نہ کروں گا تیری ہر بات کے آگے سر تسلیم خم کر دوں گا۔ اور تجھ پر کبھی بھی بدگمانی نہ کروں گا۔ سچ ہے انسان ٹھوکریں کھا کر سنبھلتا ہے"۔

فقیر یہ سب کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن وہاں کون تھا جو اس کی باتوں کا جواب دیتا۔ مسافر سارا سامان لے کر اپنے مکان کو روانہ ہوگیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت سے فقیر راستہ پر بیٹھا رہتا ہے۔ راہ رو سے گزرتے ہیں اور اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اگر کوئی حال پوچھتا ہے تو جواب میں کہتا ہے "مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میرا حال ناگفتہ بہ ہے میں لالچ کا شکار ہوں۔"

مصعب مکتب کا ایک بچہ
عمر چار سال

جسکو لفظوں کا ایک بہت بڑا
ذخیرہ یاد ہے۔
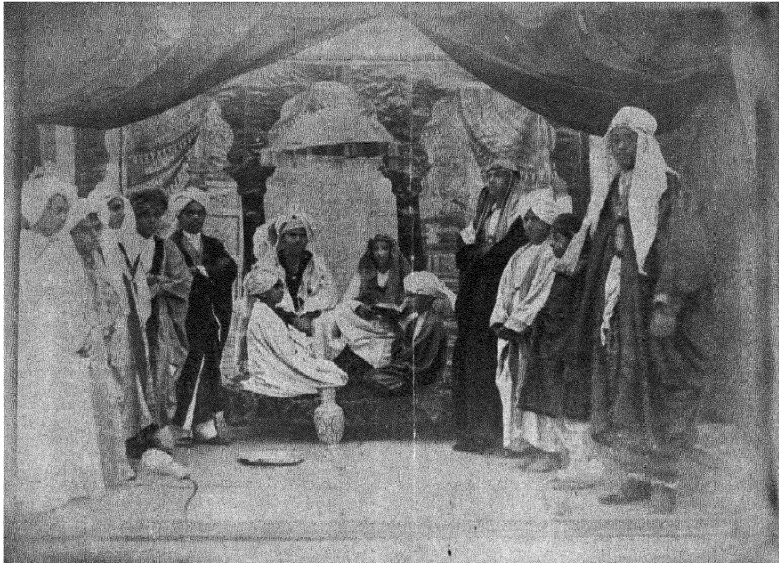
بچوں کا انصاف

جامعہ کے بچوں نے گذشتہ سال ایک ڈراما کیا تھا جس کا ایک منظرہاروں الرشید کا دربار اس تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ وہ مشہور قصہ ہے جسمیں حسن خواجہ نامی ایک بغدادی سوداگر نے اپنے ایک دوست کی ہزار اشرفیاں خیانت کرلی تھیں اور جس کے مقدمہ کا فیصلہ ہاروں الرشید نے بچوں کے ایک کھیل سے سبق لیکر کیا

ذاکٹر عبدالکریم گر مانس
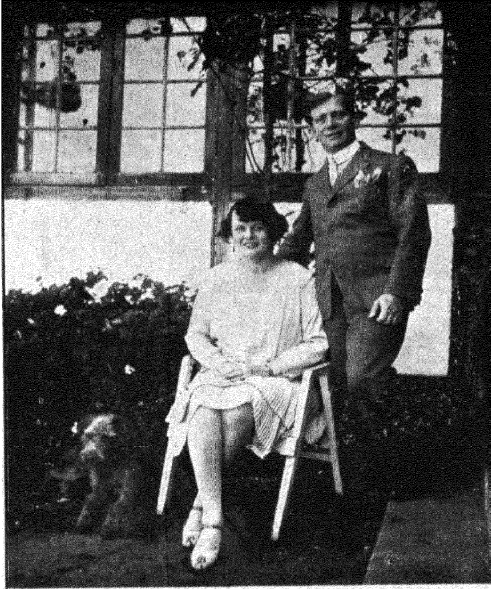
مسلمان ہونی کی بعد ہندوستانی لباس میں

ذاکٹر جولیس گرمانسن معہ بیگم صاحبہ

مسلمان ہونی سی پہلی، یورپین لباس میں

قیمت سالانہ عہ؍ — قیمت فی پرچہ ۲؍

جلد ۱۱ | ۱۵؍جنوری سنہ ۱۹۳۲ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

طابع و ناشر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی — ایڈیٹر سعید انصاری بی اے (جامعہ)

دنیا کے چند مشہور جانور

کنگیرو

اس کے اگلے دو پاؤں چھوٹے ہوتے ہیں اور پچھلے بڑے، پھر بھی یہ بہت تیزی سے بھاگتا ہے۔ اس کے پیٹ پر ایک تھیلی ہوتی ہے جس میں وہ اپنے بچے کو رکھ لیتا ہے اور اُسے لے کر باسانی چل پھر سکتا ہے۔

گینڈا

جس کی ناک پر ایک سینگ ہوتا ہے اور جس کی کھال اتنی سخت اور مضبوط ہوتی ہے کہ اس سے تلوار کی ڈھال بناتے ہیں
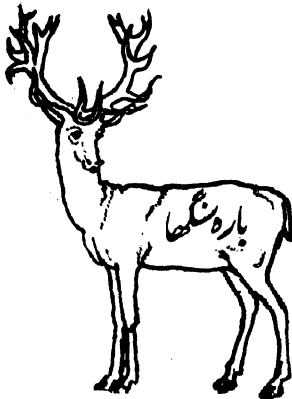
بارہ سنگھا

یہ ہرن کی ایک قسم ہے جس کے سر پر سینگوں کی ایک شاخ ہوتی ہے۔

آنکھ کا دھوکا

غالباً ہر شخص یہ جانتا ہے کہ آنکھ نہایت عجیب وغریب آلہ ہے۔ ہم وثوق کے ساتھ یہ کہا کرتے ہیں کہ آنکھ سے دیکھ لینا یقین کے مترادف ہے۔ ع شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ۔ بایں ہمہ آنکھ میں بعض ایسے نقص اورعیوب موجود ہیں جن کو نہایت اہم اور سخت نقصان کہنا چاہیئے۔ اور جن سے بہت کم لڑکے لڑکیاں واقف ہیں۔

سب سے اول اور مقدم تو یہ ہے کہ ہر ایک آنکھ کے اندر ایک ایسا سیاہ داغ یا نقطہ پایا جاتا ہے جس کو بلائنڈ اسپاٹ (Blind Spot) یا دوسرے الفاظ میں نقطۂ کور اور نابینائی کا داغ کہنا چاہئے۔ یہ داغ آنکھ کے اُس حصہ پر پایا جاتا ہے جس کو انگریزی میں ریٹنیا (Retina) کہتے ہیں (ریٹنیا آنکھ کے اُس پردے کا نام ہے جو کہ آنکھ کے اندر کی جانب پچھلے حصے میں ہوتا ہے) اور یہ ریٹنیا کے اُس مقام پر ہوتا ہے جہاں بصارت کی رگ آنکھ کے اندر داخل ہوتی ہے۔ بلائنڈ اسپاٹ کی سمت یا مقابل میں جو چیز آئیگی وہ نظر نہیں آسکتی۔ عام مشاہدے سے یہ امر اس واسطے مخفی رہتا ہے کہ یہ کبھی واقع نہیں ہوتا کہ کوئی چیز ایک ہی وقت میں لمحے میں دونوں آنکھوں کے بلائنڈ اسپاٹ کے مقابل آجائے۔ اگر ہماری آنکھ سے وہ چیز غائب ہوتی ہے تو اُسی وقت ہماری دوسری آنکھ سے وہ نظر آتی رہتی ہے یک چشم آدمی کو آنکھ کا یہ نقص زیادہ بداہت سے معلوم ہوسکتا ہے اس نقطۂ کور کے وجود سے واقف ہونے کے لئے مندرجہ ذیل طریقہ کی آزمائش کرنی چاہیئے:۔

نمبر ۱

•

اپنی داہنی آنکھ بند کرلو اور اس صفحہ کو آنکھ سے ایک ہاتھ کے فاصلہ پر اس طرح رکھو کہ جو خط مستقیم مندرجہ بالا دو سیاہ نقطوں کو باہم ملا وے وہ متوازی واقع ہو۔ حالت مذکورہ میں اپنی بائیں آنکھ سے نقطہ ۱ کو برابر دیکھتے رہو۔ اور اسی ہیئت کے ساتھ اس صفحہ کو اپنی آنکھ کے قریب کرتے جاؤ۔ یہ عمل کرتے ہوئے جب وقت یہ صفحہ تمہاری آنکھ سے تقریباً دس انچ کے فاصلہ پر رہ جائے گا اُس وقت مندرجہ بالا بائیں طرف والا سیاہ نقطہ تمہاری نظر سے بالکل غائب ہوجائیگا سبب یہ ہے کہ اُس نقطہ کا عکس یا نقش عین اس وقت ریٹنیا کے بلائنڈ اسپاٹ پر پڑتا ہے۔ بعدہٗ جب اس صفحہ کو آنکھ سے اور زیادہ قریب لاؤ گے تو وہی نقطہ پھر نظر آنے لگے۔ اس عملی تجربہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اس بات کا بخوبی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ اس اثنا میں داہنی آنکھ بند رہے اور بائیں آنکھ کی نظر متواتر نقطہ ۱ پر پڑتی رہے۔ اور یہ بھی ضروری ولازمی ہے کہ نظر دوسرے نقطے کی طرف سیدھی نہ جائے بلکہ ترچھی واقع

اس کے برعکس اگر بائیں آنکھ بند رکھی جائے اور مذکورہ طریقے

دائیں آنکھ کی نظر بائیں ہاتھ والے نقطے کی طرف ڈالی جائے تو ایسا کرنے سے نقطہ ا نظر سے غائب ہوجائے گا۔

اب لو یہ دو صورتیں (۱) ایک سفید چیز کسی سیاہ زمین پر (۲) ایک سیاہ چیز کسی سفید زمین پر۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اول الذکر چیز موخرالذکر چیز کی بہ نسبت ہمیشہ زیادہ بڑی نظر آتی ہے۔ اس کا سبب وہ چیز ہے جو کہ (Irradiation) یا عمل توسیع تنویر کہلاتا ہے۔

اس شکل میں (شکل نمبر۲) سے نگہ ا د خط مستقیم معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ خط مستقیم ا ب ہے۔ جسکی تصدیق رولر کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔ اس فریب نظر کا سبب بھی توسیع تنویر ہے۔ سیاہ رنگ کی چوڑی پٹی دیکھنے میں اتنی چوڑی نظر نہیں آتی جتنی کہ درحقیقت وہ ہے۔

ترچھے خطوط واقعی سمت یا رُخ کو صحیح طور پر دیکھنے میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً شکل نمبر۳ میں کھڑے خطوط درحقیقت باہم متوازی ہیں اگرچہ وہ علیحدہ علیحدہ مختلف سمتوں میں ترچھے یا جھکے ہوئے نظر آتے ہیں اور اگر ہم اسی شکل نمبر۳ کو اتنا ٹیڑھا یا ترچھا کر کے دیکھیں کہ ۴۵ درجہ کا زاویہ پیدا ہوجائے تو ہماری نظر کو اور بھی زیادہ دھوکا ہوتا ہے۔

شکل نمبر۴ میں دائرہ بالکل ٹھیک بنایا گیا ہے لیکن وہ دائیں جانب کو ذرا نکلا ہوا یا آگے کو پھیلا نظر آتا ہے اور بائیں طرف قدرے بڑا معلوم ہوتا ہے۔

نمبر۳

شکل نمبر۵ میں مربع جو تم دیکھتے ہو بالکل مربع ہے لیکن نیچے والا بائیں ہاتھ کیطرف والا گوشہ زاویہ حادہ نظر آتا ہے۔ یہ بھی ایک نظری فریب ہے۔

فاطمہ اور رحیم الدین

باپ نے کہا: "خاندان تو وہ چیز ہے جس کے بغیر ہم جی نہیں سکتے، بستی اس لئے بسائی جاتی ہے کہ زندگی اچھے طریقے سے گذاری جا سکے آدمی جنگل میں رہے تو اسے ادھر اُدھر پھل کھانے کو مل جائیں گے، کبھی کبھی موقع ملا تو وہ کسی پرند یا جانور کا شکار کرے گا، لیکن تم کو دیکھو کہ زندگی کیسی پریشانی کی ہے، پھل نہ ملے، شکار نہ ملا، تو بس کھانے کو کچھ بھی نہیں۔ اور پھر خدا نے انسان کو حیادار بنایا ہے، اسے کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے، اور اگر اس میں حیا شرم نہ بھی ہوتی، تب بھی لیا تو ہے نہیں کہ اس کے جسم پر ریچھ کے سے بال ہوں، اس کے لئے جاڑوں کے دن کاٹنا ایک بڑی مصیبت ہے۔ اسی وجہ سے انسان نے تھوڑا تھوڑا کرکے اپنی زندگی چین سے بسر کرنے کا انتظام کیا ہے بعض جانوروں کی طرح اس نے بھی غولوں میں رہنا شروع کر دیا، گائے، بھینس، بھیڑیں بکریاں پال لیں جن کے دودھ اور گوشت سے وہ اپنا پیٹ پالتا اور کھال سے کپڑے اور جوتے بناتا۔"

جیسے جیسے باپ یہ باتیں بتاتا گیا، فاطمہ کی حیرت بڑھتی رہی آخرکار اس سے نہ رہا گیا اور اس نے پوچھا۔

"تو ابا جان کیا آدمی کھال کے کپڑے بھی پہنتے ہیں!"

باپ کچھ سمجھانے والا تھا کہ رحیم الدین بول اُٹھا:

"ارے واہ، پہنتے کیوں نہیں ہیں۔ میں نے تو اپنی کتاب میں پڑھا ہے۔"

"ہاں"، باپ نے کہا، "جن ملکوں میں سردی بہت ہوتی ہے وہاں بھیڑیوں کی کھال کے کپڑے اور اوڑھنے بچھونے ہوتے ہیں"

فاطمہ نے پوچھا: "اور پھر گرمیوں میں کیا کرتے ہیں؟"

"گرمیوں میں بعض چیزیں کپڑے کی ہوتی ہیں بعض چمڑے کی"

"مگر کپڑا کہاں سے آتا ہے؟"

باپ نے مسکرا کر کہا: "ہاں میں تمہیں یہ سمجھانا بھول گیا۔ خدا نے دنیا کے ہر حصہ میں انسانوں کو ایک ہی وقت میں نہیں پیدا کیا، جیسے بعض آدمی بوڑھے ہوتے ہیں بعض جوان بعض بچے، ویسے ہی بعض نسلیں بچپن کی حالت میں ہوتی ہیں بعض جوان بعض بوڑھی"

فاطمہ غور کے ساتھ سن رہی تھی، اس لئے جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ فوراً ٹوک دیتی۔ اب اس نے کہا،

"ابا جان نسل کس کو کہتے ہیں؟"

رحیم الدین چاہتا تھا کہ اسے سب کچھ جلدی سے معلوم ہو جائے اسے فاطمہ کے بار بار ٹوکنے سے اُلجھن ہوتی تھی۔ اس نے کچھ خفگی کے لہجے میں کہا۔

"اسے تم تو بیچ بیچ میں ٹوک دیتی ہو؟ بات تو سننے دو۔"

باپ نے کہا: "نہیں فاطمہ کا سوال بالکل ٹھیک تھا جب تک تم یہ نہ سمجھ لو کہ نسل کسے کہتے ہیں تمہاری سمجھ میں اور بہت سی باتیں بھی نہیں آئیں گی۔ سنو، فاطمہ، تم کو معلوم ہوگا کہ ہر ملک کے درخت پھل اور پھول الگ الگ ہوتے ہیں، اس لئے کہ ہر ملک کی آب و ہوا اور زمین میں فرق ہوتا ہے۔ جیسے پھلوں اور پھولوں پر آب و ہوا کا اثر ہوتا ہے ویسے ہی آدمیوں پر بھی ہوتا ہے۔ ہر آب و ہوا میں آدمی کی سیرت ایک الگ رنگ پکڑ لیتی ہے، اس کے بدن کی بناوٹ، اس کا ناک نقشہ، سب کچھ مختلف ہوتا ہے۔ آدمی کی طبیعت پہچاننا تو بہت مشکل ہوتا ہے، اس لئے ہم آدمیوں کے ناک نقشے اور بدن کی بناوٹ کو دیکھتے ہیں، اور جن لوگوں کا ناک نقشہ اور بدن کی بناوٹ ایک سی ہو انھیں ہم ایک نسل کا کہتے ہیں، کیونکہ وہ ایک سی آب و ہوا اور ایک سی زمین کی پیداوار ہوتے ہیں۔ دنیا میں بہت سی نسلیں ہیں اور سب کو ہم اسی طرح پہچان لیتے ہیں۔ اب نسلوں ہی سے کچھ جوان ہیں، کچھ بوڑھی، کچھ نے زیادہ ترقی کر لی ہے، کچھ ابھی زندگی بسر کرنے کا طریقہ سیکھ رہی ہیں۔ اسی طرح ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ جوان نسلیں بوڑھی نسلوں سے سب کچھ سیکھ لیتی ہیں، اور پھر خود دوسروں کو سکھاتی ہیں ہاں۔ تو ہم کہاں تک پہنچے تھے؟"

رحیم الدین کو اسی کا انتظار تھا، اس نے جھٹ سے کہا: "لوگ جانور پالنے لگتے ہیں۔"

"ہاں، لوگ ایک ساتھ رہنے لگتے ہیں اور کھانے پینے اور پہننے کی آسانی کے لئے جانور پالتے ہیں، لیکن اب وہ جنگلوں میں نہیں بستے انھیں ایسے میدانوں میں رہنا پڑتا ہے، جہاں بہت سی گھاس اُگتی ہو پہلے تو وہ اپنے پالتو جانوروں کے ساتھ جہاں گھاس اور پانی ملا، وہیں رہتے ہیں، اور پھر جب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ آس پاس اور لوگ بھی ہیں جو انھی کی طرح گھاس اور پانی کی تلاش میں ہیں تو وہ کسی ایک جگہ پر بس جاتے ہیں، اور بجائے آب و دانہ کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کے وہ کھیتوں میں جوتنے بونے سے اتنا پیدا کر لیتے ہیں کہ ان کا کام نکل سکے۔ ایک جگہ پر بس جانے سے ان کی زندگی بالکل بدل جاتی ہے، بہت سے کام جو پہلے نہیں کئے جا سکتے تھے، اب ہونے لگتے ہیں کیونکہ بہت سی چیزیں جن کی پہلے ضرورت نہیں تھی اب ضروری ہو جاتی ہیں اور ضرورت دیکھ کر لوگ سارا کام آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں، کوئی لوہار بن جاتا ہے، کوئی موچی، کوئی معمار، کوئی بڑھئی، کوئی جلاہا۔"

"مگر ابا جان ان کو یہ سب کام کون سکھاتا ہے؟" رحیم الدین نے پوچھا

وہ خود تھوڑا تھوڑا کر کے سیکھتے ہیں، تم کسی عجائب خانہ میں وہ چیزیں دیکھو جو ہمارے ملک میں چار پانچ سو برس پہلے بنتی تھیں تو وہ تمہیں بھونڈی اور بھدی معلوم ہوں گی، اور اس سے پہلے کی چیزیں اور بھی بھونڈی ہونگی۔ جب کسی بستی میں ایک آدمی کے جی میں آیا ہوگا کہ لکڑی کی کوئی چیز بنائے تو اس نے پہلے پہل اسے بہت خراب بنایا ہوگا، چھت کی دھنی ہوئی تو کہیں موٹی کہیں پتلی، کوئی بیٹھنے کی چیز ہوئی تو کہیں اونچی کہیں نیچی۔ پھر دوسروں نے اس کی نقل کر کے اس سے بہتر چیز بنانے کی کوشش کی ہوگی، اور یوں ہی مشق کرتے کرتے کچھ لوگ اس کام میں بہت ماہر ہو گئے ہوں گے، اور ان کا پیشہ ایک فن بن گیا ہوگا۔ مگر میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہیں فنون کی ترقی کا قصہ سناؤں۔ تم کو یاد ہوگا میں نے کل تم کو سمجھایا تھا کہ انسان کے لئے صحبت بہت ضروری ہوتی ہے۔ یہ بھی ایسی چیز ہے جس کے بغیر اس کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ یہی ضرورت

خوشی کی تلاش

کسی زمانہ میں ایک شخص الیاس نامی ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ باپ کی زندگی میں گھر کے سارے انتظامات باپ ہی کے ذمہ تھے، لیکن بیس برس کی عمر میں اس کے باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور گھر کے سارے انتظامات اس کو انجام دینے پڑے۔ خوش قسمتی سے خاندان بہت بڑا نہ تھا۔ اس کی صرف ایک بیوی تھی اور ایک بچہ جس کی پرورش اس کے ذمہ تھی، باپ کے مرنے کے بعد اس کے پاس دو گائیں دو بکریاں اور چند گھوڑے تھے جن سے وہ اپنی روزی آسانی سے پیدا کر لیتا تھا۔ وہ اور اسکی بیوی صبح سے شام تک برابر کام میں مشغول رہتے صبح سویرے اُٹھتے اور دیر رات گئے سوتے۔ اس طرح اُن کی اس محنت سے سال بسال دولت بڑھتی گئی اور چند ہی سال میں وہ کافی دولت مند ہو گئے، یہاں تک کہ پینتیس سال کی عمر میں وہ دو سو گھوڑوں، ڈیڑھ سو مویشیوں، ہزار سے زاید بھیڑ بکریوں کے مالک ہو گئے، اب بجائے خود کام کرنے کے کئی آدمیوں کو نوکر رکھنا پڑا جو اُن جانوروں کی دیکھ بھال کرتے۔ الیاس اب بڑا خوشحال تھا اسکی خوشحالی پر اس کے گاؤں کے لوگ اس پر رشک کرنے لگے تھے کہ "الیاس بڑا خوش قسمت آدمی ہے کہ اس کے پاس ہر چیز بافراط ہے اور دنیا اس کے لئے بڑی اچھی جگہ ہے"۔ جب دوسرے دولت مند لوگوں کو بھی اس کا حال معلوم ہوا، تو وہ لوگ بھی دور دور سے اس کے پاس آنے لگے اور وہ انکی بہت خاطر تواضع کرتا۔

الیاس کے تین بچے تھے جن میں دو لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ شادی کے قابل ہوتے ہی اُس نے سب کی شادیاں کر دیں۔ جب وہ غریب تھا تو اس کے بیٹے اس کے کام میں ہاتھ بٹاتے اور تمام مویشیوں کی حفاظت کرتے۔ لیکن جب وہ امیر ہوا تو اس کا بڑا بیٹا شرابی ہو گیا اور ایک جھگڑے میں مارا گیا۔ دوسرا چھوٹا بیٹا ایک ایسی خود غرض بیوی کے قبضہ میں چلا گیا جو محض اس کی رضا جوئی کے لئے باپ کا نافرمانبردار ہو گیا اور باپ سے لڑ کر علیحدہ ہو گیا۔ الیاس نے اس بیٹے کو ایک گھر کچھ مویشی دے دئے جس میں وہ اور اس کی بیوی دونوں رہتے اور ان مویشیوں سے اپنی روزی حاصل کر کے زندگی بسر کرتے۔ الیاس کی جائداد کا کچھ حصہ الگ ہو جانا ایسا بدشگون ثابت ہوا کہ اس کے چند ہی روز بعد ایک مرض اس کی بکریوں میں پیدا ہوا جس کی وجہ سے بہت سی بکریاں اس مرض کی نذر ہو گئیں اس کے ساتھ فصل بھی خراب ہو گئی جس کی وجہ سے گھاس نہیں اُگی اور گھاس نہ ہونیکی وجہ سے بہت سے مویشی مر گئے۔ انھیں دنوں میں تھوڑے بہت مویشی جو بچ رہے تھے ڈاکوؤں کا ایک گروہ چرا لے گیا۔ اس طرح اسکی جائداد گھٹتے گھٹتے ختم ہو گئی، اور اب وہ قلاش ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کو اپنے گھر کا تمام سامان فروخت کرنا پڑا جب اسکی عمر ۷۰ سال کی ہو گئی تو اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ تھا جس کو بیچ کر اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ بھرتا۔ اس کا بیٹا جو اس سے لڑ کر علیحدہ ہو گیا تھا، اس نے کسی دوسرے ملک میں جا کر سکونت اختیار کر لی تھی، اسکی بیٹی بھی مر چکی تھی، اب دنیا میں اس کو مدد دینے والا کوئی نہ تھا۔ ایسی حالت میں وہ بہت پریشان تھا کہ اب وہ کیا کرے،

ایک شخص محمد شاہ نامی اس کے پڑوس میں رہتا تھا، وہ مالدار

تھا اور نہ غریب، ایک متوسط درجہ کا بہت خوش اخلاق آدمی تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ الیاس کی حالت بہت خراب ہے تو اسکو اس پر بڑا رحم آیا اور الیاس کی مہمان نوازی یاد آگئی، محمد شاہ نے کہا کہ "مجھے تمہارے اور تمہاری بیوی کے حال پر بڑا رحم آتا ہے اگر تم لوگ میرے یہاں رہنا پسند کرو تو میں تم دونوں کو کھانا کپڑا دونگا، اور جس قدر تم کام کر سکو میرا کام کر دیا کرو"۔ الیاس نے اس کا شکریہ ادا کیا، وہ اور اسکی بیوی دونوں اس کے یہاں نوکر کی حیثیت سے کام کرنے لگے، شروع شروع ان کو کام کرنے میں تکلیف ہوئی لیکن پھر وہ کام کے عادی ہوگئے اور جسقدر ان سے کام ہو سکتا تھا کرتے تھے۔ محمد شاہ بھی ان کے کام سے بہت خوش تھا لیکن اس کو اس کا افسوس بھی ہوتا تھا کہ یہ کس طرح اس بلندی سے پستی میں آپڑے۔

ایک مرتبہ محمد شاہ کے کچھ عزیز بہت دور سے اسکی ملاقات کی غرض سے آئے ہوئے تھے ان میں ایک ملّا صاحب بھی تھے۔ محمد شاہ نے الیاس سے کہا کہ ایک بکری ذبح کرو۔ الیاس نے ایک بکری ذبح کی اور اس کا گوشت خوب اچھی طرح بھون کر مہمانوں کے سامنے پیش کیا، مہمانوں نے اسے کھا کر بڑی تعریف کی، اس کے بعد چائے کا دور شروع ہوا، اس دوران میں مختلف مباحث پر گفتگو ہونے لگی، اثنائے گفتگو میں الیاس اپنا کام ختم کر کے مہمانوں کے سامنے سے گزرا۔ میزبان نے اس کی طرف اشارہ کر کے ان مہمانوں سے پوچھا "کیا آپ لوگ اس شخص کو جانتے ہیں جو ابھی سامنے سے گزرا ہے"۔ "جی نہیں" مہمانوں نے جواب دیا۔ "یہ ایک بہت دولت مند شخص تھا اس کا نام الیاس ہے، آپ لوگوں نے یہ نام تو سُنا ہوگا؟" میزبان نے کہا۔

"بیشک یہ نام ہم نے سُنا ہے، اس کو ہم نے اس سے پہلے دیکھا بھی نہیں البتہ اس کی شہرت بڑی بڑی دور تک ہے" مہمانوں نے کہا۔

"ہاں اور اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، یہ میرے پاس ایک ملازم کی حیثیت سے ہے اور اس کی بوڑھی بیوی بھی یہیں ہے" محمد شاہ نے کہا۔

مہمان یہ سن کر بہت متعجب ہوئے اور ان میں سے ایک نے کہا، کیا ان کو اپنی دولت کے کھونے کا رنج نہیں ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ آرام سے ہوں گے اور کام بھی دل سے کرتے ہوں گے"۔ یہ کہہ کر اُس نے میزبان سے اجازت چاہی کہ وہ الیاس سے گفتگو کرنے دیں تاکہ اسکی زندگی کے متعلق کچھ دریافت کریں۔ میزبان نے الیاس کو آواز دی اور پھر ان مہمانوں سے کہا وہ اس سے جو پوچھنا چاہیں پوچھیں۔ الیاس مع اپنی بیوی کے آیا اور اپنے آقا کے قریب بیٹھ گیا اور اس کی بیوی اپنی مالکہ کے قریب بیٹھ گئی۔ محمد شاہ نے الیاس کو ایک پیالی میں تھوڑی سی چائے دیدی الیاس نے بڑی دعاؤں کے ساتھ اس کو قبول کیا اور ابھی چند ہی گھونٹ لئے تھے کہ مہمان نے سوال کیا "الیاس! اس وقت ہم لوگوں کو اس طرح دیکھ کر تم کو ضرور رنج ہوتا ہوگا اور گزشتہ خوش حالی کا زمانہ یاد آتا ہوگا"

"اگر میں بیان کروں کہ خوش حالی کیا ہے؟ بدنصیبی کس کو کہتے ہیں تو آپ ہنسیں گے اس لئے بہتر ہوگا آپ میری بیوی سے دریافت کریں وہ عورت ہے جو اثر اس کے دل پر ہوگا اس کا صحیح نقشہ اسکی زبان سے ظاہر ہوگا وہ صحیح صحیح سب کچھ کہہ دے گی" الیاس نے کہا، اسکے بعد مہمان الیاس کی بیوی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسی مہمان نے اُس سے پوچھا "کہو موجودہ زندگی گزشتہ خوش حالی کے مقابلہ میں کیسی ہے؟" الیاس کی بیوی نے جواب دیا "میں نے اپنے شوہر کے ساتھ پچاس سال تک نہایت دولتمندی سے عمر بسر کی اور مجھے سچی خوشی ایک دن بھی حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن یہ دو سال جو محنت مزدوری کر کے گزارے ہیں اس میں ہمیں سچی خوشی نصیب ہوئی اور ہم اس زندگی کو دوسری زندگی سے بہتر سمجھتے ہیں"

مہمان اس گفتگو سے متحیر ہوئے اور مہمان سے زیادہ آقا اس گفتگو سے متعجب ہوا۔ اور اس تعجب میں اس نے اس چلمن کو اس کے سامنے سے ہٹا دیا جس کی آڑ میں وہ گفتگو کر رہی تھی، جیسے ہی اس کے سامنے سے چلمن ہٹی وہ فوراً ادب کے ساتھ کھڑی ہوگئی اور اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ شوہر بھی اسے دیکھ کر مسکرایا۔ پھر اس نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں سچ کہتی ہوں کہ نصف صدی تک ہم خوشی کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ جب تک ہم دولتمند رہے، ہم اصلی خوشی سے محروم رہے، اب جب کہ ہمارے پاس کچھ نہیں اور ہم محنت مزدوری کرکے زندگی بسر کر رہے ہیں تو ہمیں وہ خوشی نصیب ہے جس کے بدلہ میں ہم دنیا کی اور کسی چیز کو پسند نہیں کرسکتے"۔ "کیا چیز تم کو خوش رکھتی ہے" مہمان نے سوال کیا، اس نے جواب دیا کہ "جب ہم دولت مند تھے تو میں اور میرا شوہر تفکرات میں اس قدر مبتلا رہتے تھے کہ ہم کو موقع نہیں ملتا تھا کہ ہم چار گھڑی آپس میں گفتگو کریں، یا سنجیدگی سے کسی معاملہ پر غور کریں یا کبھی خدا تعالیٰ کی عبادت کریں ملنے والے آتے تو ہم لوگ اس پر غور کرتے کہ کون بہتر سے بہتر کھانا کھلایا جائے، کونسا اچھے سے اچھا تحفہ ان کی نذر کیا جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص ہمیں بدنام کرے جب ہم اچھا تحفہ نذر کرتے، بہتر سے بہتر دعوت کرتے تو پھر دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہوتے۔ کبھی ہمیں یہ خوف رہتا کہ کسی وقت رات کو بھیڑیئے ہمارے جانوروں پر حملہ نہ کردیں۔ اسی قسم کے اور بیسیوں غم تھے جن کی وجہ سے ہم پریشان رہتے تھے، اس کے علاوہ میں اپنے شوہر سے خوش نہ رہتی جس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ جس کام کو میرا شوہر ٹھیک سمجھتا تھا میں اُسے بُرا سمجھتی، اور اکثر معاملات میں اس سے اختلاف رکھتی، یہاں تک کہ آپس میں رنجشیں پیدا ہوجاتیں اور ہم گناہ کے مرتکب ہوتے۔ لیکن اب میں اور میرا شوہر جب صبح سویرے اُٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، اب ہم آرام سے ہیں۔ کوئی معاملہ نہیں جس میں ہم دونوں کو اختلاف پیدا ہوا ہو اور جھگڑتے ہوں کوئی فکر نہیں ہوتی مگر صرف یہ کہ اپنے آقا کی کس طرح بہتر طور سے خدمت کی جائے کہ وہ خوش رہے۔ ہم دل سے کام کرتے ہیں تاکہ ہماری موجودگی سے ہمارے آقا کو نقصان نہ ہو بلکہ سراسر فائدہ ہو۔ ہمارے کھانے کے لئے اپنی غذا پہننے کے لئے کپڑا مل جاتا ہے۔ گفتگو کرنے کا موقع ملتا ہے، عبادت کرنے کو جی چاہتا ہے اور دل سے عبادت کرتے ہیں، پچاس برس سے جس خوشی کی تلاش تھی وہ خوشی نصیب ہے"

مہمان اس گفتگو سے ہنس پڑے، الیاس کو ان کی ہنسی بُری معلوم ہوئی، اس نے کہا واقعتاً یہ بالکل سچ کہتی ہے۔ ہم سچ مچ غلطی پر تھے جب ہم اپنی دولت کے کھونے پر افسوس کرتے تھے۔ لیکن اب ہم اس زندگی سے خوش ہیں۔

آزادی

جان اسٹورٹ مل کی کتاب "لبرٹی" کا ترجمہ جو مکتبہ جامعہ، دہلی سے مل سکتا ہے اس کا پڑھنا ہر آزادی خواہ کے لئے ضروری ہے۔

دنیائے سائنس کے روشن تارے

لووازئی اے

ٹھیک اُس زمانہ میں جب کہ مغلیہ سلطنت کمزور ہوکر پارہ پارہ ہوچکی تھی، ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی خودمختار سلطنتیں ایک دوسرے سے دست وگریباں ہوکر مادرِ وطن کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا رہی تھیں۔ یورپ کے سیاسی گہوارہ میں اگر ایک طرف ایک انقلابِ عظیم آہستہ آہستہ نشوونما پا رہا تھا تو دوسری طرف اس براعظم کے حکماء اپنی تحقیقات اور اکتشافات سے سائنس کی فضا میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ملک فرانس بجا طور پر فخر کر سکتا ہے کہ اُس نے دو ایسے سپوت پیدا کئے جن میں سے ایک نے براعظم یورپ پر قبضہ کرکے نپولین اعظم کا لقب حاصل کیا۔ اور دوسرے نے، دنیائے سائنس کی فضا سے فلوجسٹن کے تاریک پردہ کو چاک کرکے اپنے لئے "کیمیائے جدید کے موجد" کا لقب حاصل کیا۔

"کیمیائے جدید کے موجد" کے حالات معلوم کرنے سے قبل تم لوگ یقیناً لفظ فلوجسٹن کے معمہ کا حل پڑھنا زیادہ پسند کروگے حقیقت بھی یہی ہے کہ "لووازئی اے" کے کارناموں کی صحیح قدر وقیمت اس وقت معلوم ہوسکتی ہے جب کہ نظریہ فلوجسٹن کی حقیقت ہمارے سامنے آجائے۔

لفظ "فلوجسٹن" یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "جلا ہوا" یہ سوال کہ چیزیں جلتی کیسے ہیں، قدماء سائنس کے نزدیک اتنا ہی باعث تشویش اور طالب تحقیق تھا جتنا کہ سترہویں یا اٹھارہویں صدی کے ترقی یافتہ سائنس داں کے لئے۔ یونانی حکیم افلاطون کے خیال کے مطابق جلنے والی چیزیں اس لئے جلتی ہیں کہ اُن میں احتراق پذیر یعنی جلنے والا ایک جز ہوتا ہے، لیکن یہ ایک بے معنی سے بات تھی ۷۷۶ء میں ایک مسلمان سائنس داں جابر ابن حیان نے جلنے کی وجہ گندک کی موجودگی بیان کی، اُس کا خیال تھا کہ جہاں کہیں شعلہ اور حرارت پائی جائے وہاں گندک کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح بعد کے زمانہ کے کیمیا دانوں نے 'فکر ہر کس بقدر ہمت اوست' کے مطابق اس مسئلہ پر اپنے اپنے خیالات پیش کئے۔ بالآخر ۱۷۲۳ء میں جرمنی کے شاہی طبیب 'جی ای سٹاہل' نے جلنے کے متعلق اپنے خیالات کچھ فلسفیانہ انداز میں پیش کئے۔ جو نظریہ فلوجسٹن کے نام سے اب تک کتابوں میں موجود ہیں یہ نظریہ آہستہ آہستہ یورپ کے تمام کیمیا دانوں کا عقیدہ بن گیا اور تقریباً پون صدی تک انکی عقلوں پر سیاہ پردہ کی طرح چھایا رہا۔ انگلستان کے کیمیا داں، پرسٹلے اور کوینڈش (جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) تو ایسے معتقد ہوئے کہ مرتے دم تک اسٹاہل کا کلمہ پڑھتے رہے۔ آخر نظریہ فلوجسٹن کیا ہے۔ ناظرین کی آسانی کے لئے ہم اس کا لب لباب ایک مکالمہ کی صورت میں درج کرتے ہیں،

شاگرد کوئلہ، لکڑی، تیل، چربی، اور دوسری اشیاء کے جلنے کی کیا وجہ ہے؟

اشاہل یہ سب چیزیں اس لئے جلتی ہیں کہ ان میں ایک مادہ فلوجسٹن ہوتا ہے ان اشیاء میں سے فلوجسٹن کے علیحدہ ہوجانے یا نکل جانے کا دوسرا نام جلنا ہے۔ جس چیز میں سے فلوجسٹن جلدی خارج ہوتی ہے وہ زیادہ تیزی سے جلتی ہے، مثلاً تیل، اور جس سے آہستہ آہستہ نکلتی ہے وہ آہستہ جلتی ہے، جیسے لکڑی۔

شاگرد۔ آگ اور جلنے والی تمام چیزوں میں فلوجسٹن ہوتا ہے اور اُسی کی وجہ سے جلتی بھی ہیں تو پھر اُنکی ظاہری شکل وصورت اور دوسری خاصیتوں میں کیوں فرق پیدا ہوتا ہے؟

اشاہل۔ دو چیزوں کی ظاہری شکل وصورت کے اختلاف کی وجہ سے ہر چیز میں فلوجسٹن اور دوسرے اجزا کی کمی بیشی ہے۔

شاگرد۔ اکثر دھاتوں کو اگر جلایا جائے تو وہ راکھ کی مانند ہوجاتی ہیں جن کو کشتہ کہتے ہیں آخر سونے چاندی، پارہ جیسی دھاتوں میں مٹی سے کیا واسطہ، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی سخت دھاتیں جل کر خاک ہوجاتی ہیں؟

اشاہل۔ بھائی علم کیمیا کا مسئلہ ہے۔ خیر سنو! تمام دھاتیں مرکب ہوتی ہیں۔ جن کا ایک جُز فلوجسٹن ہوتا ہے جب ہم کسی دھات کو ساڑتے ہیں تو فلوجسٹن اُن میں سے نکل جاتا ہے، اور راکھ کا جُز باقی رہ جاتا ہے اب اگر ہم اس راکھ میں فلوجسٹن کو کسی طرح دوبارہ داخل کردیں (مثلاً کوئلہ یا لکڑی میں ملا کر گرم کرنے سے) تو پھر چمکدار دھات بنجاتی۔

شاگرد۔ شکریہ۔ احتراق کی وجہ تو اب میری سمجھ میں آگئی۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ ہمارے جسم میں کہاں سے آتی ہے؟

اشاہل یہ تو جان گئے کہ فلوجسٹن کے کسی چیز کے خارج ہونے کا نام جلنا یا حرارت پیدا کرنا ہے، اچھا تو جب ہم سانس لیتے ہیں تو فلوجسٹن نتھنوں کے ذریعہ ہوا میں خارج ہوجاتی ہے جس سے ہمارے جسم میں حرارت پیدا کرتا ہے۔ الغرض فلوجسٹن کا حصول اور اخراج مادی چیزوں میں بڑے بڑے کیمیاوی تغیرات پیدا کردیتا ہے۔

نظریہ فلوجسٹن کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد آؤ ذرا اُس شخص کے حالات معلوم کریں جس نے اپنی خداداد ذہانت سے اس نظریہ کی دھجیاں اڑا کر اپنے زمانہ کے حکماء کے لئے جو احتراق کے سبب کی جستجو میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے، مشعل ہدایت کا کام دیا ہے۔

اس کا نام "ان ٹانی لاری اِٹ لوازی ائے تھا پیرس میں ۱۷۴۳ء میں پیدا ہوا۔ اس کا ارادہ وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کا تھا، لیکن ایک باثر استاد کی تعلیم نے اُس کو سائنس کے مطالعہ کی طرف متوجہ کردیا۔ سب سے پہلے اُس نے جپسم (ایک قسم کی کھریا مٹی) پر تحقیقات کرکے اُسکو گندک کے تیزاب اور چونے کا مرکب ثابت کیا اور اسی کے متعلق ایک مقالہ لکھ کر پیرس کی سائنس اکاڈمی کو بھیجا دوسرے سال (شہروں میں روشنی کا انتظام) کے عنوان پر ایک مضمون لکھنے پر اُس کو اکاڈمی کی طرف سے ایک تمغہ ملا۔ تین سال کے بعد وہ اکاڈمی کا رکن منتخب ہوگیا۔ اسی سال وہ ایک ایسی جماعت کا رکن بنا جس کے پاس حکومت کی طرف سے ایک مقررہ رقم کے عوض لوگوں سے کچھ محصولات وصول کرنے کا اجارہ تھا۔ اسی جماعت کی رکنیت آخر کار اُسکی موت کا باعث ہوئی چنانچہ ایک مصنف نے لکھا ہے کہ لوازی لے نے مختلف اعزاز حاصل کرکے بظاہر شہرت کی سیڑھی کے پہلے زینہ پر قدم جمایا لیکن نادانستہ طور پر اُس کا یہ قدم پھانسی کے تختہ پر پڑا۔"

فرانس اُس وقت عجیب وغریب معاشی اور سیاسی حالات سے گزر رہا تھا اُس کے کسانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ زمینداروں

کے مظالم سے وہ تنگ آچکے تھے، زمین کی زرخیزی اتنی گھٹ چکی تھی کہ بیج کی مقدار سے صرف پانچ گنا زیادہ غلہ فصل کے بعد آتا تھا۔ چنانچہ زمین اور کاشتکاروں کی حالت سدھارنے کے لئے حکومت نے ایک زراعتی کمیٹی قائم کی اور "لوازی اے" اس کا سکرٹری منتخب ہوا۔ اس حیثیت میں اُس نے ملک کی نہایت ہی بیش قیمت خدمات انجام دیں تجربہ کے لئے زراعتی فارم قائم کئے۔ کسانوں کے آلات کاشتکاری میں مفید ترمیمیں کیں، اضلاع میں چقندر اور آلو کی کاشت کو رائج کیا اسپین سے عمدہ بھیڑیں منگوا کر اپنی ملک کی بھیڑوں کی نسل سدھاری، زمینداروں کو کاشتکاروں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے کی توجہ دلائی، اُس کی انتھک کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ سال کے عرصہ میں زمین بیج کی مقدار سے دس گنا سے زائد غلہ پیدا کرنے لگی، کچھ عرصہ بعد وہ "کمیون آف پیرس" کا رکن اور بالآخر اُس کا سکرٹری منتخب ہوا۔ یہ زمانہ فرانس کے تاریخی انقلاب کا زمانہ تھا۔ "کمیون آف پیرس" کی رکنیت قوم اور وطن کی دشمنی کے ہم معنی سمجھی جاتی تھی۔ عوام اس مجلس کے سخت خلاف تھے اُس کا ہر رکن قوم اور ملک کا غدار سمجھا جاتا تھا۔ اس موقعہ پر "لوازی اے" نے اپنے آپ کو انقلاب کی کالی گھٹاؤں میں گھرا ہوا پایا۔ عین اُس زمانہ میں حکومت کی طرف سے "بین الاقوامی" استعمال کے لئے اوزان اور پیمانے وضع کرنے کے لئے ایک مجلس قائم ہوئی لوازی اے اُس کا سکرٹری اور خازن مقرر ہوا۔ انقلابی تحریک اس وقت اپنے شباب پر تھی ایک قومی مجلس مشاورت قائم ہو چکی تھی، اس مجلس کے بہت سے رُکن نہ صرف اوزان اور پیمانوں والی مجلس کے خلاف تھے بلکہ پیرس کی سائنس اکاڈمی کا بھی وہ خاتمہ دیکھنا چاہتے تھے، "لوازی اے" کے دشمن چاروں طرف سے اُس کو دق کرنے اور پھانسی کے تختے پر پہنچانے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ مصائب کی گھٹائیں اسکو چاروں طرف نظر آرہی تھیں، لیکن باایں ہمہ "لوازی لئے" کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی وہ اپنی تحقیقات میں برابر لگا رہا۔ آخر کار اُس کے دشمنوں نے اُس پر ملکی غدار ہونے کا الزام لگا دیا اُس کو گرفتار کرا دیا۔ پیرس کی متعدد علمی مجلسوں نے لوازی اے کی رہائی کے لئے رحم کی درخواستیں پیش کیں کہ اس سائنسداں کو علمی خدمات کیلئے رہا کر دیا جائے۔ لیکن قومی عدالت نے نہایت لاپرواہی سے جواب دیا کہ "جمہوریہ فرانس کو کسی سائنسداں کی ضرورت نہیں ہے"۔

لوازی اے اور اُس کے ساتھیوں پر ملکی غداری کا الزام لگا کر ۲۴ گھنٹے کے اندر پھانسی پر لٹکا دینے کا فیصلہ قطعی قومی عدالت کی طرف سے صادر ہوا۔ چنانچہ ۹ مئی ۱۷۹۴ء کو "کیمیائے جدید کا موجد" ۵۱ برس کی عمر میں عالم جاودانی کو سدھارا۔ اس حادثہ کی خبر جب یورپ میں پھیلی تو کوئی علمی مجلس ایسی نہ تھی کہ جس نے رنج و افسوس کا اظہار نہ کیا ہو اس خبر کو سُن کر ایک علم دوست شخص نے جن الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا وہ لوازی اے کی فطری ذکاوت اور علمی قابلیت کا کافی ثبوت ہیں:۔

"اس سر کو قلم کرنے کے لئے صرف ایک لمحہ کافی ہوا
لیکن اُس جیسا دوسرا شخص پیدا کرنے کے لئے ایک
صدی بھی ناکافی ہوگی"۔

لوازیئے اپنے زمانہ کا ایک ممتاز شخص تھا اس کی قابلیت کا تمام یورپ معترف تھا۔ جس طرح نپولین اپنے انتہائی قوت کے زمانہ میں دنیائے سیاست کا مختار کل تھا اسی طرح لوازیئے شہرت کے بام بلند پر پہنچ کر دنیائے سائنس کا مختار کل بنا۔

ملہ اس فرانسیسی نام کا صحیح املا یہ ہے۔
"Lavoisier"

براعظم افریقہ

تم نے افریقہ کا نام تو سنا ہوگا اور تمھیں شاید یہ بھی معلوم ہوگا کہ لوگ اسے "تاریک براعظم" کہتے ہیں۔ جہاں سورج اور روشنی نہ پہنچے وہ جگہ تاریک کہلاتی ہے، کیا افریقہ کو تاریک اس واسطے کہتے ہیں کہ وہاں سورج نہیں چمکتا نہیں اس کی وجہ اور ہے۔ جتنی تیزی کے ساتھ سورج وہاں چمکتا ہے دنیا میں اور

کسی جگہ نہیں چمکتا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ کوئی سو سال تک اس براعظم کے بڑے حصہ کے متعلق لوگوں کو کچھ معلوم نہ تھا اور نہ لوگ اس کے معلوم کرنے کی جرأت کرتے تھے کیونکہ اس کا اندرونی حصہ بڑا خطرناک تھا۔ سفر کرنے کے صرف دو ذرائع تھے ایک کشتی سے اور دوسرے پا پیادہ دلدل میں۔ اب بہت سے حصوں میں ریلیں بن جانے کی وجہ سے بہت سی مشکلات دور ہوگئی ہیں، لیکن اب بھی سیاحوں کو بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بڑے بڑے گھنے جنگلوں میں سے گزرنا ہوتا ہے جن میں خوفناک درندے اور زہریلے جانور رہتے ہیں۔ بہت سے صحراؤں کو عبور کرنا پڑتا ہے جہاں پانی کا ملنا ناممکن ہے۔ آدمی چلا جاتا مرجاتا ہے لیکن ایک قطرہ پانی نہیں ملتا۔

حضرت مسیح سے کئی سو سال قبل سیاح چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر سوار ہوکر افریقہ کے ساحل کے آس پاس گھوما کرتے تھے۔ "ہیروڈوٹس" جو یونان کا بہت بڑا مورخ ہے اس کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح سے چھ سو سال پہلے ایک سیاح افریقہ کے اندرونی حصہ کا حال معلوم کرنے کے لئے اس کے ساحل کے ارد گرد پھرا تھا وہ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ ہم یقینی طور سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس کے بعد سے سیاحوں نے ہمت کی لیکن اندرونی حصہ میں جانے کی جرأت کوئی نہیں کرتا تھا۔

اگر تم افریقہ کا نقشہ میں دیکھو تو تمھیں دریائے نیل بحیرہ روم میں گرتا ہوا دکھائی دے گا۔ قدیم زمانے میں اس دریا کے آس پاس لوگ رہتے تھے جن کو مصری کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ بہت عقلمند اور تہذیب یافتہ تھے۔ جب یونان اور روم جیسے مہذب ملکوں کے رہنے والے ابھی جنگلیوں کی طرح

زندگی بسر کرتے تھے۔ ان لوگوں نے بڑی بڑی مشہور عمارتیں بنائیں۔ وہ اینٹ رکھنا بھی جانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ باقی تو میں بالکل وحشی ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود انھوں نے افریقہ کا کوئی حصہ دریافت نہیں کیا۔

ان مصریوں کے زوال کے بعد فینیقی بادشاہ برسرِ حکومت آئے یہ سفر و سیاحت کے بہت شائق تھے۔ یہ کشتیوں پر سوار ہو کر انگلستان بھی گئے تھے۔ اس زمانے میں انگریز بالکل وحشی تھے۔ اتنی دور تو چلے گئے لیکن انھیں بھی اپنے ملک کے اندرونی حصہ میں جانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

ان بادشاہوں کے بعد یونانیوں اور رومیوں کی حکومت ہوئی لیکن ان لوگوں نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی جس حصہ میں یہ لوگ رہتے تھے ہیں اس کا نام افریقہ تھا۔

اس سیاح کے بعد جس کا ذکر ہیرو ڈوٹس نے کیا ہے، واسکوڈی گاما دوسرا شخص ہے جس نے افریقہ کے اردگرد چکر لگایا۔ آخر کار یورپ کے سیاح آکر افریقہ کے سواحل پر رہنے لگے اور انھوں نے نئی معلومات حاصل کرنا شروع کیں لیکن بہت عرصہ تک کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ ۱۷۷۰ء میں ایک دلیر سیاح جیمس بروسی نامی نے "ابی سینیا" کا ملک دریافت کیا۔

اس وقت جو بادشاہ ابی سینیا پر حکمراں تھا وہ بہت ظالم تھا اور اس کی رعایا بھی ظلم و ستم میں اس سے کم نہ تھی۔ انھوں نے بروسی کو مار ڈالا ہوتا لیکن اس نے شاہی خاندان کے بہت سے لوگوں کو اچھا کیا جس سے بادشاہ اور اس کی ملکہ دونوں اس سے بہت خوش تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے اور لوگ بھی اس کے طرفدار اور ہمدرد بن گئے۔ انھوں نے بندوق کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ یہ اڑتے ہوئے پرندہ کو مار لیتا ہے تو وہ سمجھے کہ یہ کوئی جادوگر ہے۔ لیکن وہ اور بھی حیران ہوئے جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ جنگل کے وحشی گھوڑوں کو بھی رام کر لیتا ہے۔ انھوں نے اس کو ایک بہترین گھوڑا سوار ہونے کے لئے دیا۔

بادشاہ نے اس کے ان کمالات سے خوش ہو کر اُسے ایک حصہ کا گورنر بنا دیا لیکن وہ تو اور آگے جانا چاہتا تھا۔ اس نے بڑی دقتوں کے ساتھ دریا کا ایک منبع معلوم کیا جس کے متعلق اسے یقین تھا کہ وہ دریائے نیل کا ہے لیکن وہ اس نیل کا نہیں تھا بلکہ نیل اخضر کا تھا جو اس کا معاون دریا ہے۔ جب وہ واپس ہوا تو بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ وہ وحشیوں کے ملک سے ہو کر گذرا جو اس کا خاتمہ کر دیتے اگر بروسی عجیب طریقوں سے اپنے آپ کو نہ بچاتا۔ آخر کار وہ صحیح و سلامت ساحل پر پہنچ گیا اور اپنے وطن انگلستان کی راہ لی اور وہاں ایک کتاب اپنے اس سفر کے متعلق لکھی لیکن لوگوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ انھوں نے کہا دنیا میں نہ کوئی ایسا ملک ہے اور نہ ایسے لوگ موجود ہیں۔ آخر چالیس سال کے بعد ایک اور شخص ابی سینیا آپہنچا اور جو کچھ بروسی نے کہا تھا اُسے سچ پایا۔ تب لوگوں کو اس کا یقین ہو گیا لیکن اس وقت بروسی مر چکا تھا۔

منگو پارک نامی ایک اور شخص نے بھی بہت سی مفید باتیں معلوم کیں وہ اسکاٹ لینڈ میں ڈاکٹر تھا لیکن مختلف ملکوں کے سفر نے اس کے دل میں افریقہ جانے کا شوق پیدا کیا۔ پارک پہلی ہی بار مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ جنگلیوں نے اسے پکڑ کر قید کر دیا لیکن کسی نہ کسی طرح سے وہ بچ تو گیا لیکن بیمار ہو گیا۔ وہ مرنے ہی چکا ہوتا لیکن خیر سے ایک جنگلی نے اُسے ساحل تک پہنچا دیا۔ چند سال کے بعد اس نے پھر اپنا کام شروع کر دیا۔ اس وقت اس کے ساتھ ۴۵ آدمی تھے لیکن چلتے چلتے جب وہ دریائے نائیجر کے کنارے پہنچا تو صرف ۸ آدمی رہ گئے تھے۔ اس نے اپنا ایک مختصر سا سفر نامہ لکھ کر انگلستان بھیج دیا اور اس دریا کی راہ سفر کرنا شروع کیا لیکن اتفاق سے اس کی کشتی ایک چٹان سے ٹکرائی اور ٹوٹ گئی۔ وہ ابھی اسے درست ہی کرنا چاہتے تھے کہ جنگلیوں نے حملہ کر کے لے لیے اور اس کے سب ساتھیوں کو مار ڈالا۔

اس کے بعد ایک اور آدمی ہیں کلیپرٹنی نے ہمت کی۔ یہ ایک غریب شخص کا لڑکا تھا۔ اس نے دریائے نائیجر کا منبع معلوم کرنا چاہا۔ لیکن اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر اس نے اور مفید باتیں معلوم کیں اس کے ساتھ اور بھی کئی آدمی تھے جن میں اس کا ایک نوکر اور ڈینیڈ بھی تھا راستے میں سوائے نیڈر کے سب مر گئے۔ نیڈر بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کر کے انگلستان پہنچا اور جو معلومات حاصل کی تھیں ان کو جمع کر کے ایک کتاب کی صورت دی اب تک جتنا علاقہ معلوم ہوا تھا اس کا ایک نقشہ

بھی بنایا تاکہ کہیں سیاح بھول نہ جائیں۔

اس کے بعد لونگ سٹن نے براعظم کا بہت بڑا حصہ دریافت کیا۔ اس نے جھیل وکٹوریہ کا بھی پتہ چلایا جو ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ اس نے ارادہ کیا کہ جھیل کے ارد گرد کا پورا علاقہ چھان مارنا چاہئے۔ اس کام میں اسے چار سال لگے۔ جھیل کے مغرب کی طرف سے ہوتا ہوا وہ بحر ظلمات تک پہنچ گیا اور پھر مشرق سے ہوتا ہوا بحر ہند تک چلا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دین مسیحی کی تبلیغ کا کام بھی کرتا جاتا تھا۔ اس کو کئی کئی دن تک کھانا میسر نہیں آیا لیکن اس نے ذرا بھی ہمت نہیں ہاری۔

چار سال کے بعد آرام کی خاطر وہ انگلستان گیا اور چند مہینوں کے بعد افریقہ واپس لوٹ آیا۔ یہیں اس کی بیوی کا انتقال ہوا۔ جس سے اس کو صدمہ تو بہت ہوا لیکن اس نے صبر اور ہمت سے کام لیا۔ اس دفعہ اس نے کئی جھیلوں کا پتہ چلایا اور ایسے مقامات معلوم کئے جہاں کی آب وہوا نہایت اچھی تھی اور یورپ کے باشندے وہاں رہ سکتے تھے۔ دوسری دفعہ پھر انگلستان جاکر وہ واپس آیا لیکن اب کی سخت بیمار ہوگیا اور آگے جانے کے ارادے سے رکنا پڑا۔ ایک تو بیماری دوسرے فاقہ، بیچارا ادھ مرا ہوگیا۔ آخر ایک آدمی اس کے لئے کھانا اور دوائیں لے کر پہنچا۔ اس وقت وہ بالکل کمزور تھا۔ جب اس کو کامل صحت ہوگئی تو پھر اپنا کام شروع کیا یہاں تک کہ بالآخر اسی راہ میں جان دے دی۔ بڑی بڑی مشکلوں سے اس کی لاش چھپا کر زنجبار اور وہاں سے انگلستان بھیجی گئی۔ اور یہ نامور سیاح ویسٹ منسٹر ایبے میں دفن ہوا جو انگلستان میں شاہی خاندان کا بہت بڑا قبرستان ہے۔

لونگ سٹن کے انتقال سے قبل ایک اور سیاح کو اس کی تلاش میں بھیجا گیا تھا۔ اس کے دوست احباب اس کی کوئی خبر نہ پاکر بے چین تھے۔ ایک امریکن نے اپنے ایک نوکر اولینڈ کو اس کی تلاش میں بھیجا۔ اولینڈ زنجبار اترا اور وہاں تک پہنچ گیا جہاں لونگ سٹن بیمار تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑے تپاک سے ملے۔ لونگ سٹن اپنے ایک ہم قوم کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اولینڈ نے اسے بہت سا کھانا اور پانی دیا اور اس سے مل کر امریکہ واپس چلا گیا تاکہ اس کے دوستوں کو یہ خوش خبری سنائے۔

اس کے بعد پھر یہ نوجوان سیاح افریقہ گیا اور دریائے کانگو کا پتہ لگایا۔ اس نے جھیل ٹینگانیکا کے گرد بھی چکر لگایا۔ تیسری مرتبہ پھر وہ ایک جرمن سیاح کو بچانے کے لئے افریقہ گیا۔

اس کے علاوہ اور بہت سے سیاحوں نے یہاں کی نئی نئی چیزیں دریافت کیں۔ "سپیک" اور "گرانٹ" نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر کئی جھیلیں معلوم کیں۔

اس کے بعد انگریزوں، فرانسیسیوں اور بلجیم والوں نے ساحل پر اپنی اپنی نوآبادیاں قائم کرلیں اور وہاں سے اندرونی حصے معلوم کرتے رہے۔

اگرچہ افریقہ کے بہت سے حصے معلوم ہوچکے ہیں لیکن ابھی پورے طور پر اس براعظم کے حالات معلوم نہیں ہوئے ہیں افریقہ یورپ سے تین گنا بڑا ہے اور اس کے بعض حصوں میں ایک دن میں آدمی صرف چند میل سفر کرسکتا ہے۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ تھا جو پیام بھائیوں کے سامنے پیش کردیا گیا ہے۔ انشاء اللہ مشہور مشہور سیاحوں کے حالات بھی لکھے جائیں گے کہ کس طرح وہ افریقہ کے اندرونی حصوں میں گئے اور کیسی کیسی مشکلات انھیں پیش آئیں۔

(بقیہ مضمون فاطمہ اور رحیم الدین صفحہ ۹)

انسان کو پہلے اس پر مجبور کرتی ہے کہ وہ بڑے غولوں میں رہے اور جب بستیاں قائم ہوتی ہیں تو یہی ضرورت لوگوں کو ایک جگہ رکھتی ہے اور جیسے درخت کی جڑ زمین کے اندر گھس کر اسے مضبوط پکڑ لیتی ہے ویسے ہی انسان کی زندگی بستیوں میں جڑ پکڑ لیتی ہے۔ لیکن بستیوں میں رہنے سے ایک نئی دشواری پیدا ہوجاتی ہے۔ تم نے کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ کیا ہے

فاطمہ اور رحیم الدین دونوں کچھ دیر سوچتے رہے، مگر ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ دشواری کیا ہوسکتی ہے۔ بستی میں آدمی کے پاس کھانے پینے کو کافی ہوتا ہے، پہننے کو کپڑے اور رہنے کو گھر۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔

(باقی آئندہ)

کوائف جامعہ

جمعہ جنوری سنہ ۳۲ء کو امیر جامعہ جناب ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب کانگریس کی مجلس عاملہ کے رکن ہونے کی وجہ سے گرفتار کرلئے گئے۔ شہر میں آپ کی گرفتاری پر فوراً ساری دکانیں بند ہوگئیں۔ فوراً ہی آپ کے مقدمہ کا فیصلہ بھی ہوگیا۔ آپ کو چھ ماہ قید اور دو سو روپئے جرمانے کی سزا دی گئی ہے اور بصورت عدم ادائیگی جرمانہ ۱/۲ ۱ ماہ قید میں اور اضافہ ہوجائے گا۔

ڈاکٹر صاحب اپنی اس عزت افزائی اور بےمثال قربانی پر قابل صد مبارکباد ہیں۔

، رجنوری کو جامعہ کی اردو اکادمی کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں جناب سید وہاج الدین صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے "نفسیات مذہب" پر ایک نہایت پرمغز اور فاضلانہ مقالہ پڑھا۔ جلسہ کی صدارت جناب خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڑھ نے فرمائی۔ جناب صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں یہ بتایا کہ قوم کی علمی زندگی میں اکادمی کا کیا درجہ ہوتا ہے اور جامعہ اپنے تعلیمی کام کے ساتھ اس اکادمی کے ذریعے کس طرح اردو کی مفید خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس کے بعد پروفیسر وہاج الدین صاحب نے اپنا فاضلانہ مقالہ شروع کیا جو نفسیات مذہب کے جیسے خشک اور ٹھوس علمی مسائل کے ساتھ ساتھ ادب و انشاء کی چاشنی سے بھی پر تھا۔ آپ نے نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا کہ مذہبی میلان پیدا کرنے کے لئے انسان کے اندر کیا کیا نفسیاتی عنصر کام آتے ہیں۔ آپ ایک طرف امریکہ کے ماہرین نفسیات کے حوالے دیتے اور دوسری طرف ان کی تائید میں حالی اکبر اور سعدی کے اشعار پیش کرتے جاتے جس سے اس مقالے کی ایک خاص خصوصیت ہوگئی تھی۔ اخیر میں جناب شیخ الجامعہ صاحب نے فاضل مقالہ نگار اور جناب صدر کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ جامعہ کے لوگوں کا یہ دستور ہے کہ وہ اپنے کاموں کی ابتدا بہت چھوٹے پیمانے سے کرتے ہیں لیکن مقصد بہت بڑا اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ چنانچہ اکادمی کے مقالہ نگار اور صدر کے انتخاب میں بھی انھوں نے اپنے اس اصول کو مدنظر رکھا ہے۔ لیکن امید ہے کہ اس حقیر ابتداء سے اکادمی کے اعلیٰ مقاصد پورے ہوں گے۔

جنوری کی ابتدائی تاریخوں میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے طلبہ کی ایک جماعت بغرض سیاحت دہلی آئی ہوئی تھی۔ اس موقع پر جامعہ کے طلبائے کالج کی "انجمن اتحاد" نے اپنے برادرانہ تعلق کی بناء انھیں ایک دن افطار اور کھانے پر مدعو کیا اور اس سلسلے میں انھیں جامعہ کے مختلف شعبوں اور کاموں کو دیکھنے کا موقع دیا۔ اس ضیافت کے موقع پر "انجمن اتحاد" کے نائب صدر رئیس احمد صاحب ندوی نے ان لوگوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایک نہایت اچھی تقریر کی۔ اس تقریر میں آپ نے فرمایا کہ اس وقت ملک میں دو ادارے ہیں جنھوں نے اپنی اپنی نوعیتوں سے ہندوستان کی تعلیمی دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا ہے۔ ان اداروں میں سے ایک جامعہ عثمانیہ ہے جس نے اردو زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دے کر اردو کے دامن سے اس کی بے مائیگی اور تہی دامنی کا دھبہ ہمیشہ کے لئے دھو دیا ہے۔ دوسرا ادارہ جامعہ ملیہ ہے جس نے حکومت وقت سے تمام تعلقات منقطع کرکے ایک بہت بڑے تعلیمی اصول کو قائم اور ثابت کیا ہے۔

آج ان ہر دو اداروں کے نوجوانوں کا یہ اجتماع ایک شگون نیک ہے اور ہر دو جامعوں کے آئندہ تعلقات کے استحکام و استواری کی ایک بہت پختہ ضمانت ہے" اس کے جواب میں ان حضرات میں سے ایک صاحب نے اٹھ کر شکریہ ادا کیا اور جامعہ کے کاموں کو دیکھ کر اپنی صد درجہ پسندیدگی اور حیرت کا اظہار کیا، بالخصوص ابتدائی تعلیم کے حصہ کو جس کے لئے انھوں نے فرمایا کہ جامعہ عثمانیہ اس کمی کو پورا کرنے سے قاصر ہے اور آئندہ اس کے پورا ہونے کی کوئی توقع نہیں۔

قیمت سالانہ
عہ/

قیمت فی پرچہ
۲ر

پیام تعلیم

جلد ۱۱ — یکم مارچ ۱۹۳۲ء — نمبر ۹

فہرست مضامین

طابع و ناشر:۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی — ایڈیٹر:۔ سعید انصاری بی اے (جامعہ) — مطبع جامعہ ملیہ برقی پریس دہلی

کوائف جامعہ

اس سال رمضان میں گو افطار و طعام کی دلچسپیاں پیشتر سے کم رہیں، پھر بھی "بشیر منزل" اور "خاکسار منزل" کے طلبہ نے مل کر ایک روز افطار کا سامان تال کٹورہ پارک میں کیا جو نئی دہلی میں ایک نہایت عمدہ تفریح گاہ ہے۔ بعد افطار و نماز چاندنی رات میں دیر تک نظم خوانی کی مجلس بھی جاری رہی۔

ستائیسویں کی شب کو "بشیر منزل" میں ختم تراویح تھی اس تقریب سے فراغت کے بعد بہت سے لڑکے اس مبارک رات میں جاگے بھی تھے، اور ساری رات نفل اور قرآن خوانی میں بسر کی۔

گزشتہ ماہ کے آخری پنج شنبہ کی چھٹی میں پروفیسر محمد مجیب صاحب کالج کے طلبہ کی ایک جماعت لیکر دہلی کے تاریخی آثار و عمارات کی تحقیق کے لئے گئے تھے اور اس سلسلہ میں آپ نے کچھ کتابوں کی اور کچھ مٹے ہوئے آثار کی مدد سے بعض قدیم عمارتوں کا پتہ معلوم کیا ہے۔ آپ ادھر کچھ عرصہ سے اسی کوشش میں ہیں۔ اس سے پیشتر آپ اپنے بڑے بھائی پروفیسر محمد حبیب صاحب کی معیت میں بھی کچھ تلاش و جستجو کر چکے ہیں۔

جناب شیخ الجامعہ صاحب عید سے دو روز قبل تشریف لے آئے۔ آپکا آنا جامعہ کے بچوں کی عید کا پیام تھا۔ بمبئی میں آپ کی سب سے زیادہ مدد جامعہ کے ایک سابق اُستاذ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید صاحب نے کی جو آج کل تجارتی کاروبار کے سلسلے میں وہاں مقیم ہیں۔ آپ کے بعد جامعہ کے ایک فارغ التحصیل معین الدین حارث صاحب نے مدد کی جو "اجمل" اخبار کے اڈیٹر ہیں۔ اہل جامعہ ان دونوں حضرات کے دل سے شکرگزار ہیں اور امید کرتے ہیں کہ جامعہ سے تمام تعلق رکھنے والے حضرات اس کے ضرورت کے وقتوں میں اسی طرح کام آئیں گے۔

عید کے دن حسب معمول نماز دوگانہ سے فراغت کے بعد ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوا، جو تقریباً شام تک جاری رہا۔ شب میں ۸½ بجے "شریر لڑکا" نامی ڈرامے کا کھیل ہونے والا تھا۔ جو وقت مقررہ پر شروع ہوا۔ اس کھیل میں جامعہ کی برادری کے علاوہ باہر سے بھی کچھ لوگ آئے تھے جنمیں ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب مع مسز سلیم الزماں، صدر معلمہ ماڈرن اسکول دریا گنج، احد حسین صاحب قدوائی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ کوئی خیالی ڈرامانہ تھا بلکہ جامعہ کے مدرسہ اور دار الاقامہ کی زندگی کی ایک سچی تصویر تھی، تمام کھیل لڑکوں نے نہایت خوبی اور صفائی سے انجام دیا جس میں طرار (شریر لڑکا) کا حصہ سب سے زیادہ پسند کیا گیا اور محمد نور خاں متعلم ابتدائی چہارم کو جس نے یہ حصہ کیا تھا جناب احد حسین صاحب کی طرف سے ایک ایک طلائی تمغہ دیا گیا۔

نظر کا دھوکا

(بسلسلہ اشاعت نمبر ۲)

گزشتہ اشاعت میں کئی ایک مثالوں سے یہ بتایا گیا تھا کہ ہماری یہ آنکھیں ہمیں کیسا دھوکا دیتی ہیں، آج دو ایک مثالوں سے اس کی مزید تصدیق ہوگی۔ اس شکل میں دیکھو جہاں سفید پٹیاں

ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں وہاں سیاہ دھبوں کا ایک عجیب وغریب دھوکا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات اُس مقام پر ہرگز نظر نہیں آتی جہاں تم اپنی نظر جما دیتے ہو۔ ان سیاہ دھبوں میں سے جو سفید پٹیوں کے ایک دوسرے کو قطع کرنے کی جگہ پر ظاہر ہوتے ہیں اگر تم ایک طرف دیکھو تو وہ فوراً غائب ہو جاتا ہے لیکن دوسر چاروں طرف نظر آتے ہیں۔ پھر دوسرے دھبہ کو دیکھو تو وہ اپنی باری پر غائب ہو جاتا ہے اور پہلا دھبہ دوبارہ ظاہر ہو جاتا ہے یہ سیاہ دھبے ہماری آنکھوں کے ساتھ گویا آنکھ مچولی کھیلتے ہیں

آنکھ کا یہ دھوکا غالباً سفیدی اور سیاہی دو متضاد چیزوں کے اثر سے پیدا ہوتا ہے۔

اس شکل میں ہم نے ایک مثلث مساوی الاضلاع متعدد دائروں کی پشت پر بنایا ہے۔ مثلث کے اضلاع بالکل مستقیم ہیں مگر نظر یہ آتا ہے کہ بیچ سے جھکے ہوئے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زاویہ حادہ جس قدر کہ فی الواقع ہوتا ہے اُس سے قدرے زیادہ بڑا معلوم ہوا کرتا ہے۔

بعض وقت آنکھ اشکال وحروف کے سائز بھی غلط بتاتی ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی چھپے ہوئے حرف ایس (S) یا ہندسہ 8 کو (یہ حرف وہندسہ ٹائپ کا چھپا ہوا دیکھنا چاہیئے) ان کا اوپر کا حصہ بڑا ہوتا ہے اور نیچے کا چھوٹا لیکن عموماً ہم ان دونو حصوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ اگر یہ اُلٹے چھاپ دئے جائیں یا سیدھے چھپے ہوؤں کو اُلٹا کرکے دیکھا جائے تو ان کے حصوں کی نابرابری کسی قدر تعجب خیز ہوگی۔

بچے موٹروں سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں

آج کل موٹروں کی وجہ سے جتنی جانیں ضایع ہوتی ہیں اور ان میں بھی بالخصوص بچوں کی جانیں جیسی غیر محفوظ ہیں اس کی بنا پر ان کے محفوظ رہنے کی اتنی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ بچوں کے ارد گرد موٹے موٹے تکیے باندھ دیے جائیں۔

یا ایک غبارہ ہو اور وہ اس میں لٹک جایا کریں۔
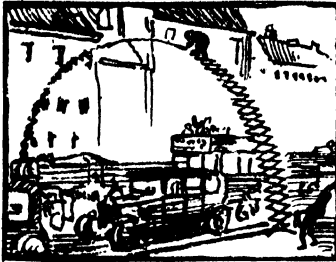
یا وہ سفری پل اپنے ساتھ لے رہا کریں۔

اور جب ضرورت ہو اسے سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر لگا دیں

یا جب موٹر آتے دیکھیں تو زمین کے اندر راستے کھود لیا کریں۔

یا اپنے موٹر آپ چلائیں اور اس کا جو حشر ہوگا وہ آپ کے سامنے ہے۔

ریچھ اور خرگوش کی دوستی

کسی زمانہ میں ایک ریچھ رہتا تھا جس کے بہت سے بچے تھے لیکن ان بچوں کی ماں مر گئی تھی، اس لئے ریچھ کو بہت کام کرنا پڑتا تھا۔ صبح ہوتی اور وہ لکڑیاں چننے کے لئے جنگل چلا جاتا۔ لیکن اس عرصہ میں ان بچوں کی دیکھ بھال کون کرے؟

چنانچہ ریچھ نے یہ سوچا کہ اس طرح کام چلنا دشوار ہے۔ اکیلے میں یہ بچے نہ جانے کیا کریں، آپس میں لڑ جھگڑ کر ایک دوسرے کی آنکھیں نکال لیں، یا کوئی اور جانور آئے اور انھیں جان سے مار ڈالے، اس لئے اس نے طے کیا کہ کسی ایسے دوست کو تلاش کرے جو اس کی غیر حاضری میں اسکے بچوں کی نگرانی کر سکے۔

غرض اس نے کچھ روٹیاں پکائیں اور ایک تھیلے میں بھر کر کندھے پر رکھا اور دوست کی تلاش میں نکلا۔ راستہ میں سب سے پہلے ایک کوا ملا، اس نے ریچھ سے پوچھا "کہو بھائی ریچھ! کہاں چلے؟" ریچھ بولا "کیا پوچھتے ہو میاں کوے! ایک دوست کی تلاش ہے جو میرے بچوں کی کچھ دیکھ بھال کر سکے"۔ لیکن یہ تو بتاؤ تمہارے اس تھیلے میں کیا ہے؟"

"روٹیاں ہیں"

کوے نے کہا "اچھا دیکھو، اگر تم مجھے تین روٹیاں دو تو میں تمہارے بچوں کو کھلانے کے لئے تیار ہوں"

"روٹیوں کا مجھے اتنا خیال نہیں ہے، جتنا اس بات کا کہ آیا تم ان کو بہلا بھی سکو گے یا نہیں" ریچھ نے کہا۔

کوے نے جواب دیا کہ "اس میں کیا دشواری ہے، مجھے تو صرف کائیں، کائیں، کائیں، کرنا ہے اور بس!"

ریچھ نے جھلا کر کہا "تو پھر مجھے ایسے شخص کی ضرورت نہیں ہے" اور یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا چلتے چلتے اسے دوسرا شخص جو ملا وہ ایک گدھا تھا۔ اس نے ریچھ کو جو تھیلا لے جاتے ہوئے دیکھا تو بولا: "کہو بھائی ریچھ کہاں چلے؟"

ریچھ نے جواب دیا "ارے بھائی کیا پوچھتے ہو، ایک ایسے شخص کی تلاش میں جا رہا ہوں جو میرے بچوں ۔

"لیکن یہ تمہارے تھیلے میں کیا ہے؟"

"روٹیاں ہیں"

اچھا تو تین روٹی کا دینے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے بچوں کو کھلانے کے لئے تیار ہوں"

"لیکن تمہیں بڑی دشواری اُٹھانی پڑے گی اور شاید تم کھلا نہ سکو"

"دشواری کی کیا بات ہے!" گدھ بولا اور اپنے خاص انداز میں "قیں قیں" کرنے لگا۔ لیکن ریچھ کو گدھ کی بات پسند نہ آئی اور وہ آگے بڑھا۔

تیسرا شخص جو اسے راہ میں ملا، وہ ایک خرگوش تھا۔ اس نے ریچھ کو دیکھتے ہی پوچھا "کہو بھائی ریچھ! کہاں چلے؟"

ریچھ بولا "کیا پوچھتے ہو، میاں خرگوش، ایک ایسے ساتھی کی تلاش میں جا رہا ہوں جو میری غیر حاضری میں میرے بچوں کی دیکھ بھال رکھ سکے"

"اور اس تمہارے تھیلے میں کیا ہے؟" خرگوش نے پوچھا

"روٹیاں"

"اگر ان میں سے کچھ مجھے دو تو میں تمہارے بچوں کو خوب کھلا سکتا ہوں"

"لیکن تم بچوں کو کھلانا جانتے بھی ہو؟"

"ہاں، ہاں، خوب اچھی طرح" خرگوش بولا اور اس کے بعد کہنے لگا "جب تم چلے جاؤ گے تو میں ان بچوں سے کہوں گا دیکھو تم لڑو مت، ورنہ تمہارا باپ آئے گا تو تمہیں مارے گا۔ وہ جنگل گیا ہے تمہارے لئے پکے پکے بیر اور جنگل کے دوسرے پھل لائے گا۔ اور اسی طرح کی بہت سی باتیں کر کے میں انھیں بہلاؤں گا"۔

ریچھ خرگوش کی باتوں میں آ گیا اور وہ سمجھا کہ اس نے ایک اچھا سودا کیا ہے۔ خرگوش بولا "اچھا اب دکھاؤ کہ اس تھیلے میں کیا ہے؟" ریچھ نے تھیلے کا منہ کھولا اور اس نے اس کے اندر گردن ڈال کر خوب دیکھنا بھالنا شروع کیا۔

جب خرگوش دیکھ بھال چکا تو ریچھ نے تھیلا اس کے سر پر رکھا اور اسے اپنے گھر لے گیا۔ ریچھ کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے جو یہ نیا ساتھی دیکھا تو وہ خوشی کے مارے اِدھر اُدھر اُچھلنے کودنے لگے اور خرگوش بھی ان کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگا۔

فاطمہ اور رحیم الدین

کھانے کے وقت رحیم الدین نے باتوں ہی باتوں میں کہا "اباجان آج میں اسکول سے واپس آرہا تھا تو دو سپاہی کسی قیدی کو لئے جارہے تھے اس کے پیروں میں بیڑیاں پڑی تھیں"۔ فاطمہ کو یہ سُن کر بہت افسوس ہوا اس نے کہا: "تو آخر وہ بیچارہ چلتا کیسے ہوگا؟" "چلنے کو تو وہ اچھی خاصی طرح چل لیتا تھا۔ اور صورت سے بھی وہ ایسا خوفناک معلوم ہوتا تھا میں نے سوچا کہ یہی اس کے لئے ٹھیک ہے۔ نہیں خدا جانے وہ کیا کر بیٹھے گا"

"واہ واہ" فاطمہ نے خفا ہوکر کہا، "اچھے آئے، کسی بیچارے کے پیر میں بیڑیاں پڑیں اور آپ کہیں اچھا ہوا!"

"تم بھی کیسی بے وقوف ہو" رحیم الدین نے ذرا تیز لہجہ میں جواب دیا، "اس نے آخر کچھ کیا ہی تو ہوگا جو اس کے پیر میں بیڑیاں ڈالی گئیں، نہیں تو پولیس والے کیوں آپ ہی آپ کسی کو پکڑ لیتے۔ اس نے ضرور کسی کے ہاں ڈاکہ ڈالا ہوگا یا خون کیا ہوگا!"

فاطمہ کو اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ باپ سے مخاطب ہو۔ اس نے کہا "کیوں اباجان، کیا یہ ٹھیک کہتے ہیں؟"

باپ دونوں بھائی بہن کی گفتگو بہت توجہ سے سُن رہا تھا، مگر وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ انکی گفتگو میں دخل دے جب تک کہ وہ خود اس سے سوال نہ کریں۔ آپ نے کہا:

"ہاں، اس آدمی نے کچھ کیا ہوگا، یا پولیس والوں کو اس پر کسی قسم کا شبہ ہوگا۔"

فاطمہ نے ذرا مایوسی کے لہجے میں کہا: "تو اباجان اب پولیس والے اسے کیا کریں گے؟ کیا مار ڈالیں گے؟"

باپ نے جواب دیا: "یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ گرفتار ہی ہوا تھا یا اسے عدالت نے سزا کا حکم بھی دیدیا تھا۔ قاعدہ تو یہ ہے کہ جب کہیں کوئی جرم ہوتا ہے، اور پولیس والوں کو معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ جرم فلاں آدمی نے کیا ہے تو وہ اسے حوالات میں بند کردیتے ہیں، پھر اس کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا ہے، اور وہاں اگر ثابت ہوگیا کہ واقعی وہی آدمی مجرم تھا تو جرم کی جو سزا قانون نے مقرر کی ہے وہ

گزشتہ نمبر میں بتایا گیا تھا کہ جانوروں اور انسان میں کیا فرق ہے۔ یہ محبت ہے لیکن صرف محبت ہی سے کام نہیں چلتا بلکہ قانون کی بھی ضرورت ہوتی ہے

عدالت کے حکم سے دی جاتی ہے۔"

باپ کا جواب سُن کر فاطمہ چپ ہوگئی۔ مگر جیسے ہی کھانا ختم ہوا وہ باپ کی گود میں آکر بیٹھ گئی اور گلے میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگی: "ابا جان، جب لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سزا ملے گی تو پھر وہ ایسی باتیں کرتے ہی کیوں ہیں؟"

باپ نے کہا "میں یہی کل تم کو سمجھانے والا تھا جب لوگ بستی میں آباد ہو جاتے ہیں اور انکی ساری ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں، تو پھر انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا تم جانتی ہو کہ پیاسے کو پانی پلانا ثواب کا کام ہے، اور اگر کوئی نہ پلائے تو یہ ایک گناہ ہے اور خدا ایسے آدمی سے بہت ناراض ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض کام نیک ہیں بعض بُرے، اور یہ ہمارا دین ہمیں بتاتا ہے کہ کونسا کام نیک ہے اور کونسا بُرا۔ ہم مسلمان ہیں، لیکن جو لوگ مسلمان نہیں ہیں ان کے دین میں بھی نیک اور بد کا فرق کیا جاتا ہے۔ وہ بھی اسے مانتے ہیں کہ نیک کام کا ثواب ملتا ہے اور بد کی سزا۔ مگر اس کی وجہ سے سب آدمی نیک نہیں ہو جاتے۔ خدا نے انسان کے دل میں اس کی صلاحیت پیدا کر دی ہے کہ وہ بُرائی اور بھلائی میں فرق کر سکے، لیکن اس کے ساتھ انسان کو یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ اس کا جی چاہے تو نیکی کرے اور جی چاہے تو اپنی پیٹھ پر گناہوں کا بوجھ لاد لے۔ انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بھی اسی سبب سے کہا ہے۔ وہ جانوروں کی طرح صرف فطرت کے بنائے ہوئے قانون پر بغیر سوچے سمجھے عمل نہیں کرتا، وہ نیکی کرتا ہے تو اسے نیکی سمجھ کر، اور بُرائی تو بُرائی جان کر۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ حیوان کہلاتا، انسان نہ ہوتا۔

"اب یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ آدمی سمجھ بوجھ کر بُرا کام کیوں کرتا ہے۔ بعض غریب ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے لاکھوں روپے رکھ دو مگر وہ انھیں ہاتھ نہ لگائیں، بعض امیر ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں موقع ملے تو غریبوں اور محتاجوں کے پاس جو دو چار پیسے ہوتے ہیں، وہ بھی ان سے اینٹھ لیں۔ یہ تو انسان کے اپنے دل پر موقوف ہے لیکن لوگ اس کی بہت کوشش کرتے ہیں کہ انسان کے دل میں بُری باتوں کا خیال نہ آئے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تمہیں سب سے پہلے قرآن شریف پڑھایا گیا اور دینی مسائل سمجھائے گئے، تاکہ تمہیں وہ سب باتیں معلوم ہو جائیں جن کا کرنا مسلمانوں میں اچھا مانا جاتا ہے، اور وہ سب بھی جو تمہیں نہ کرنی چاہئیں۔ لیکن اتنا کافی نہیں ہے بستیوں میں آباد ہونے سے پہلے بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو لوگ بُری حرکتیں کریں ان کو سزا دی جائے۔ اسے لوگ انصاف کہتے ہیں۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ شروع میں انصاف کرنا خاندانی بزرگوں کا کام ہوتا ہے۔ بستیوں میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہاں ایک تو بہت سے چھوٹے چھوٹے خاندان ہوتے ہیں، پھر یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ جو فیصلہ کیا جائے وہ ایسا ہو جسے سب انصاف کی بات سمجھیں۔ اس لئے جتنے ایسے معاملے ہوتے ہیں جن کا فیصلہ کرنے میں دو چار آدمیوں کی عقل کام نہیں دیتی، ان میں مذہبی رہنماؤں کی رائے لی جاتی ہے، اور ان کی جو رائے ہو وہی انصاف کی بات مانی جاتی ہے۔"

فاطمہ نے پوچھا: "ابا جان، یہ لوگ کون ہوتے ہیں؟"

"یہ لوگ وہ ہوتے ہیں جنہیں سب رسمیں معلوم ہوتی ہیں، جو لوگوں کو یہ بتاتے ہیں کہ ثواب کا کام کونسا ہے اور گناہ کا کون سا۔

گزشتہ اشاعت میں یہ ذکر تھا کہ تمام لڑکے جاگ گئے ہیں اور اب وہ کوئی شرارت کرنی چاہتے ہیں۔
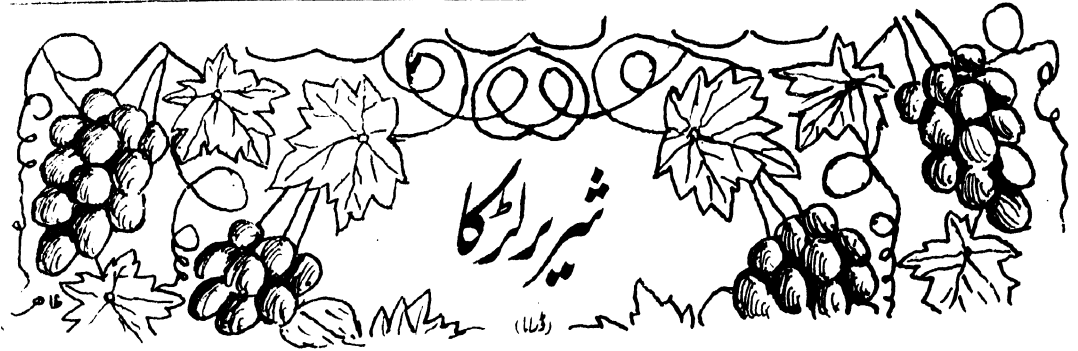
دوسرا لڑکا:- ہاں بھئی آنکھ مچولی ہو۔

تیسرا لڑکا:- نہیں، اندھا بھینا۔

اظہار:- یہ طرار پڑا سوتا ہے اس کی ٹانگ میں رسی باندھ کے کھینچیں۔

داؤد:- جی ہاں اکیلے تو میاں جگاتے ہوئے ڈرتے تھے اب سب آ گئے تو دم ہلانے لگے۔

صالح:- ارے بھائی خدا کے لئے چپ چاپ سو رہو۔ ماسٹر صاحب آ گئے تو برا ہوگا۔

اظہار:- ماسٹر صاحب اب کیا آتے ہیں؟ ایک بار تو آ چکے۔ دروازے کے باہر سے جھانک کر چلے گئے۔ میں جاگ رہا تھا۔

صالح:- خیر وہ آئیں یا نہ آئیں ہمیں تو قاعدے کے خلاف نہ کرنا چاہیئے۔

داؤد:- یہ اپنا قاعدہ ہی رٹا کرتے ہیں۔ بھئی ہم سے پوچھو تو دوڑ دھوپ کا کھیل ٹھیک نہیں بیٹھ کر پہیلیاں بجھائیں۔

ایک لڑکا:- یا بیت بازی ہو۔

اظہار:- داؤد کا گانا کیوں نہ سنیں۔

سب لڑکے:- ہاں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ آؤ میاں داؤد کچھ سناؤ۔

(داؤد کو کھینچ کر فرش پر بٹھاتے ہیں۔ سب آس پاس بیٹھ جاتے ہیں۔ دروازے سے طرار داخل ہوتا ہے اور چپکے سے اپنے بستر پر لیٹ جاتا ہے)

داؤد:- ارے بھئی یہ کوئی بات ہے۔ آخر سناؤں کیا؟

اظہار:- جو تمہارا جی چاہے۔

(گنگناتا ہے)

راوی نے ہے اس طرح خبر دی ٭ اک شب لگی بندروں کو سردی

(سب لڑکے قہقہہ لگاتے ہیں)

اظہار:- پھر وہی مسخرا پن۔ کوئی اچھی چیز سناؤ۔

داؤد:- یہ کیا بری چیز ہے۔ اپنے مولوی اسمٰعیل کی ہے۔

ایک لڑکا:- حالی کی وہ نظم سناؤ جو اس دن جلسہ میں پڑھی تھی۔

داؤد:- حب وطن؟

سب لڑکے:- ہاں ہاں وہی۔

اظہار:- مگر آہستہ آہستہ جس میں باہر آواز نہ جائے۔

داؤد:- (لحن سے پڑھتا ہے)

"اے سپہر بریں کے سیّارو ٭ اے فضائے زمیں کے گلزارو"

اے عنادل کے نغمۂ سحری ۞ اے شبِ ماہتاب تاروں کی
اے نسیم بہار کے جھونکو ۞ دہرِ ناپائیدار کے دھوکو
یوں تو ہر حال میں ہمیں ہو عزیز ۞ تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رمنا ۞ تم سے دل باغ باغ تھا اپنا

(دروازہ کھلتا ہے، ماسٹر صاحب داخل ہوتے ہیں)

ماسٹر صاحب:- السلام علیکم؟

سب لڑکے:- (گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں) وعلیکم السلام

ماسٹر صاحب:- (غصے میں) کیا آج رت جگا ہے۔ یا قوالی کا جلسہ ہے

(سب لڑکے خاموش سر جھکائے کھڑے ہیں)

ماسٹر صاحب:- کچھ معلوم تو ہو یہ صحبت کیسی ہے۔ کیا دارالاقامہ کے قاعدے، ضابطے، ادب، آداب، عزت، حرمت کا گلا گھونٹ کر جشن منایا جا رہا ہے، یا مجلس ماتم برپا ہے۔ آخر یہ لحن داؤد ی میں کیا گایا جا رہا تھا۔

داؤد (ماسٹر صاحب سے) یہ لوگ میرے پیچھے پڑ گئے کہ "حب وطن" سناؤ۔ وہی پڑھ رہا تھا۔

ماسٹر صاحب:- حب وطن تو بڑی اچھی چیز ہے مگر یہ رات کو دو بجے وطن کا درد کیوں اُٹھا۔ اور تمہارا وطن تو اب یہ دارالاقامہ ہے۔ اس کی محبت کا جوش تمہارے دل میں ضرور ہوگا۔ کیا اس کا تقاضہ یہی ہے کہ دارالاقامہ کے آداب کو پیروں تلے روندو۔ آخر تم سوتے سے اُٹھے کیوں؟ تمہیں کس نے اُٹھایا اور یہ دروازہ کس نے کھولا؟ بتاؤ صالح یہ کیا بات ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ تم اس طوفان بے تمیزی میں کیسے شریک ہوئے؟

صالح:- ماسٹر صاحب دروازہ تو معلوم نہیں کس نے کھولا۔ مگر ہم سب اُٹھے یوں کہ روشن دان سے پانی کی بوچھار آئی۔ اظہار کی آنکھ کھل گئی۔ یہ داؤد کو پلنگ پکڑانے کے لئے جگا رہے تھے۔ وہ گھبرا کر چور چور پکارنے لگے۔ ہم سب جاگ اُٹھے اور یہاں اکٹھے ہو گئے۔

ماسٹر صاحب:- یہ کیا مہمل بات ہے۔ پانی کب برسا جو بوچھار آئی۔ بادل تو شام سے گھرے ہیں مگر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا تھا۔ (اظہار سے) تم نے خواب دیکھا تھا۔ یا محض شرارت سے یہ فقرہ گھڑا اور سب کی نیند خراب کی۔

اظہار:- ماسٹر صاحب سچ مچ بوچھار آئی تھی۔ آپ کو یقین نہ ہو تو یہ لحاف دیکھ لیجئے۔ سارا بھیگ گیا نیا لحاف ہے فرخ آباد کا چھپا ہوا۔ اور جب میں داؤد کو جگا رہا تھا میری گردن پر پھر بوچھار

ماسٹر صاحب:- تمہیں لوگوں میں سے کسی کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔ (روشندان کی طرف دیکھ کر) اور یہ روشندان کا شیشہ کیا ہوا؟

صالح:- یہ تو کئی دن سے ٹوٹا ہوا ہے۔

اظہار:- ماسٹر صاحب، طرار نے توڑا تھا۔ گیند اچھال کر کھیل رہے تھے۔ میں نے بہت کہا کہ دیکھو شیشہ ٹوٹ جائے گا مگر نہیں مانے آخر ٹوٹ گیا۔

ماسٹر صاحب:- طرار کہاں ہے؟ آج بھی اسی کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔

صالح:- ماسٹر صاحب، وہ تو پڑے سو رہے ہیں، بڑی گہری نیند سوتے ہیں۔

ماسٹر صاحب:- بناوٹ کی نیند بڑی گہری ہوتی ہے۔ اظہار، جب تم اُٹھے ہو طرار اپنے پلنگ پر تھا۔

اظہار:- جی ہاں ماسٹر صاحب وہ تو غافل سو رہے تھے۔

ماسٹر صاحب:- پھر کوئی اور لڑکا ہوگا جو دروازہ کھول کر باہر گیا

تم میں سے کوئی غائب تو نہیں ؟

لڑکے:- جی نہیں ماسٹر صاحب، سب حاضر ہیں۔

ماسٹر صاحب:- بتاؤ یہ تم میں سے کس کی حرکت تھی ؟ (سب چپ ہیں)
دیکھو تم لوگ صدر مدرس صاحب کے سامنے عہد کر چکے ہو کہ جھوٹ کبھی نہیں بولوگے۔ اور کوئی شرارت کروگے تو پوچھنے پر بتا دوگے اب یہ تمہاری شرافت کا امتحان ہے۔ جس کی حرکت ہو وہ یہاں آکر کھڑا ہو جائے۔ ایک۔ دو۔ تین

(طرار تڑپ کر پلنگ سے اُٹھتا ہے اور ایک جست میں ماسٹر صاحب کے پاس پہنچ جاتا ہے)

ماسٹر صاحب:- ہائیں طرار تم جاگ رہے تھے ؟

طرار:- جی ہاں۔

ماسٹر صاحب:- کب سے۔

طرار:- دیر سے

ماسٹر صاحب:- یہ تمہاری حرکت تھی ؟

طرار:- جی ہاں۔

ماسٹر صاحب:- تم دیوار پر کیسے چڑھے ؟

طرار:- سیڑھی لگا کر۔

ماسٹر صاحب:- سیڑھی کہاں سے لائے۔

طرار:- باغ سے۔

ماسٹر صاحب:- پانی کیسے پھینکا ؟

طرار:- پچکاری سے۔

ماسٹر صاحب:- پچکاری کہاں سے ملی ؟

طرار:- اسی کمرے میں۔

ماسٹر صاحب:- اس کمرہ میں کونسی پچکاری تھی ؟

طرار:- جس سے مچھروں کی دوا چھڑکی جاتی ہے۔

ماسٹر صاحب:- تم نے اظہار کے لحاف پر پانی کیوں چھڑکا۔

طرار:- روشنائی ملی نہیں۔ میں نے پانی چھڑک دیا

(لڑکے چپکے چپکے ہنستے ہیں)

ماسٹر صاحب:- آخر کیوں ؟

طرار:- (چُپ)

ماسٹر صاحب:- مگر اظہار تو کہتا ہے جس وقت پانی آیا تم سو رہے تھے

طرار:- جی نہیں، میں نے تکیہ سیدھا سیدھا رکھ کر لحاف اُڑھا دیا تھا۔ جس میں معلوم ہو میں سو رہا ہوں۔

ماسٹر صاحب:- پھر تم کب آکر لیٹے ؟

طرار:- آپ کے آنے سے کچھ پہلے۔

ماسٹر صاحب:- ان لوگوں نے تمہیں دیکھا نہیں۔

طرار:- یہ باتوں میں لگے تھے۔ میں چپکے سے آکر لیٹ رہا۔

ماسٹر صاحب:- سیڑھی کہاں گئی ؟ باہر تو نہیں ہے۔

طرار:- جہاں سے لایا تھا، وہیں رکھ آیا۔

ماسٹر صاحب:- اور پچکاری ؟

طرار:- پچکاری یہ ہے۔

(اپنے پلنگ کے پاس جاتا ہے۔ اور پچکاری اُٹھا کر لاتا ہے پچکاری کا رُخ داؤد کی طرف ہے)

داؤد:- (دوڑ کر دوسرے لڑکے کے پیچھے چھپتا ہے) دیکھیے ماسٹر صاحب!

ماسٹر صاحب:- (طرار کے ہاتھ سے پچکاری لیکر) تمہاری اس سچائی اور جرأت سے میں خوش ہوا۔ تم نے اسی خط کا اقرار کرکے سب کی آبرو رکھ لی۔ مگر سچائی کا انعام یہ نہیں کہ جھوٹ کی سزا نہ ملے۔

اس کا انعام بس یہی ہے کہ انسان کی عزت اپنی نظر میں قائم رہتی ہے۔ تم نے آج بڑی بُری حرکت کی ہے جس سے دارالاقامہ کے ضابطے کی سخت توہین ہوئی اتنے لوگوں کی نیند میں خلل پڑا اور انہیں بھی بے ضابطگی کی تحریک ہوئی۔ تمہاری شرارتوں سے سب کا ناک میں دم ہے۔ افسوس ہے کہ صدر مدرس صاحب جسمانی سزا کو پسند نہیں کرتے ورنہ تم اس قابل تھے کہ تمہیں خوب بید لگائے جائیں۔ تم جانتے ہو کہ میں نے اچھے اخلاق کے ہزار نمبر رکھے ہیں۔ شروع سال میں ہر لڑکے کو پورے نمبر دیتا ہوں جو کوئی شرارت کرتا ہے اس کے نمبر کٹ جاتے ہیں، اور جو کوئی اچھا کام کرتا ہے اُسے اور نمبر ملتے ہیں جس کے نمبر بہت کم ہو جائیں اُسے کھیلنے کی چھٹی کم ملتی ہے جیب خرچ کم ملتا ہے جس کے کل نمبر کٹ جائیں اُسے تعطیل میں یہاں قید تنہائی میں رہنا ہوتا ہے طرار تمہارے کتنے نمبر کٹ چکے ہیں؟

طرار:- چھ سو۔

ماسٹر صاحب:- آج میں تین سو نمبر اور کاٹتا ہوں۔ اگر اب بھی تم اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ تو سو نمبر باقی ہیں تم قید سے بچ جاؤ گے۔ (دوسرے لڑکوں سے مخاطب ہوکر) تم لوگوں نے بھی ذرا سا بہانہ پاکر ضابطے کو توڑ دیا۔ اگر تم کسی وجہ سے جاگ گئے تھے تو پھر سو جاتے رات کو اس طرح محفل جمانا بڑی سرکشی ہے۔ تم سب کے پچاس پچاس نمبر کاٹے جاتے ہیں۔ جاؤ اب سو رہو اور جب نماز کی گھنٹی بجے تو فوراً اُٹھو چاہے نیند پوری ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ (باقی)

صفحہ ۵ کا بقیہ مضمون

یہ لوگ سب سے زیادہ نیک مانے جاتے ہیں اور ان کی رائے سب سے زیادہ صحیح سمجھی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ ان کا بہت ادب کرتے ہیں، اور وہ جو فیصلہ کریں اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں۔ مسلمانو میں ایسے لوگوں کو قاضی کہتے ہیں، اس لئے کہ وہ شرع کے تمام احکامات جانتے ہیں۔ ہم لوگ ان کو مذہبی رہنما نہیں کہتے، ہم تو ان کو بس قانون داں سمجھتے ہیں۔ اسلام ایک بہت بڑا مذہب ہے جو دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے، یہ بستیوں کا مذہب نہیں، ساری دنیا کا مذہب ہے۔ لیکن عیسائی مذہب اور اسلام سے پہلے تقریباً ہر بستی کا اپنا الگ مذہب ہوتا تھا، اپنا مندر اور اپنا دیوتا۔ دیوتا کی خدمت کرنا اور لوگوں سے اس کے احکامات کی پیروی کرانا ان لوگوں کا کام ہوتا ہے۔ جو مندر میں رہتے ہیں اور اپنی زندگی اور عبادت اور دیوتا کی پرستش میں صرف کرتے ہیں، مذہبی رہنما یہی ہوتے ہیں، یہی بستیوں میں انصاف بھی کرتے ہیں اور ان کا حکم سمجھو دیوتا کا حکم ہوتا ہے۔ جو اسے نہ مانے وہ گویا بے دین ہو گیا، اور بستی کے لوگ اسے اپنے ساتھ رکھنا نہیں پسند کرتے وہ اسے قتل کر دیتے ہیں یا بستی سے نکال باہر کرتے ہیں، جو اس کے لئے موت سے بھی بدتر سزا ہوتی ہے، رحیم الدین، تم بتا سکتے ہو کیوں؟

رحیم الدین نے جھٹ پٹ جواب دیا "جی ہاں، اس لئے کہ انسان صحبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"ہاں تو ان مذہبی رہنماؤں کے فیصلوں سے رفتہ رفتہ ایک پورا قانون تیار ہو جاتا ہے، اور بستی میں رہنے کی شرط یہ ہوتی ہے کہ اس قانون کی پیروی

جمہوریت چین

(۳)

زمیندار اور سرمایہ دار کسانوں اور مزدوروں پر اس لئے ظلم کرسکتے ہیں کہ ان کے پاس دولت ہے، روپیہ ہے، جائداد ہے۔ دولت اور جائداد کی وجہ سے وہ قوت حاصل کرکے کسانوں اور مزدوروں کو دبا سکتے ہیں۔ کسان اور مزدور اسی لئے دبے جاتے ہیں کہ ان کے پاس دو ہاتھوں کے سوا کچھ نہیں۔ کوئی شخص کسان اور مزدور کیوں نہ ہو، آخر وہ انسان اور خدا کی ایک مخلوق ہے۔ انسانیت اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جس طرح زمینداروں اور سرمایہ داروں کو کھانے میسر ہوتے ہیں اسی طرح کسانوں اور مزدوروں کو بھی ہونا چاہئے۔ مگر اس کے لئے ایک خاص قاعدے کی ضرورت ہے جس کی رو سے زمینداروں اور کسانوں کے جھگڑے اور سرمایہ داروں اور مزدوروں کی لڑائیوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اسی قاعدے کو اصول معیشت کہتے ہیں۔ معیشت کے دو اہم مقاصد ہیں، ایک تو یہ کہ زمین کی ملکیت میں زمیندار اور کسان کے برابر دونو حصہ دار ہوں، دوسرا یہ کہ روپے کے معاملے میں سرمایہ دار اور مزدور دونو برابر کے حق دار ہوں۔ زمین کی ملکیت میں برابری کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت زمینداروں کی سب زمین قیمتاً خرید کرکے کسانوں کو دیدے اور پیداوار کی نسبت سے کسانوں سے ایک مقررہ رقم محصول کے طور پر لیا کرے۔ اس ترکیب سے زمینداروں کو کوئی نقصان نہ ہوگا اس لئے کہ حکومت نے ان کو زمین کی قیمت دیدی ہے اور کسانوں کو فائدہ ہوگا اس لئے کہ پہلے تو وہ زمینداروں کے نوکر کی حیثیت سے زمین جوتتے تھے، اب وہ مالک کی حیثیت سے کام کریں گے۔ پہلے ان کی محنت سے جو پیداوار ہوتی تھی وہ سب کی سب زمینداروں کا منافع سمجھا جاتا تھا اب ان کی محنت سے جو پیداوار ہوگی اس میں بیشتر ان کا اور کچھ حکومت کا حصہ ہوگا۔

روپے کے معاملے میں بھی مساویانہ تقسیم کا یہی طریقہ ہے جیسا کہ زمین کی ملکیت کا یعنی ملک میں سرمایہ داروں کے جو بڑے بڑے کارخانے ہیں حکومت ان کو قیمت دے کر خرید لے۔ خریدنے کے بعد کارخانہ حکومت کی ملکیت سمجھا جائے گا مگر حکومت کارخانوں کو اپنے سرمایے سے چلائے۔ کام کرنے والوں میں جن میں کام کرنے کی صلاحیت ہو حکومت ان کو نوکر رکھے اور انکو حسب لیاقت تنخواہ دے اور ان کو ہر قسم کی آسانیاں بہم پہنچائے تاکہ وہ قیمتی محنت کرسکتے ہیں کریں اور ان کی زندگی زیادہ آرام اور خوشحالی سے بسر ہو۔ ان کو کپڑے کی ضرورت ہو تو حکومت کپڑے بنوائے، ان کو مکان کی ضرورت ہو تو مکان تیار کرائے، تفریح و آرام کے سامان کی ضرورت ہو تو وہ مہیا کرے، علاج کی ضرورت ہو تو اس کا انتظام کرے۔ اگر کام نہیں کرسکتے تو ان کے لئے مناسب وظیفے مقرر کردیے جائیں۔ یہی اصول معیشت کا مقصد ہے۔ یہ جمہوریت چین کا تیسرا اصول ہے۔

اب میں آپ کو جمہوریت چین کا نظم و نسق بتاؤں گا اور یہ بھی بتاؤنگا کہ یہ نظام کس طرح چلتا ہے؟ ذیل کا نقشہ غور سے دیکھئے:۔

قومی کانفرنس

جمہوری حکومت

مجلس نگرانی — مجلس معائنہ — مجلس عدالت — مجلس قانون ساز — مجلس عاملہ

محکمہ امور متفرقات — محکمہ فوج — محکمہ تعلیم — محکمہ مالیات — محکمہ امور خارجہ — محکمہ امور داخلہ

صوبجاتی حکومت خود اختیاری

اضلاعی حکومت خود اختیاری

انتخاب — استرجاع — استشراع — ترمیم

ہر ایک ضلع کے لئے ایک نمائندہ

اوپر کے نقشے سے آپکو یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ جمہوریت چین کا نظم و نسق کیا ہے؟ اور وہ کس طرح چلتا ہے؟ اس نقشے میں سب سے اوپر قومی کانفرنس ہے۔ قومی کانفرنس کے بعد جمہوری حکومت کا نمبر آتا ہے۔ پھر جمہوری حکومت

کے ماتحت پانچ مجالس ہیں یعنی مجلس نگرانی۔ مجلس معائنہ۔ مجلس عدالت۔ مجلس قانون ساز۔ مجلس عاملہ۔ پھر مجلس عاملہ کے ماتحت چھ محکمے ہیں یعنی محکمۂ امور متفرقات۔ محکمۂ فوج۔ محکمۂ تعلیم۔ محکمۂ مالیات۔ محکمۂ امور خارجہ۔ محکمۂ امور داخلہ۔

محکمۂ امور داخلہ کے نیچے صوبجاتی حکومت خود اختیاری ہے اور صوبجاتی حکومت خود اختیاری کے ماتحت اضلاعی حکومت ہے۔

یہ اضلاعی حکومت ضلع کے نمائندوں سے چلتی ہے اور صوبجاتی حکومت ضلعوں کے نمائندوں سے چلتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اضلاعی حکومت اپنے طور پر خود مختار ہے اور صوبہ کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے وہ صوبجاتی حکومت کے ماتحت ہے۔ صوبجاتی حکومت اپنے طور پر تو خود مختار ہے، لیکن پورے چین کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے وہ مرکزی حکومت کے ماتحت ہے۔ مرکزی حکومت کی مجلس قانون ساز میں جو قوانین تیار ہوتے ہیں، وہ مجلس عاملہ کے ذریعے اس کے ماتحت چھ محکموں میں جاری کئے جاتے ہیں۔ جو قوانین صوبجاتی حکومت کے لئے بنائے گئے ہیں، وہ محکمہ امور داخلہ کے ذریعے صوبجاتی حکومت میں نافذ کئے جاتے ہیں اور جو قوانین ضلع کے لئے بنائے گئے ہیں وہ صوبجاتی حکومت کے توسط سے جاری کئے جاتے ہیں۔

جمہوریت چین کی مرکزی حکومت میں ایک صدر، ایک نائب صدر اور چند معاونین ہوتے ہیں۔ اسی طرح باقی پانچ مجالس میں بھی ہوتے ہیں۔ مجلس نگرانی جمہوریت چین کا سب سے اعلیٰ نگرانی صیغہ سمجھا جاتا ہے جس کے ذمے جرم کی تفتیش اور سماعت دو کام ہیں۔

مجلس معائنہ جمہوریت چین کا سب سے اعلیٰ معائنہ صیغہ سمجھا جاتا ہے جس کے ذمے افسروں کا چننا اور ان کا امتحان لینا ہے۔

مجلس عدالت جمہوریت چین کا سب سے اعلیٰ عدالتی صیغہ سمجھا جاتا ہے جس کے ذمے عدالتی انتظامات کرنا ہے۔

مجلس قانون ساز جمہوریت چین کا سب سے اعلیٰ قانون بنانے کا صیغہ سمجھا جاتا ہے جس کے ذمے قانون بنانا ہے۔

مجلس عاملہ جمہوریت چین کا سب سے اعلیٰ قانون جاری کرنے کا صیغہ ہے جس کے ذمے تمام پاس شدہ قوانین ملک میں جاری کرنا ہے۔

مذکورہ بالا مجالس میں سے ہر ایک مجلس کا ایک صدر، ایک نائب صدر اور چند معاونین ہوتے ہیں۔

محکمہ امور داخلہ کے ذمے وہ کام ہیں جو اندرونی چین سے تعلق رکھتے ہیں۔

محکمہ امور خارجہ کے ذمے وہ کام ہیں جو بیرونی چین سے تعلق رکھتے ہیں۔

محکمہ مالیات کے ذمے وہ کام ہیں جو مالیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

محکمہ تعلیم کا کام ملک کی تعلیم سے متعلق ہے۔

محکمہ فوج کا کام امور فوجی سے تعلق رکھتا ہے۔

محکمہ امور متفرقات کے ذمے وہ کام ہیں جو مذکورہ پانچ محکمات سے تعلق رکھتے ہوں (مثلاً منگول اور تبت کے معاملات، وغیرہ وغیرہ)

مذکورہ بالا محکموں میں سے ہر ایک محکمہ میں ایک صدر، ایک نائب صدر ہوتا ہے۔ اور چند معاون ہوتے ہیں۔

چین میں کل ۲۸ صوبے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ کیانگ سو
۲۔ چیکیانگ
۳۔ آن ہوئی
۴۔ کیانگ سی
۵۔ فوکین
۶۔ کینٹن
۷۔ کمنی
۸۔ ہونان
۹۔ ہوپی
۱۰۔ سی چوان
۱۱۔ شی کانگ
۱۲۔ کوئی چاؤ
۱۳۔ یون نان
۱۴۔ شنتنگ
۱۵۔ ہانان
۱۶۔ ہاپیہ
۱۷۔ لیونینگ
۱۸۔ کیرن
۱۹۔ ہیلونگ کیانگ
۲۰۔ جھول
۲۱۔ چہار
۲۲۔ ہوئی یوان
۲۳۔ شانسی
۲۴۔ شنسی
۲۵۔ کانسو
۲۶۔ ننگ ہیا
۲۷۔ چین ہائی
۲۸۔ چینی ترکستان

ہر ایک صوبہ میں ایک گورنر ہوتا ہے۔

ان صوبوں کے علاوہ پانچ خود مختار شہر ہیں۔ ۱۔ شنگھائی۔ ۲۔ نانکن۔ ۳۔ ہانکاؤ۔ ۴۔ ٹسن ٹو۔ ۵۔ پکین۔ ہر شہر میں ایک ہائی کمشنر ہوتا ہے۔

دی ہائی دی خاص ضلع سمجھا جاتا ہے۔ منگولیہ اور تبت چین کی دو ماتحت ریاستیں ہیں۔ کل ضلعوں کی تعداد ۱۹۲۴ ہے اور کل آبادی حال کی مردم شماری کے مطابق ۴۸ کروڑ تک پہنچ چکی ہے۔ (باقی آئندہ)

۲۰ فروری ۱۹۳۲ء کو مدرسہ تحتانیہ کے ہال میں مدرسہ سے متعلق اساتذہ اور نگراں کا ایک چھوٹا سا جلسہ ہوا تھا جس میں علاوہ دیگر مفید باتوں کے عبدالغفار صاحب مدہولی، صدر مدرس مدرسہ مذکور نے اپنے "تاثرات" سنائے تھے، جو بچوں کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی رکھنے والے ناظرین کے لئے ان صفحات میں شائع کئے جاتے ہیں۔ (مدیر)

اس وقت ہم محض اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ جو کچھ ہم سنیں گے یا سنائیں گے وہ اس خیال کے ماتحت کہ ہماری حالت ایک خاندان کی ہے جس میں خدا نے اپنی مہربانی سے بہت سے فرزند معنوی ہمارے سپرد کر رکھے ہیں۔ ایک عرصے تک ہم نے انھیں پالا پوسا ہے، ان میں بعض اچھی باتیں ہیں جن کی وجہ سے ہمیں خوشی ہوتی ہے، بعض بری باتیں ہیں جن سے ہمیں دکھ ہوتا ہے۔ ہم ان بری باتوں کو رفتہ رفتہ دور کرنا چاہتے ہیں۔

"خاندان" اور "فرزند معنوی" کا خیال قلمبند کرتے وقت مجھ پر ایک خاص قسم کا جذبہ طاری تھا۔ اس وقت میرے سامنے وہ تمام چلتی پھرتی تصویریں آگئی تھیں جو بعض اوقات اپنی معصومیت کی وجہ سے جلدی میں اپنے استاد کو "اباجی" اور "نانا ابا" کہہ دیا کرتی ہیں۔ کاش میں کوئی ادیب یا خطیب ہوتا تو اپنی جادو بیانی سے اس خیال کی اتنی توضیح کرتا کہ آپ تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جاتے کہ ہم "مدرسہ" کے دفتر میں بیٹھے ہیں یا اس دالان میں جہاں بہت سے "اباجی" اور "نانا ابا" بیٹھے اپنے بچوں کی شادی بیاہ کے منصوبے باندھا کرتے ہیں۔

میں چھوٹے بچوں کو خدا کی سب سے بڑی ودیعت سمجھتا ہوں۔ چھوٹے بچوں کی کما حقہٗ خدمت کرنا شاید سب سے بڑی خدمت ہے۔ بچوں کے معاملے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اس لئے میں ایک بچے کی اسی حد تک خدمت کرنے کا خواہش مند ہوں جس حد تک مجھ میں صلاحیت ہے۔

جہاں تک میں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے بچے "انقلاب پسند" ہوتے ہیں وہ ہر نئی چیز پر دھاوا بولتے ہیں لیکن ان کی دلچسپیوں کا لگاؤ اس چیز کے ساتھ نہیں رکھا گیا تو یہی بچے یا تو اس کی بربادی کے درپے ہو جاتے ہیں یا اس کا مقاطعہ کر دیتے ہیں۔ اگر اس بارے میں ان کی راہنمائی ٹھیک کی گئی تو ان سے زیادہ اس چیز کا ثنا خواں شاید ہی کوئی دوسرا ملے۔ اب اصل سوال رہ جاتا ہے استاد اور اس کی دلچسپی کا۔ بعض استاد اپنے فرائض کو مقررہ گھنٹوں تک محدود رکھا کرتے ہیں جیسا کہ میں نے کئی بار عرض کیا ہے۔ تعلیم دیتے وقت محض جماعت کی چار دیواری کو سامنے رکھنا اور سمجھنا کہ بچوں میں وہ عادات پیدا کر رہے ہیں جس کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے کیسا تکلیف دہ خیال ہے۔ ہم بچوں کو سکھائیں کچھ اور توقع رکھیں کسی اور چیز کی کیسا ظلم ہے! تعجب ہے ہم ہندوستانی استادوں کی ذہنیت پر کہ تجارت کی غرض سے جب کوئی دکان کھولتے ہیں اور باتفاق دکان سے کسی اور جگہ چلے جائیں تو آٹھوں پہر اس کا خیال رہتا ہے اور جب کسی مدرسی کے عہدے پر مامور ہوتے ہیں تو ہر وقت یہ خیال لگا رہتا ہے کہ گھنٹہ کب ختم ہوگا!

حضرات! سچ تو یہ ہے کہ جب تک ہمارا مقصد متعین نہیں ہوتا ہے، ہماری کوششوں کا بار آور ہونا تو کیا وجود میں آنا مشکل ہے۔ رہا مقصد کے متعین ہونے کا سوال، اس سے آپ انکار نہیں کریں گے کہ ہماری زندگی مقاصد سے بھری ہوئی ہے۔ دنیا میں ہر ایک انسان جد و جہد میں مشغول نظر آتا ہے خواہ یہ جد و جہد اسے غارتگری کی طرف لے جانے والی ہو یا انسانیت کی تکمیل کی طرف۔ لیکن "سعی بالمقصد" دونوں میں موجود ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ زندگی کے مد و جزر کے ساتھ ساتھ اس جد و جہد کا تعلق ہے۔

"سعی بالمقصد" میں جو جذبہ کارفرما ہوتا ہے میں اس کا متلاشی ہوں۔ اس میں جو سترمیں نہاں ہیں ان سے آپ ناواقف نہیں ہیں۔ میں یہ چیز آپ میں بدرجہ اتم دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ زندگی کا راز ہم پر کھلے۔ ظاہر ہے اس دلچسپ آزمایش میں ہم اس وقت تک حصہ نہیں لے سکتے ہیں جب تک ہم اپنے سامنے کوئی مقصد نہیں رکھتے ہیں۔ اگر بچوں کی خدمت کرنے کا بیڑا ہم نے اٹھایا ہے، تو اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا طریقۂ کار آیا ان ہی روایات اور اصولوں پر ہوگا جو عام مدارس میں رائج ہے یا ان اصولوں پر جو ہمیں بچوں سے قریب تر کر دیتے ہیں۔ میری مراد "خاندانی طریقہ" سے ہے۔ اگر آپ اول الذکر کے حامی ہیں تو اس سے مجھے اختلاف ہوگا خواہ اس میں کتنی ہی خوبیاں کیوں نہ ہوں۔ اگر مؤخر الذکر ناگزیر ہے تو پھر طریقۂ کار میں زبردست تبدیلی کرنی ہوگی اس لئے کہ اس کی فضا اول الذکر سے بہت مختلف ہے۔ اس صورت میں بعض ایسی باتیں بھی اختیار کرنی ہوں گی جسے شاید سماج پسند نہ کرے اس لئے کہ ہر زمانہ میں سماج کی تشکیل موجودہ فضا اور تہذیب سے ہوتی ہے خواہ وہ غلط کیوں نہ ہو۔ لہذا اپنے کام کو چلانے کے لئے سماج کا اسی حد تک خیال کرنا چاہئے جس حد تک وہ ضروری ہے ورنہ براہ راست انسانی فطرت کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مکتب میں جب ۵ سال کا بچہ داخل ہوتا ہے تو وہ مدرسہ کی فضا کو اپنے ماحول سے کس قدر مختلف پاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی فطرت سے ہٹ کر آپ اپنے قائم کئے ہوئے ہیولیٰ کے ماتحت اس پر مسمریزم کرنا شروع کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اسے ایک نئی دنیا سے روشناس کراتے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہتا ہے۔ پھر آپ اسے اسی جگہ چھوڑ آتے ہیں جہاں سے وہ آیا تھا۔ اب اُسے پھر نئی دشواریوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ سماج اب اس سے اسی وقت محبت کرتا ہے جب وہ اپنے کام کو یکسوئی اور دلچسپی کے ساتھ کرے۔ مگر آپ نے تو اسے غیر محسوس طریقہ سے یہ سکھانے کی کوشش کی تھی کہ مدرسہ کا وقت صرف ایک بجے تک ہوتا ہے۔ سماج اب اس سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنا کوئی جاذب نظر کیریکٹر پیش کرے مگر مدرسہ کی چار دیواری میں یہ چیز اس کے لئے عنقا تھی اس لئے کہ درسی کتب کے علاوہ آپ نے اس کے کیریکٹر کی تشکیل کے لئے کوئی جد و جہد نہیں کی۔ سماج اب اسے وقت کا پابند دیکھنا چاہتا ہے مگر آپ نے بروقت اس کے لئے کوئی کوشش نہیں کی۔ سماج اب اس کے کاموں میں اپنی سی ہم آہنگی دیکھنا چاہتا ہے، مگر "کلاس" (جماعت) کے بے معنی سکوت اور بے معنی ضبط کے علاوہ آپ نے کبھی اس کی آواز کے ساتھ اپنی آواز نہیں ملائی۔ سماج اب اس کے ہر اس عیب پر نگاہ رکھتا ہے جو دن رات کے ۲۴ گھنٹوں میں سے خواہ کسی وقت ظہور پذیر ہوا ہو مگر آپ تو صرف "قواعد مدرسہ کی رو سے چار گھنٹے کے مالک" تھے، غرضیکہ سماج اس کی ان تمام حرکات کو غور سے دیکھتا ہے جن کی طرف سے ہم نے ہمیشہ لاپرواہی برتی ہے۔

عام مدارس کی موجودہ یہ صورت بعض دشواریوں کا نتیجہ ہے، تاہم ان میں بھی اصلاح کی گنجائش ہے جن سے ہمیں اس وقت سروکار نہیں ہے۔ ہم عام روش سے الگ ہو کر ایک مخصوص حلقہ کی خدمت کر رہے ہیں، اس کا کوئی مطلب ہے۔ قطع نظر سیاسی اعتقادات اور حالات کے میں تو اس لحاظ سے بھی الگ مدارس چلانے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ ہماری موجودہ روش سماجی زندگی سے تصادم پیدا کرنے والی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس قسم کے مدرسے کے تخیل سے میں آپ صاحبان کو روشناس کرانا چاہتا ہوں اس میں مدرسہ اور اس کے دارالاقامے کا محل وقوع نئی قسم کی ترتیب اور تنظیم کی سخت ضرورت ہے تاہم ہماری نیت اچھی رہی تو ہم اس کے قریب تر ہو جائیں گے۔

اس حقیقت سے آپ انکار نہیں کریں گے کہ ہم اپنے کام میں عملاً جس قدر دلچسپی لیں گے اسی قدر اس کے حقائق کا انکشاف ہم پر ہوتا جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے پیشے کے شرف سے واقفیت حاصل کرتے ہوئے معصوم ہستیوں کو اپنی آغوش محبت میں لے کر ان کے ساتھ قلبی تعلق پیدا کریں گے کہ ایک مدرس کی زندگی کا یہی مقصد ہے۔

فہرست مضامین

شریر لڑکا ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا ایک نہایت دلچسپ ڈراما آئندہ اشاعت سے "پیام تعلیم" میں شائع ہونا شروع ہوگا۔

طابع و ناشر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی — اڈیٹر سعد انصاری — (مطبوعہ جامعہ برقی پریس قرول باغ دہلی)

بطخ

... کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ نمبر (۶)

رمضان المبارک

اللہ تعالیٰ نے سال کے بارہ مہینوں میں جو فضیلت اور برکت رمضان المبارک کے مہینہ کو عطا فرمائی ہے کسی مہینہ کو عطا نہیں کی صحیح حدیث میں وارد ہے کہ "جب رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں۔ اور دوزخ کے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں اور سرکش شیاطین زنجیروں میں جکڑ کر باندھ دئے جاتے ہیں۔ اور غیب سے ایک ندا دینے والا ندا دیتا ہے کہ اے خیر کے تلاش کرنے والے! متوجہ ہو، اور اے شر کے تلاش کرنے والے! باز آ"۔ یہ رمضان المبارک کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس مہینہ میں نفل کا ثواب ایک فرض کے برابر اور ایک فرض کا ثواب ستر فرضوں کی برابر ملتا ہے۔ جو شخص رمضان شریف میں کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرا دے تو یہ فعل اس کے گناہوں کی مغفرت کا باعث ہوتا ہے، اور اُس کو اُسی قدر ثواب ملتا ہے جس قدر کہ روزہ دار کو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے ایمان کی رو سے ثواب جان کر روزہ رکھا اور جس نے رمضان کی راتوں میں قیام کیا یعنی نماز تراویح پڑھی اور جس نے لیلۃ القدر میں قیام کیا، اس کے پچھلے گناہ معاف کر دئے جائیں گے۔ دوسری حدیث میں وارد ہے کہ "ہر عبادت کے عوض سات سو عبادتوں کا ثواب ملتا ہے مگر روزہ دار خاص میرے واسطے اپنی خواہشات نفسانی کو چھوڑتا ہے"۔

روزہ دار کے واسطے دو فرحتیں ہیں ایک افطار کے وقت اور ایک اپنے رب سے ملاقات کے وقت۔ ایک حدیث میں ہے: "روزہ دار کے منہ کی بو خدا کے نزدیک مشک کی بو سے زیادہ پاکیزہ ہے"۔

روزہ دار کو چاہیئے کہ روزہ کی حالت میں کسی کو بُرا نہ کہے، اور نہ کسی سے جھگڑے۔ اگر اس کو کوئی شخص بُرا کہے تو وہ یوں کہدے کہ میرا روزہ ہے۔ جنت میں ایک خاص دروازہ ہے جس کا نام ریّان ہے، اُس میں روزہ دار کے سوا اور کوئی داخل نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے سال بھر میں ایک ایسی رات پیدا کی ہے جس کی عبادت کا ثواب ہزار مہینے کی عبادت سے بڑھ کر ہے اور وہ رات اِسی مہینہ میں ہے اور اس کا نام "لیلۃ القدر" ہے۔

خداوند پاک نے کسی مصلحت سے اُس کو پوشیدہ رکھا ہے۔ یہ مبارک رات رمضان کی آخری دس راتوں میں ہوتی ہے۔ اور طاق راتوں میں ہوتی ہے مگر ۲۷ ویں شب کو زیادہ اتفاق ہے۔ چنانچہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ . . . .

شب قدر کو رمضان کے اخیر سات دنوں میں طاق راتوں میں تلاش کرو۔ نیز ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بعض لوگوں نے شب قدر رمضان کے اخیر سات دنوں میں خواب میں دیکھی۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا خواب درست ہے۔ جو شخص تلاش کرنا چاہے اخیر کے سات دنوں میں تلاش کرے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رمضان کا عشرۂ اخیر جب آتا تو حضور علیہ الصلوۃ والسلام شب بیدار رہتے اور اپنے گھر کے لوگوں کو بھی جگاتے۔

ہمدردی

جاڑے کی رات ہے، بارہ بج چکے ہیں۔ آسمان پر ابر گھرا ہوا ہے، ہوا زوروں سے چل رہی ہے، اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا ہے۔

سلیم اس وقت اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا مطالعہ میں مشغول ہے۔ سامنے انگیٹھی جل رہی ہے۔ اس کا کمرہ ہر قسم کے فرش سے آراستہ ہے۔

ایک چور مکان میں آہستہ سے داخل ہوتا ہے۔ سلیم کو جاگتا دیکھ کر واپس چلا آتا ہے۔

دروازے پر کھڑا ہو کر اس کے سونے کا انتظار کر رہا ہے گھنٹوں کھڑا رہا لیکن سلیم اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔

سردی کا موسم تھا۔ ہوا زوروں سے چل رہی تھی۔ چور سردی سے تنگ آگیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ بتیسی بجنے لگی۔ بدن سرد ہو گیا۔ مجبوراً کمرہ میں داخل ہوا۔

سلیم چونک پڑا۔ دیکھا تو سامنے ایک اجنبی آدمی کھڑا ہے، پوچھا "کون؟ اس وقت کیسے آئے"؟

چور نے جواب دیا "میں ایک غریب الوطن مسافر ہوں۔ سردی سے تنگ آگیا ہوں۔ ہاتھ پاؤں شل ہوگئے ہیں۔ ادھر اُدھر ٹھوکریں کھائیں لیکن ابھی تک سونے کی جگہ نہیں ملی۔ آپ کا دروازہ کھلا دیکھ کر اندر چلا آیا کہ شاید رات گزارنے کے لئے یہاں کوئی جگہ مل جائے"۔

سلیم یہ سن کر بہت متاثر ہوا۔ اور فوراً ہی اس کو گرم گرم کپڑے پہنا کے کھانا کھلایا اور ایک گرم بستر پر لٹا دیا۔ خود تھوڑی دیر تک پڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد لیمپ کی روشنی دھیمی کر دی اور سو رہا۔

---

۳ بجے ہوں گے کہ یک بیک چور کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے محسن کو سوتا پاکر اٹھا اور کمرے کی تمام قیمتی اشیا جمع کیں اور لے کر چل دیا۔

صبح کو سلیم اٹھتا ہے۔ نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر اپنے مہمان کی چارپائی کے پاس جاتا ہے۔ لیکن چارپائی خالی پاکر اس کو سخت افسوس ہوتا ہے (چیزوں کے ضائع جانے کا نہیں بلکہ مہمان کے چلے جانے کا) اور کہتا ہے "مہمان کو غالباً ...."

ابھی جملہ پورا بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ چند سپاہی مع چور کے اس کے کمرہ میں داخل ہوتے ہیں،

سلیم بڑھ کر اپنے مہمان کا پرتپاک استقبال کرتا ہے۔ اور سپاہیوں سے اس کے ہاتھ کو چھڑاتے ہوئے کہتا ہے "کہ کیوں بھائی! اتنی سویرے اٹھ کر کہاں چلے گئے تھے؟ میں تمہارا بڑی دیر سے انتظار کر رہا ہوں خدا کا شکر ہے کہ تم آ گئے۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

سپاہی یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ "یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے ہم تو اس کو چور سمجھے ہوئے تھے لیکن یہ اس کا دوست نکلا!! ہم بالکل غلط سمجھے۔

تاریخ اسلام کے دو واقعے

(۱)

مسلمان ایک زمانہ میں سب سے زیادہ طاقت اور قوت کے مالک تھے۔ سیکڑوں برس تک دنیا کے بہت بڑے حصے پر بادشاہت کی۔ بڑے بڑے بادشاہ ان کے نام سے کانپتے تھے۔ لیکن ایک آج یہ حالت ہے کہ دنیا میں وہی مسلمان سب سے کم طاقت ور، سب سے کم زور اور سب سے کم عزت سمجھے جاتے ہیں۔ جو ان کے نام سے کانپتے تھے، وہ اب مقابلہ کے لئے تیار ہیں۔ جو ذکر سے لرزتے تھے اب لڑنے کو مستعد ہیں۔ انکی کمزوری ولاچاری اور بے بسی وبیچارگی کی داستان ہر زبان پر ہے۔ نہ صرف یہ کہ غیروں کے یہاں اس کا ذکر ہے بلکہ خود ان کے یہاں اس کا چرچا ہے۔ لیکن تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ یہ حالت آخر کیوں ہوگئی ہے؟ ۔ اچھا، لو میں تمہیں تاریخ اسلام کے دو واقعے سناتا ہوں جس سے تمہیں اندازہ ہوگا کہ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟

بنی اُمیہ کا نام تو تم نے سنا ہوگا۔ جن کی خلافت دمشق میں ایک عرصہ تک رہی۔ ان میں ایک بہت بڑا بادشاہ گذرا ہے جس کا نام ولید بن عبدالملک تھا۔ بڑی شان وشوکت اور رعب وداب کا بادشاہ تھا۔ اس کے زمانہ میں مسلمان ساری دنیا پر چھا گئے۔ بڑی بڑی سلطنتوں کو ہلا ڈالا۔ غرضکہ ہر جگہ اپنی حکومت کا جھنڈا گاڑ دیا۔ اس کے زمانہ میں مسلمانوں کے پاس جس قدر علاقہ تھا پھر کسی زمانہ میں نہیں ہوا۔ اسی ولید کے زمانہ کا قصہ ہے کہ مسلمانوں نے چین پر بھی حملہ کیا۔ جب صدر مقام تک پہنچ گئے تو چین کے بادشاہ نے ملاقات کی خواہش کی۔ چنانچہ دوسرے دن یہ لوگ ملنے گئے۔ یہ سلسلہ ملاقات کئی دن تک قائم رہا۔ پہلے دو دنوں تک چونکہ صلح کی دوستانہ گفتگو ہو رہی تھی اس لئے یہ لوگ بہت ہی معمولی اور سادہ لباس میں گئے۔ اس وضع کا چینی سرداروں پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا اور انھوں نے ان کا غلط اندازہ لگایا۔ لیکن جب معاملہ سلجھتا نظر نہ آیا تو تیسرے دن یہ لوگ آخری گفتگو کے لئے گئے۔ اس دن چونکہ آخری گفتگو کرنی تھی جس کے بعد اگر معاملہ طے نہ ہوتا تو جنگ کے سوا اور کوئی راہ نہ تھی اس لئے پورے طور سے جنگی لباس سے آراستہ ہوکر گئے۔ چینی سرداروں نے یہ کیفیت دیکھی تو ان کے دلوں میں کپکپی پیدا ہوگی۔ بادشاہ نے تنہائی میں ان کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا کہ آج تو یہ دیو معلوم ہوتے ہیں۔ جب بادشاہ نے یہ رنگ دیکھا تو صلح کی باتیں شروع کیں لیکن پھر بھی رعب جمانے کے لئے مسلمانوں سے کہا کہ تمہیں یہ جرأت کیوں کر ہوئی کہ اس دور دراز ملک پر حملے کے ارادہ سے نکلے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ ہم کروڑوں کی تعداد میں ہیں اگر ایک ایک مٹھی خاک بھی تمہارے اوپر ڈال دیں تو تم اس میں دفن ہوجاؤ گے۔ مسلمان سپہ سالار نے اس موقع پر جو جواب دیا وہ سننے کے قابل ہے۔ وہ اس دھمکی سے ذرا بھی نہیں گھبرایا نہ اسے کسی قسم کا خوف معلوم ہوا۔ اس نے بلا کسی جھجک کے کہا کہ "تم ہرگز اس قوم کو نہیں مٹا سکتے جو یہاں سے دمشق اور دمشق سے بحر ظلمات تک پھیلی ہوئی ہے۔ اگر تم نے ذرا بھی زیادتی کی تو مسلمانوں کی لاتعداد فوجیں چین کی سرحد پر ہونگی جن کا ایک سرا یہاں ہوگا تو دوسرا دمشق سے

ملا ہوگا اور پھر سوائے بربادی اور تباہی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا"۔

سپہ سالار اسلام کے اس دلیرانہ اور بہادرانہ تقریر نے جس کا ایک ایک حرف سچائی میں ڈوبا ہوا تھا، شاہ چین کی آنکھوں کو کھول دیا اور اسے مجبوراً خراج کے اقرار کے ساتھ صلح کرنی پڑی۔

پیام بھائیو! تم نے سوچا کہ اسلامی سپہ سالار میں یہ ہمت و جرأت یہ بے خوفی و بے جگری کہاں سے پیدا ہوئی، پایہ تخت دمشق ہزاروں میل دور ہے، چاروں طرف کروروں کی تعداد میں دشمن پھیلے ہوئے ہیں، پھر بھی نہ اسے خوف ہے نہ ڈر، نہ پریشانی ہے نہ گھبراہٹ بلکہ دشمنوں کے بیچ میں پوری بے باکی سے یہ الفاظ ادا کر رہا ہے۔

بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں اختلاف نہ تھا وہ بہت سی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ہوئے نہ تھے بلکہ ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتے تھے ان کا بادشاہ ایک تھا اور وہ سب اسی ایک کے تابع دار اور فرماں دار تھے انھوں نے الگ الگ مرکز نہیں بنا رکھے تھے صرف دمشق ان کا اکیلا مرکز تھا جسکی اطاعت ہر مسلمان کا فرض تھا۔ یہی مرکزی اتحاد و یکرنگی تھی جس نے ان کو ایک دوسرے سے بالکل ملا رکھا تھا اور یہی میل تھا جس نے اُن میں یہ ہمت و جرأت اور بے خوفی و دلیری پیدا کر دی تھی، جو ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود انھیں بزدل اور پست ہمت نہیں ہونے دیتی تھی۔

یہ ترقی کے زمانہ کا ایک واقعہ تھا تنزل کے زمانہ کا دوسرا واقعہ آئندہ بیان ہوگا۔

بچوں کے لئے ایک انعامی مقابلہ

صفحہ ۲ پر جو تصویر دی گئی ہے وہ ایک تالاب میں بطخوں کے تیرنے کی تصویر ہے، جو مختلف رنگ کے کاغذوں پر کاٹ کر بنائی جائیگی۔ کاغذوں کے رنگ کے لئے کچھ ہدایات نیچے دی جاتی ہیں۔

پیچھے خالی جگہ کا کاغذ گہرے نیلے رنگ کا ہوگا۔ بطخیں سفید رنگ کی ہونگی جن کی چونچ نارنگی اور پیر اور آنکھیں سیاہ رنگ کی ہونگی۔ درخت کی پتیاں تمام تر ہلکے بھورے رنگ کی ہونگی، تاکہ ان سے موسم خزاں کا اظہار ہو۔ ٹہنیاں سرخی مائل خاکی رنگ کی ہوں گی۔

پہلی بطخ کے پیچھے اور داہنے ہاتھ کی جانب نیچے کو جو ٹیڑھی لکیریں دور تک چلی گئی ہیں، وہ سورج کی روشنی کے نشانات ہیں جو پانی پر پڑ رہے ہیں، یہ اور گوشہ کا تمام حصہ زرد رنگ کے کاغذ کا ہونا چاہیئے اور بطخ کے اوپر کا سفید اور ان نشانات کے درمیان کا حصہ گہرے نیلے رنگ کا ہوگا۔

شرائط مقابلہ

(۱) سب سے اچھی تصویر کاٹ کر بھیجنے والے لڑکے کو ایک بہت اچھی کتاب انعام میں دیجائیگی۔

(۲) تمام جوابات ۱۵۔ فروری سنہ ۱۹۳۲ء تک

اڈیٹر پیام تعلیم قرول باغ۔ دہلی

کے پاس پہنچ جائیں۔

(۳) ہر لڑکا اپنی تصویر کے نیچے اپنا نام، مع جماعت اور عمر کے لکھے اور اپنے کسی اُستاد سے یہ تصدیق کرائے کہ یہ تصویر اسی کی بنائی ہوئی ہے

(۴) ۱۱ برس سے زیادہ عمر والے لڑکے مقابلہ میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔

محمود و مسعود دو بھائی ایک مدرسہ میں پڑھا کرتے تھے۔ محمود کی عمر چودہ برس کی تھی اور مسعود کی گیارہ برس کی۔ مسعود کو جس قدر پڑھنے کا شوق تھا اسی قدر محمود پڑھنے سے جی چرایا کرتا۔ مسعود کمزور اور دبلا پتلا ہونے کی وجہ سے جسمانی ورزشوں اور کھیلوں میں بہت کم دلچسپی لیتا تھا، اور کھیل کے اوقات میں بھی وہ درسی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں کے مطالعہ میں مصروف رہتا۔ محمود پڑھنے میں بہت کم دلچسپی لیتا اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت کھیل میں صرف کرتا۔ اس کو کھیل کے علاوہ سیاحت میں بھی بڑا مزہ آتا تھا۔ عموماً وہ اپنی چھٹیوں کے دن مشکل ہی سے گھر پر گزارتا، جہاں اس کو چند گھنٹے فرصت کے مل جاتے وہ فوراً تفریح کے لئے اپنے گاؤں سے باہر چلا جاتا، اور مختلف مقامات کی سیر کرکے اپنا فرصت کا وقت صرف کرتا۔

ایک مرتبہ اس کے باپ نے اس کو بلا کر تعلیم کی طرف متوجہ کرنا چاہا اور کہا کہ تم اگر اسی طرح کھیل اور تفریح میں وقت گزاروگے تو تمہاری آئندہ زندگی تکلیف سے گزریگی، بہتر ہوگا کہ تم محنت سے اور دل لگاکر پڑھو۔

محمود نے کہا "تعلیم کو میں اپنے لئے زیادہ مفید نہیں سمجھتا"

محمود کے باپ نے کہا "تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ جس طرح تم جسمانی ترقی کے لئے ورزش ضروری سمجھتے ہو اسی طرح تم کو دماغی ترقی کے لئے تعلیم کا حاصل کرنا ضروری ہے۔

چونکہ محمود کا باپ ایک خوش حال زمیندار تھا اس لئے اس نے کہا کہ اگر تم تعلیم حاصل کرلوگے تو تم بہتر طریقے سے اپنی زمین سے بھی فائدہ اُٹھا سکوگے۔

محمود نے کہا "میں اور مسعود مل کر بہت اچھی طرح کاشت کریں گے وہ اپنے علم کے ذریعہ سے مجھے مدد دے گا۔ میں اپنے کام سے اسکی مدد کروں گا۔"

محمود کے باپ کو یہ جواب پسند نہ آیا اس نے کہا "اگر تم جاہل رہے تو تمہارا اور تمہارے بھائی کا مل کر کام کرنا ناممکن ہوگا۔ تم پرانے طریقوں کو پسند کروگے اور وہ نئے نئے طریقوں کو۔ اس طرح تم میں اس میں نفاق پیدا ہوگا۔ لہذا میرا یہ خیال ہے کہ تم زراعت کی تعلیم کے لئے زراعتی کالج میں داخل ہوجاؤ، تاکہ تم اس سے فارغ ہونے کے بعد تنہا بھی کام کرسکو۔ مجھے مسعود کے متعلق یقین نہیں کہ اگر اس کو تعلیم سے اسی طرح شوق رہا تو وہ تمہارے ساتھ زراعت کا کام کریگا

چنانچہ اب محمود ایک زراعتی کالج میں تعلیم پارہا ہے۔ لیکن اس کو کھیل اور تفریح کا شوق بدستور ہے۔ دسمبر کا مہینہ تھا ایک دن اس کے دو دوست احمد اور نصیر اس کے پاس آئے۔ احمد اس کا ہم عمر اور ہم جماعت تھا۔ نصیر اس سے کم عمر اور اسی مدرسہ کا ایک ہونہار طالب علم تھا۔

احمد نے محمود سے کہا "ہم اپنے چچا کے کھیت کو جارہے ہیں کیا

تم بھی ہمارے ساتھ چلوگے؟"

محمود تو ایسے موقعوں کا منتظر ہی رہتا تھا، وہ بخوشی تیار ہوگیا اور تینوں دوست ان کے دو بجے کھیت کی طرف روانہ ہوئے۔ احمد کے چچا کا کھیت ان کے گاؤں سے کوئی ۴ میل کے فاصلہ پر تھا لیکن دلچسپی کی غرض سے یہ لڑکے ۶ میل کے لمبے راستہ سے جو ایک پہاڑ پر سے ہو کر جاتا تھا، جانے لگے۔ چلتے چلتے محمود نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا کہ آج رات میں ضرور برف باری ہوگی، اگر واپسی میں دیر ہوگی تو راستہ خطرناک ہو جائے گا۔

نصیر نے کہا "ہم لوگ شام سے پہلے ہی گھر پہنچ جائیں گے۔"

نصف سے کچھ زیادہ ہی راستہ طے کر چکے تھے کہ ہوا زور سے چلنے لگی، تینوں دوستوں نے بھی اپنی اپنی رفتار تیز کر لی اور ۳ بجے کے قریب وہاں پہنچ گئے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان لوگوں نے خوب لطف سے گزارا۔ اپنا کھیت سمجھ کر بے تکلفی سے درختوں پر چڑھ چڑھ کر خوب پھل کھائے اور خوب لطف اٹھا کر گھر روانہ ہوئے۔

راستہ میں شام ہوگئی اب کسی قدر برف گرنا شروع ہوگئی تھی۔ سب نے اپنی رفتار تیز کر لی جوں جوں تیز چلتے جاتے اسی قدر اندھیرا زیادہ ہوتا گیا اور برف بھی کافی گرنی شروع ہوگئی۔ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچتے پہنچتے بالکل اندھیرا ہوگیا اور برف کی وجہ سے راستہ بھی ڈھک گیا۔ ہوا کے چلنے سے راستہ بھی نہ دکھائی دیتا۔ بالآخر ایک دیوار نظر آئی اور اسی کے نیچے وہ کھڑے ہوگئے۔

محمود نے کہا "میں نہیں جانتا کہ ہم لوگ سیدھے راستہ پر جا رہے ہیں اور یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ دیوار کس جگہ ہے۔"

احمد نے کہا "تھوڑی دیر پہلے تک تو میں سمجھ رہا تھا کہ ہم لوگ سیدھے جا رہے ہیں اب میرا خیال ہے کہ ہم غلط راستہ پر جا رہے ہیں۔"

محمود نے کہا "میرا خیال ہے کہ تھوڑی دیر میں برف باری ختم ہو جائیگی۔ اگر میں سو قدم اور چل لوں تو سیدھا راستہ بھی پا لوں گا۔"

نصیر کی چلتے چلتے بری حالت ہوگئی تھی، مارے سردی کے ہاتھ پیر ٹھٹھر گئے تھے، دل ہی دل میں غصہ ہو رہا تھا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ کیوں آیا۔ اس کے غصہ اور تکلیف کے آثار اس کے چہرہ سے بھی ظاہر ہونے لگے۔

محمود نے اس کی حالت دیکھ کر کہا "تم کو کیا ہوا؟" اس نے جواب دیا "میرے پیر بالکل ٹھٹھر گئے ہیں اور مجھے سخت تکلیف ہو رہی ہے۔"

محمود نے ہمت بڑھا کر چلنے پر تیار کیا اور جلدی جلدی چلنے لگے محمود کو یقین نہیں تھا کہ سیدھے راستہ پر جا رہا ہے، لیکن اندھیرا زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ کسی طرح پہاڑ سے نیچے اتر جانا چاہتا تھا۔ بڑی تکلیف کے بعد وہ پہاڑ کے نیچے پہنچے۔

محمود نے احمد سے کہا "تم جانتے ہو ہم کہاں ہیں" یہ آخری آدمی ہے اس کے بعد ایک چھوٹی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد ہم منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ لہذا اب اس راستہ کو گم نہ کرنا چاہیئے لیکن سوال یہ ہے کہ اب ہم اس راستہ کے داہنی طرف جائیں یا بائیں طرف؟ احمد نے کہا "پہلے بائیں طرف کو چلیں۔"

نصف میل تک بائیں طرف چلتے رہے آخر احمد نے کہا "یہ وہ راستہ نہیں ہے، ہم غلط جا رہے ہیں"

ادھر نصیر کی حالت ایک تو سردی کے مارے بری تھی دوسرے تھکن سے بھی وہ چور ہوگیا تھا۔ زمین پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا میں اب آگے نہیں جاؤں گا، مجھے سردی لگ رہی ہے۔ تھک گیا ہوں اور نیند بھی معلوم ہو رہی ہے۔

(باقی آئندہ)

مئی ۱۸۰۸ء میں الجزائر کے ایک قصبہ میں امیر عبدالقادر پیدا ہوئے۔ انکے والد بڑے بزرگ آدمی تھے، الجزائر کے شرفا اور بڑے بڑے لوگ انکی عزت کرتے تھے۔ عبدالقادر بچپن ہی سے تیز اور ذہین تھے اسلئے کہ اُنکے باپ انکی تعلیم وتربیت کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ اسلئے تھوڑی سی عمر میں بہت کچھ پڑھ لیا۔ قرآن شریف خاص طور پر بہت اچھا یاد تھا۔

سترہ سال کی عمر میں شہسواری اور دوسری ورزشوں میں ایسا ملکہ پیدا کر لیا کہ جہاں کہیں گھوڑے سواروں کا مجمع ہوتا لوگ انہیں کیطرف اشارے کرتے۔ جنگلی سور کا شکار دوڑا کر کیا کرتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا مگر اسی کے ساتھ اپنے دینی کاموں کو بھی وقت پر کرتے تھے۔ نومبر ۱۸۲۵ء میں اپنے والد کے ساتھ حج کو تشریف لے گئے۔ راستہ میں اپنے ہمراہیوں سمیت اسکندریہ اور قاہرہ کی سیر کی۔ شاہ مصر محمد علی پاشا کا زمانہ تھا۔ اُنھوں نے اِن لوگوں کی بڑی آؤ بھگت کی۔ قاہرہ سے سویز کے راستہ حجاز کو گئے۔ حج کے بعد دمشق گئے۔ یہاں کچھ دنوں قیام کیا۔ پھر بغداد شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے مزار کی زیارت کیلئے گئے۔ یہاں سے پھر دوبارہ حرمین کو واپس ہوئے۔ اور ۱۸۲۸ء میں اپنے وطن پہونچ گئے۔

عبدالقادر پر اس سفر کا بہت اثر پڑا تحصیل علم کا بے انتہا شوق پیدا ہوگیا دن رات مطالعہ میں مشغول رہتے۔ فلسفہ۔ فقہ۔ حدیث۔ جغرافیہ۔ فلکیات۔ تاریخ اور جڑی بوٹیوں کے علوم کو خاص طور پر پڑھا۔ اپنا ایک ذاتی کتبخانہ بھی تیار کیا جس میں قیمتی قیمتی کتابیں جمع کیں۔

۱۸۳۰ء میں الجزائر پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ یہاں کے بسنے والے تمام عربی قبائل کو یہ بات ناگوار گذری۔ اُنھوں نے فرانسیسیوں پر حملہ کر دیا۔ فرانس کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا۔

فرانس کی اس حرکت سے ایک خاص قسم کی بھینی پیدا ہوگئی۔ تمام قبیلوں میں باہمی اتحاد واتفاق کا خیال پیدا ہو گیا۔ سب قبیلوں کے سردار مشورے کے لئے جمع ہوئے۔ انمیں امیر محی الدین امیر عبدالقادر کے باپ بھی تھے۔ آپس میں یہ طے پایا کہ اس موقع پر یہی بہتر ہے کہ سلطان مراکش امیر عبدالرحمٰن کی ماتحتی قبول کر لیجائے۔ اس بارے میں سلطان موصوف سے گفتگو کر کے انھی کی رعایا بن گئے۔ خطبہ میں سلطان کا نام لیا گیا۔ سلطان سے باقاعدہ بیعت بھی کر لی۔ فرانس کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ سلطان کو کہلا بھیجا کہ یا تو اپنی فوج الجزائر سے بلالو ورنہ ہم سے جنگ کے لیے تیار رہو۔ سلطان نے یہی بہتر سمجھا کہ الجزائر سے اپنی فوجیں ہٹالے۔

اب پھر الجزائر کے لوگوں کو مشورے کے لیے جمع ہونا پڑا تاکہ کوئی دوسرا امیر مقرر کریں۔ سب نے اتفاق رائے سے امیر محی الدین کو اپنا امیر منتخب کیا۔ اس کے بعد قیطنہ (امیر کی جائے قیام) پہونچے اور امیر کو اپنی پاس کی ہوئی تجویز سے مطلع کیا، اور کہا کہ ہمکو بیعت کر لیجیے۔ امیر نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے میں ذرا کچھ پس وپیش کیا۔ اسپر اُن لوگوں نے اور زیادہ اصرار کیا اور کہا کہ اگر آپ نہیں مانینگے تو ہم آپ کو قتل کر دیں گے۔ مجبور ہو کر امیر نے کہا کہ "اچھا میرے بیٹے عبدالقادر کو اپنا امیر بنالو"۔ سب نے

اس بات کو منظور کرلیا ۔ امیر عبدالقادر اسوقت فرانسیسیوں سے فیلب (ایک مقام) پر جنگ کر رہے تھے ۔ یہ لوگ وہیں پہونچے اور انسے بیعت کی ۔ امیر کی عمر اسوقت پچیس سال کی تھی ۔

اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہی سب سے پہلے تمام قبیلوں کو اتحاد و اتفاق کا درس دیا تاکہ دشمن سے پورے طور پر مقابلہ کیا جاسکے ۔ چنانچہ جب کبھی فرانس سے مقابلہ ہوا ہمیشہ فرانس نے شکست کھائی ۔

فرانس سے باقاعدہ جنگ جاری تھی ۔ فرانس لاکھ کوشش کرتا کہ کسیطرح الجزائر پر قبضہ پالے ، مگر امیر کی وجہ سے کچھ چلتی نہ تھی ۔ اسلیے اپنے جنرل کی معرفت ۱۸۳۴ء میں امیر سے صلح کرلی ۔

جب کچھ سکون ہوا تو امیر نے ملک کی اندرونی اصلاح کیطرف توجہ کی ۔ مگر جنگی تیاریوں کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوئے ۔ اسلیے کہ امیر کو یقین تھا کہ فرانس نے مجبوراً صلح کی ہے ۔ جب موقع پائیگا پھر جنگ کیلئے آمادہ ہوجائیگا ۔ امیر کا اقتدار روز بروز بڑھتا جارہا تھا ۔ تمام قبائل امیر کے اشارے کے منتظر رہا کرتے تھے ۔ فرانسیسی جنرل کو امیر کا یہ اثر ایک آنکھ نہ بھایا ۔ اس نے جل کر امیر کو لکھا کہ اپنی حدود سے باہر قدم نہ بڑھائیے امیر نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ۱۸۳۴ء کے معاہدہ کے مطابق میرا دائرہ حکومت غیر محدود ہے ۔ باہمی گفتگو سے معاملہ پھر کچھ دب سا گیا ۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ملک کی بھلائی کی خاطر امیر کی انتھک کوششیں فرانسیسیوں کی آنکھوں میں کھٹکتی تھیں ۔ کھسیا کر یہ شرارت کی کہ بعض قبیلوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ دھمان (شہر) کے اندرونی حصوں میں چلے جائیں ۔ ان لوگوں نے ڈر کر فرانسیسیوں کی حمایت چاہی ۔ امیر نے کہلا بھیجا کہ ان لوگوں کی حمایت ہرگز نہ کیجائے ۔ مخالفین کو یہ بات بہت ناگوار گذری انھوں نے پانچ ہزار پیادے اور کچھ سواروں کو لیکر حملہ کر دیا ۔ مگر خود انھی کو پسپا ہونا پڑا ۔

فرانسیسیوں کی اس شکست کا پیرس میں بڑا چرچا ہوا ۔ مختلف مجلسوں اور انجمنوں سے یہ آواز بلند ہوئی کہ اس بدوی امیر کو قرار واقعی سزا دیجائے ۔ طرح طرح سے حکومت کو ایک زبردست حملہ کیلئے مجبور کیا گیا ۔ امیر کو بھی ان تمام باتوں کی خبریں پہونچ رہی تھیں ۔ نومبر ۱۸۳۵ء میں ایک لشکر وھران بھیجا گیا ۔ امیر نے اس سے مقابلہ تو کیا ۔ مگر اتفاق وقت سے کامیابی نہ ہوئی ۔ تمام لشکر منتشر ہوگیا ۔ امیر نے اپنے پائے تخت بسکرہ کے قریب ایک شہر میں سکونت اختیار کی ۔ لیکن ہر وقت فرانسیسی حملہ کا خطرہ لگا رہتا ۔ ایک صبح کو اطلاع ملی کہ فرانسیسی لشکر از خود واپس ہورہا ہے ۔ تو امیر نے اطمینان کا سانس لیا ۔ بسکرا میں منتقل ہو کر پھر سے لشکر کو جمع کرنا شروع کیا ۔

فرانسیسی واپسی میں تلمسان ٹھہرے ۔ یہاں کے لوگوں نے پرتپاک خیر مقدم کیا ، لیکن غضب یہ ہوا کہ فرانسیسیوں نے یہاں کے باشندوں سے بیجا ٹیکس وصول کرنا شروع کردیا ۔ اس حرکت سے لوگ بہت بددل ہوئے ، اور امیر عبدالقادر سے مل گیے ۔ اس غیبی امداد نے امیر کے حوصلہ کو بلند کردیا ۔ پھر تو فرانسیسیوں سے وہ معرکہ کی جنگ کی کہ تلمسان سے بھگا ہی کر چھوڑا ۔ اس شکست نے فرانس کے غصہ کو تیز تر کردیا ۔

اب تو تابڑ توڑ فرانسیسی لشکر پہونچنے لگے ۔ امیر نے ہر ایک کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا ۔ مگر ایک موقع پر ایسی شکست کھائی کہ عربی جمیعت کا شیرازہ ہی منتشر ہوگیا ۔ اس کا سبب انکے ایک رفیق کار سید ابراہیم کی خود غرضی تھی لیکن امیر نے بھی اس جرم کی سزا میں ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ کردیا ۔ ۱۸۴۷ء تک (تقریباً پندرہ سال) امیر نے فرانس کا مقابلہ کیا ۔ کئی مرتبہ آپس میں صلح اور معاہدے ہوئے ۔ اور تقریباً ہر مرتبہ فرانس ہی نے صلح کی خواہش کی ۔ حالانکہ امیر کی حیثیت فرانس کے مقابلہ میں ایسی تھی جیسے کہ پہاڑ کے مقابلہ میں اونٹ کی ۔ اس سے امیر کی ذکاوت ، ذہانت اور جنگ میں ماہر ہونے کا پتہ چلتا ہے ۔

امیر فرانس کے مقابلہ میں کبھی ہتھیار نہ ڈالتے ، اگر خود انکے ہم مذہب

مسلمان بھائی ان کی تباہی اور سپے دہوتے۔ صورت یہ ہوئی کہ سب سے پہلے عرب جنگ کی طوالت سے گھبرا کر سلطان مراکش سے جا ملے۔ فرانس نے موقع پا کر سلطان کو بہلا پھسلا کر امیر کے مقابلہ کے لیے آمادہ کر لیا۔ ابتدا میں امیر نے اپنے دونوں دشمنوں سے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔

آخری مقابلوں میں اپنے ہی بعض ساتھیوں کی دغابازی کی وجہ سے میدان جنگ چھوڑنا پڑا۔ جس وقت تمام فوجیں الجزائر کو واپس ہو رہی تھیں کہ راستہ میں معلوم ہوا کہ فرانسیسی لشکر تین میل کے فاصلہ پر سامنے سے آ رہا ہے۔ اب نہ پیچھے لوٹنے کا موقع تھا اور نہ آگے بڑھنے کا۔ امیر نے مشورہ کے بعد یہی طے کیا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں اپنے آپ کو گرفتار کرانے کی بجائے یہ بہتر ہے کہ خود کو فرانس کے حوالہ کر دیں۔ ۱۲ دسمبر ۱۸۴۷ء کی طوفانی شب میں اپنے دو ساتھیوں کی وساطت سے فرانس کے سامنے امیر نے اپنی شکست کو تسلیم کر لیا اور وہ خدائی آواز جو الجزائر کے پہاڑوں اور جنگلوں میں پندرہ سال تک بلند ہوتی رہی تھی، اپنے ہی بھائیوں کی بدولت دشمنوں کے ہاتھوں خاموش کر دی گئی۔

فرانس کی حراست میں آنے کے بعد کچھ دنوں امیر کو جیل کی سختیاں بھی جھیلنا پڑیں۔ لیکن پرنس نابلیون (　　) سے دوستی پیدا ہو جانے کے بعد امیر کی بہت سی مشکلات حل ہو گئیں۔ ۲۴ جولائی ۱۸۵۶ء کو مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے دمشق پہونچے اور یہیں مستقل طور پر قیام کر لیا۔

۱۸۶۲ء میں حکومت کی اجازت سے حج کو تشریف لے گئے۔ واپسی میں اسکندریہ ٹھہرے۔ اور وہیں فری میسن[1] کلب کے ممبر بھی بن گئے۔ چند دنوں کے بعد پھر دمشق واپس آ گئے۔ اور اب آپ کا سارا وقت خدمت خلق اور یاد خدا میں بسر ہونے لگا۔

۱۸۸۳ء میں وفات پائی۔ مرحوم کا طریقۂ زندگی بہت سادہ تھا۔ تکلفات آپ کے ہاں نام کو نہ تھے۔

[1] یہ ایک خفیہ مجلس ہے جو اپنا راز کسی کو نہیں بتاتے۔

جمہوریتِ چین

پیام بھائیو! کچھ عرصہ پہلے ہم آپ کو جمہوریتِ چین کے بانی ڈاکٹر سن یت سین کے حالاتِ زندگی سنا چکے ہیں۔ اس سے آپ نے غالباً یہ اندازہ کرلیا ہوگا کہ اُس شخص نے کس ہمت اور جواں مردی سے اپنا کام انجام دیا۔ ہم نے آپ کو اس کی زندگی کے سلسلہ میں ۱۹۱۱ء تک کے واقعات بتائے تھے۔ یہی سال ہے جس میں خاندان مانچو کا خاتمہ ہوگیا، اور اس خاندان کے خاتمہ کے سلسلہ میں سب سے اہم واقعہ جو پیش آیا وہ جنگ ووچانگ کا ہے۔ ووچانگ کہاں ہے؟ ووچانگ دریائے یانسٹر پر واقع ہے، اس کے دائیں ہاتھ کی جانب بندر ہانکاؤ اور بائیں ہاتھ کی جانب شہر ہانیان ہے۔ ان تینوں شہروں کے درمیان دریائے یانسٹر حائل ہے۔ یہ تین شہر اس طرح واقع ہیں کہ اگر ان کو خطِ مستقیم سے ملا دیا جائے، تو ایک مثلث مساوی الاضلاع بنجاتا ہے۔ ان تینوں شہروں کا مجموعی نام ووہان ہے جب کبھی آپ کسی اخبار میں ووہان کا نام دیکھیں، تو اس سے یہی تین شہر سمجھ لیں۔ ان شہروں کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا جاتا ہے کہ آپ انھیں اچھی یاد رکھیں، کیونکہ واقعہ ووچانگ کے بعد چین کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، چین کا نظامِ حکومت بالکل بدل جاتا ہے، اور چین کی اجتماعی زندگی میں ایک جدید انقلاب نظر آتا ہے۔

جس وقت ہم نے ڈاکٹر سن یت سن والا مضمون آپکے سامنے پیش کیا تھا تو اس کے ساتھ ساتھ سرخی میں 'جمہوریتِ چین کا بانی' کے الفاظ بھی لکھے ہوئے تھے۔ آپ یہ پوچھتے رہے ہوں گے کہ 'جمہوریتِ چین کیا بلا ہے؟'۔

آیئے آج ہم اس کے بارے میں آپ کو بتائیں۔ جمہوریتِ چین ایک نظامِ حکومت ہے جو خاندان مانچو کی بادشاہت ختم ہونے کے بعد سرزمینِ چین میں قائم ہوا۔ اس کا آغاز ۱۹۱۱ء سے ہوتا ہے جسے آج پورے بیس سال ہو رہے ہیں۔ اس نظامِ حکومت میں نہ کسی شخص کا حق زیادہ رکھا گیا ہے اور نہ کسی کا کم، بلکہ سب کے برابر حقوق تسلیم کئے گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی باگ کسی ایک شخص کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ جمہور یعنی عوام کے ہاتھ میں ہے۔

یہاں پر غالباً آپ یہ سوال کریں کہ چین کو جمہوریت کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اس کے اصول کیا ہیں؟ اس کا نظم و نسق کیا ہوتا ہے؟ اور یہ نظام کس طرح چلتا ہے؟

چین کو جمہوریت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اس میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں، مثلاً ہانی[1]، تبتی، منگولی، مانچو، اور مسلمان۔ یہ لوگ شکل و صورت، رسم و رواج، نسل اور خون، مذہب اور عقیدہ تہذیب و تمدن ہر چیز میں ایک دوسرے سے کسی قدر مختلف ہیں یہی

---

[1] چینی مورخ اس نسل کو ہان Han کہتے ہیں۔ ہانی 'ہان' کی طرف منسوب ہے۔ 'چینی' ان ہی پانچ قوموں کے مجموعے کا نام ہے۔

وجہ ہے کہ جب ان میں سے کسی قوم نے چین پر تسلط حاصل کیا، تو وہ یہ کوشش کرنے لگی کہ ان کے تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کو بالکل بدل ڈالے، اور ان پر اپنا طرز معاشرت اور طریقہ زندگی عائد کردے۔ چنانچہ جب منگولی لوگ چین کے حکمراں ہوئے تو منگولی طرز معاشرت چین میں رائج ہوا۔ اسی طرح جب مانچو خاندان نے تسلط جمایا، تو مانچو رسم و رواج پھیلا۔ بعض رسم و رواج جو کسی ایک قوم کے لئے مناسب ہو ضروری نہیں کہ دوسری قوم کے نزدیک بھی قابل قبول ہو۔ ایک قوم کے اپنے رسم و رواج دوسری قوم پر عائد کرنے سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے خیالات بھی مختلف ہوگئے۔ خیالات کے اختلاف کی وجہ سے، ایک قوم دوسری قوم کو اجنبی اور بیرونی باشندے کی حیثیت سے دیکھنے لگی۔ ہانی کہتے ہیں کہ مانچو اجنبی قوم ہے۔ مانچو کہتے ہیں کہ منگولی چین کے اصلی باشندے نہیں۔ اور منگولی یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان تاتار نسل سے ہیں، انہیں چین سے کوئی تعلق نہیں۔ مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ سب کافر ہیں۔

ان اختلافات نے چین کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ یہاں جمہوری حکومت کی شکل اختیار کی جائے، کیونکہ ان مختلف قوموں میں خواہ کتنے اختلافات کیوں نہ ہوں پھر بھی انھیں اسی ملک میں رہنا ہے اور اسی میں اپنی زندگی بسر کرنا ہے۔ مگر جب تک چین میں بادشاہت رہیگی، ان مختلف قوموں کا اس میں ہم آہنگی اور خوشگواری کے ساتھ رہنا محال ہے، کیونکہ بادشاہت قائم کرنا اور قائم رکھنا بغیر کسی قوم کے جذبات کو دبائے ہوئے ناممکن ہے۔ یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ سرزمین چین میں پانچ مختلف نسل اور مذاہب کے لوگ بستے ہیں، اگر کسی ایک مذہب اور نسل کے لوگ چین میں بادشاہت قائم کرنا چاہتے ہیں تو اسے باقی اور چار قوموں کو دبائے رکھنا بجا اور ضروری ہے۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ بغیر ان کو دبائے ہوئے وہ اپنی بادشاہت قائم کرکے حکمرانی کرے، اور یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ایسی قوم جسکی قوت اپنی ہمسایہ قوموں کی قوت سے زیادہ مضبوط نہ ہو، ایک دفعہ اور ایک وقت پر چار قوموں کے اوپر غالب آجائے۔ بادشاہت کی خواہش تو ہر قوم میں موجود ہے مگر قوت کم ہونے کی وجہ سے اس کی خواہش پوری ہونا مشکل ہے قوت حاصل کرنے کے لئے لوگوں نے مختلف تدبیریں سوچ رکھی ہیں بعض چالاک لوگوں نے یہ تدبیر کی کہ غیر ممالک کی طاقتوں سے مدد طلب کی، مگر آپ تو جانتے ہیں کہ غیر ملک والے اس قدر بے وقوف نہیں ہیں کہ بغیر کچھ فائدہ حاصل کئے وہ مدد دینے کو تیار ہوجائیں یہی وجہ ہے کہ کوئی پچاس برس سے جاپانی انگریز، فرانسیسی اور جرمن قوموں نے معاہدوں اور سیاسی تدبیروں سے چین میں بہت سے ایسے حقوق حاصل کرلئے ہیں جنھوں نے چین کو تباہ اور برباد کر رکھا ہے،

اصل یہ ہے کہ خاندان مانچو نے چین میں ۱۶۴۴ء میں اپنی حکومت قائم کی۔ شروع شروع میں تو انکی طاقت بہت تھی، اور لوگوں کا اس کے خلاف اٹھنا بہت دشوار تھا۔ مگر ایک یا ڈیڑھ صدی کے بعد جب اس خاندان کا زور جاتا رہا، اور اسکی سلطنت تنزل کی طرف مائل ہوئی۔ تو ملک میں جگہ جگہ شورشیں ہونے لگیں۔ مانچو خاندان خوب جانتا تھا کہ اگر شورش بڑھ گئی تو سلطنت اس کے ہاتھ سے نکل جائیگی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ شورشوں کو دبانے کے

کے لئے غیر معمولی قوت کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے بہت سا روپیہ اور جنگی سامان چاہیئے، مگر یہ سب کہاں سے آئیں گے؟ رعایا کو تو ستانا نہ چاہیئے کیونکہ اگر رعایا بادشاہِ وقت کی سختگیری سے تنگ آگئی، تو اندیشہ یہ ہے کہ تمام رعایا اس کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوگی اس وقت اور سخت دشواری پیش آئیگی۔ پھر یہ مناسب سمجھا کہ غیر ممالک سے قرضہ لیا جائے۔ مگر بغیر ضمانت کے کون قرض دے گا؟ آخر یہ ہوا کہ قرض کے معاوضہ یا ضمانت میں مانچو بادشاہ نے غیر ملکی باشندوں کو چین کے بہت سے مقامات میں رہنے اور تجارت کرنے کی اجازت دیدی اور جہاں جہاں غیر ملکی باشندے بستے تھے، وہاں کے سب اختیارات ان کے سپرد کردئے۔ یہی وجہ ہے کہ چین کے نئے لغت میں تین لفظ کا اضافہ ہوا ہے، وہ کیا "آبادیات" "مستعمرات اور" امتیازات"۔

آبادیات اور مستعمرات ان مقامات کو کہتے ہیں جہاں معاہدے کی رو سے غیر ملکی باشندوں کو رہنے اور کاروبار کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اور وہاں کی زمینیں ان کی جائداد اور ملکیت سمجھی جاتی ہیں مگر ہاں، اگر چین کے پاس اتنا روپیہ ہو کہ ان کا قرضہ ادا کرکے ان کو واپس لینا چاہیے تو لے سکتا ہے۔ امتیازات ان خاص حقوق کو کہتے ہیں، جو مانچو بادشاہ نے محض ذاتی اور شخصی اغراض کی وجہ سے غیر ملکی باشندوں کو دے رکھے ہیں۔ مثلاً آبادیات اور مستعمرات میں ہر قسم کے اختیارات ان کو دیدئے گئے ہیں، انھیں اپنی عدالت قائم کرنے کی اجازت ہے، وہ اپنے سرمایہ سے جہاز کی کمپنی اور ریلوے کی تعمیر کرسکتے ہیں، تمام معدنی اور صنعت کے کارخانے ان کے سپرد ہیں۔ ان سب باتوں نے چین کو برباد کر رکھا ہے۔ اور باوجود اتنا بڑا ملک ہونے کے اسکی کوئی وقعت نہیں، اس لئے کہ غیر ممالک کے لوگ یہ حقوق اور امتیازات حاصل کرکے ہر طریقے سے چین کو دبانا چاہتے ہیں۔ اور اس کو ترقی کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ اسی بنا پر ڈاکٹر سن یت سین کہتے تھے کہ اگر تم اپنے ملک کو ترقی یافتہ اور خوش حال بنانا چاہتے ہو، تو صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ سب سے پہلے مانچو حکومت کا خاتمہ کردو، اور استبدادی حکومت توڑ کر جمہوری حکومت قائم کردو۔ اور ملک کے تمام لوگوں کی متفقہ قوت اور اتحاد عمل سے چین کو مضبوط اور قوی بنانے کی کوشش کرو آبادیات اور مستعمرات کو واپس لے لو، اور غیر ملک کے تمام امتیازات کو منسوخ کردو! اگر غیر ملکی باشندوں کو چین میں رہنا منظور ہے تو انکی حیثیت وہی ہوگی جو ایک عام چینی باشندے کی ہوتی ہے۔ اور ان کے ساتھ بھی حکومت کا وہی سلوک ہوگا جیسا اپنی رعایا کے ساتھ۔ انکو ہرگز کسی قسم کی فوقیت اور رعایت حاصل نہ ہوگی۔

پیام بھائیو! اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ چین کو کیوں جمہوریت کی ضرورت ہے؟

اچھا! اب اسے ختم کرتا ہوں۔ ہور آئندہ یہ بتاؤں گا کہ اس کے اصول کیا ہیں؟

دنیائے سائنس کے روشن تارے

لیوازی اے

نظریہ فلوجسٹن (جسکی تشریح ہم پہلے ایک مکالمہ کی صورت میں کرچکے ہیں) کی معقولیت اس وقت تک دنیائے سائنس میں مسلّم رہی جب تک کہ اسکی جانچ پڑتال ترازو کی مدد سے نہیں کی گئی۔ لیوازی اے سب سے پہلا شخص ہے جس نے اس نظریہ کو ترازو کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کے سراسر کھوٹے ہونے کا اعلان کیا۔ اس نظریہ کے مطابق چیزوں کے جلنے یا دھاتوں کے کشتہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے فلوجسٹن کا جزو علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اس چیز کا وزن جس کا ایک جزو علیحدہ ہو کر فضا میں منتشر ہو گیا ہو، کم ہو جانا چاہیئے لیکن حقیقت اس کے خلاف تھی۔ کسی دھات کے کشتہ کا وزن دھات کی اس مقدار سے جس سے کشتہ بنایا گیا ہو، ہمیشہ زیادہ ہوتا تھا، لیکن نظریہ فلوجسٹن کے معتقدین نے اس حقیقت پر کبھی غور نہیں کیا اور نہ ترازو کی مدد سے اس کی تحقیق کی۔ اور اگر کسی کے مشاہدہ میں یہ بات آ بھی گئی کہ دھات میں سے فلوجسٹن نکل جانے پر اس کے کشتے کا وزن بڑھ جاتا ہے تو اس نے اسکی یہ توضیح بیان کی کہ چونکہ فلوجسٹن ہوا سے لطیف اور ہلکی چیز ہے اس لئے اسکے خارج ہو جانے پر بقیہ مادہ کا وزن زیادہ ہو جاتا ہے۔

لے وازی اے نے مختلف دھاتوں کو ایک معین مقدار کی ہوا میں گلاکر تجربے کئے۔ ان نتائج کی صحت سے مطمئن ہو کر اس نے ذیل کے حقائق کا اعلان کیا۔

(۱) اشیار کے جلنے میں ہوا کی آکسیجن ان پر کیمیاوی عمل کرتی ہے یعنی ہوا کی آکسیجن کے اشیا کے ساتھ کیمیاوی طور پر ترکیب کھانیکا دوسرا نام جلنا ہے۔ (۲) اسی طرح دھاتوں کو جب ہوا میں ساڑا جاتا ہے تو ہوا کی آکسیجن ان کے ساتھ کیمیاوی طور پر مل کر خاک کی مانند ایک مرکب بنا دیتی ہے جس کو ہم کشتہ کہتے ہیں۔

(۳) کشتوں کو اگر گرم کیا جائے تو آکسیجن پھر ان میں سے علیحدہ ہو جاتی ہے

(۴) جلنے یا کیمیاوی عمل کے دوران میں مادہ صرف حالت بدلتا ہے۔ اسکی مقدار میں کوئی فرق نہیں آتا یعنی مادہ غیر فانی ہے۔ یہ مشاہدہ بعد میں چل کر "بقائے مادہ" کے اصول کے نام سے مشہور ہوا جس کا شمار سائنس کے بنیادی اصولوں میں ہوتا ہے۔

نظریہ فلوجسٹن کی تردید میں لے وازی اے کے مشاہدات اور دلائل کی فرانس میں تو بہت جلد شہرت ہو گئی لیکن بیرونی ممالک مثلاً جرمنی، انگلستان اور سویڈن کے حکمانے قومی تعصب کی بنا پر ان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لیکن لیوازی اے کے دلائل اسقدر قوی تھے کہ 'آفتاب آمد دلیل آفتاب' کے مصداق انکو بھی ان کی صداقت پر آمنا و صدقنا کہنا پڑا۔ بالآخر اس اہل کے نظریہ کے ساتھ یورپ کے تمام حکما کو بھی سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

لیوازی اے کے کارناموں نے فرانس کے حکما میں ایک نئی روح پیدا کر دی۔ پیرس میں لیوازی اے کے گرد حکمار کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس نے اپنی تحقیقات اور اکتشافات سے دنیائے سائنس میں ایک انقلاب عظیم

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

آج کل جامعہ کو پھر کچھ مالی مشکلات لاحق ہوگئی ہیں اور جس کی وجہ سے شیخ الجامعہ صاحب بھوپال اور بمبئی گئے ہوئے ہیں آپ کی بجائے پروفیسر ای۔ جے کیلاٹ صاحب قائم مقام شیخ الجامعہ ہیں۔ آپ کو گئے ہوئے کوئی دو ہفتہ ہوگئے ہیں اور ابھی جلد آنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

جامعہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات یہ خبر سن کر خوش ہوں گے کہ جامعہ کی عمارتوں کے لئے زمین کا مسئلہ جو اتنے عرصہ سے التوا میں تھا اب تقریباً طے ہوگیا ہے یعنی گورنمنٹ کی طرف سے مالکان اراضی کو یہ اجازت مل گئی ہے کہ زمینیں فروخت کرسکتے ہیں۔ اب یہ معاملہ جامعہ اور مالکان زمین کے درمیان ہے جو انشاءاللہ تعالیٰ بہت جلد طے ہوجائیگا یعنی شیخ الجامعہ صاحب کی واپسی پر مالکان آراضی کو قیمت دے کر اس زمین کا بیع نامہ لکھا لیا جائیگا جس کے بعد پھر تعمیر کا سلسلہ شروع ہوسکے گا۔

اب کے سال بھی عید کے موقعہ پر مدرسہ جامعہ کے چھوٹے لڑکے ایک ڈراما کررہے ہیں، جو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ڈرامے کا عنوان "شریر لڑکا" ہے جو شائقین کے مطالعہ کی غرض سے انشاءاللہ آئندہ نمبر سے ان صفحات میں باقساط شائع ہوگا۔

جامعہ کے اندرونی شعبوں میں اس سال کتب خانہ جامعہ کی ازسرنو ترتیب وتنظیم ایک خاص چیز ہے۔ جب سے کتب خانہ کا انتظام سید نذیر نیازی صاحب کے ہاتھ میں آیا ہے، موصوف اس کو لائبریریوں کے جدید نظام پر ترتیب دینے کی برابر کوشش کررہے ہیں۔ اس سال آپ نے مطالعہ کرنے والوں کی نشست اور الماریوں کی ترتیب کا ایسا انتظام کیا ہے جس سے کتب خانہ کی بہت معقول صورت نکل آئی ہے، نیز تمام کتابوں کو بھی اعشاریہ کے جدید اصولوں پر ترتیب دے رہے ہیں، جس سے کتابوں کے حصول میں انشاءاللہ دقت نہ ہوگی۔ اور موصوف کی اگر ایسی ہی توجہ اور کوشش رہی تو یہ کتب خانہ اپنی ترتیب وانتظام کے لحاظ سے بھی اچھے کتب خانوں میں ہوجائیگا۔

(صفحہ ۱۵ کا بقیہ)

بپا کردیا بہت سی اشیاء کے پرانے غیر موزوں ناموں کو بدل کر نئے نام وضع کئے مثلاً آکسیجن، نائٹروجن، ہائیڈروجن جیسے نام اسی جماعت کے وضع کئے ہوئے ہیں۔

اوزان اور پیمانوں کی مجلس نے جس کا روح رواں لیوازی ہی تھا بین الاقوامی استعمال کیلئے اوزان اور پیمانے بنائے، جو آج تک تمام دنیائے سائنس میں رائج ہیں۔ نظام میٹری (میٹرک سسٹم) اسی مجلس کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ پانی اور ہوا کی ماہیت کی صحیح اور باقاعدہ تشریح لیوازی ہی نے کی۔ الغرض سائنس کے موجودہ خط وخال کا صانع لیوازی ہی ہے "جو کیمیائے جدید کا موجد" کے لقب سے ملقب کئے جانیکا بجا طور پر مستحق ہے۔

فہرست مضامین

طابع و ناشر :- ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پی ایچ ڈی۔ مدیر :- سعید انصاری صاحب بی اے جامعہ۔ مطبع :- جامعہ برقی پریس۔ صدر بازار دہلی۔

ایک مصور کی حیرت!!

ایک مصور صاحب جو چیزوں کی تصویریں اپنی اصلی حالت پر بنانا چاہتے تھے ایک دن کچھ گاجر مولی میز پر رکھ کر اور چند گدھے بکریاں اور خرگوش کمرہ میں چھوڑ کر اندر چلے گئے، تھوڑی دیر بعد آکر کیا تماشہ دیکھتے ہیں کہ گاجریں بکریاں اٹھا لے گئیں۔ مولی گدھے نے کھالی اور کچھ حصہ خرگوش لے بھاگے۔

کوائف جامعہ

۱۹ مارچ ۱۹۳۲ء کو ہماری "اردو اکادمی" کا تیسرا جلسہ ہوگا جس میں مولنا اسلم صاحب جیراجپوری مصر کی قدیم تاریخ پر ایک مضمون پڑھیں گے اور مولنا محمد السورتی صاحب اس جلسہ کے صدر ہوں گے۔

اسی تاریخ کو ایک جلسہ مباحثہ بھی ہوگا جس میں شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب یہ مضمون پیش کریں گے کہ

"ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تعلیم بحیثیت مجموعی
ہماری ہندوستانی قومیت کے لئے مضر رہی ہے"

اور جناب خواجہ غلام السیدین صاحب، پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اس مضمون کی مخالفت میں تقریر فرمائیں گے۔ یہ علمی مباحثہ اپنی نوعیت کا یکتا رہیگا، اس لئے کہ ہر دو بزرگ اپنے اپنے زمانہ میں علی گڈھ یونین کے ممتاز مقرر رہ چکے ہیں۔ اور اسوقت تک ہندوستان میں سرکاری تعلیم کا بہت کچھ عملی تجربہ بھی حاصل کر چکے ہیں

"ہندوستانی اکیڈمی" کے نام سے حکومت صوبہ متحدہ کی طرف سے بھی اردو ہندی کی ترقی کے لئے ایک علمی مجلس قائم ہے جس کے ہر سال سالانہ جلسہ میں ملک کے کسی ممتاز اہل علم سے کسی علمی موضوع پر لیکچر دلوائے جاتے ہیں اور ان پر ایک ہزار روپے کی ایک حقیر نذر پیش کیجاتی ہے۔ امسال یہ دعوت ہمارے شیخ الجامعہ صاحب کے نام آئی۔ آپ نے "معاشیات کا موضوع اور اس کے دائرۂ بحث" پر ایک مقالہ پڑھا۔ جو تمام علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔

بقیہ صفحہ ۸ کا مضمون

کام دے سکتی ہے۔ یہ برش سے زیادہ مفید ہے۔ اول تو یہ کہ یہ برش سے سستی ہے اور دوسرے یہ کہ اسکی بو سے جراثیم جلد مر جاتے ہیں۔

مسواک کے استعمال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو دانتوں کی خلا میں اوپر سے نیچے چلایا جائے کیونکہ اس طرح کرنے سے مسواک کے ریشے آسانی سے دانتوں کے خلا کے اندر جا سکتے ہیں مسواک کو رات کے وقت کھانا کھانے کے بعد استعمال کرنا چاہیئے۔ اکثر لوگ ایسا کرتے ہیں کہ کھانے سے پہلے مسواک کر لیتے ہیں یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے کھانے سے پہلے صاف کرنے سے دانت تو صاف ہو جاتے ہیں لیکن جب کھانا بعد میں کھایا جاتا ہے تو کھانے کے ذرات منہ میں رہ جاتے ہیں اور رات بھر منہ میں سڑتے رہتے ہیں۔ ذرات دن میں نقصان نہیں پہنچاتے ہیں کیونکہ دن بھر ہم بات چیت کرتے رہتے ہیں یا کھانا کھاتے ہیں یا کسی نہ کسی قسم کی حرکت ضرور کرتے رہتے ہیں جس سے وہ ذرات ایک مقام پر ٹھہر نہیں سکتے ہیں لیکن رات کے وقت جب ہم سو جاتے ہیں تو ہمارا منہ اس وقت ساکت ہوتا ہے اس وقت وہ ذرات ایک جگہ پر ٹھہر کر منہ میں سڑتے ہیں اور رات بھر سڑتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ صبح جب ہم اُٹھتے ہیں تو ہمارے منہ میں لعاب ہوتا ہے اور منہ سے بری بو آتی ہے۔

اس لئے ہم کو چاہیئے کہ ہم کھانا کھانے بعد سونے سے پیشتر پانچ منٹ خوب مسواک کریں، تاکہ کھانے کے تمام ذرات صاف ہو جائیں اور جب ہم بستر پر جائیں تو ہمارا منہ بالکل صاف ہو۔

دانت

دانت بھی قدرت نے کیا عجیب نعمت عطا کی ہے جس کے بغیر ہم کھانے میں لذت نہیں پا سکتے۔ لیکن بہت سے لوگ ان کی قدر نہیں کرتے اور انھیں صاف نہیں رکھتے ہیں حالانکہ ان کے صاف کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ ان کی صفائی میں ۵ منٹ لگتے ہیں اور یہ ۵ منٹ میں اچھی طرح صاف رہ سکتے ہیں اگر پابندی سے روزانہ صاف کئے جائیں۔

اب میں یہ بتاؤں گا کہ دانتوں کو کس طرح نقصان پہنچتا ہے اور وہ کیوں بے کار ہو جاتے ہیں۔

دانت کی شکل اس قسم کی ہوتی ہے جیسی کہ تصویر میں دی گئی ہے دانت کی نیچے کے حصے کو جڑ کہتے ہیں۔ یہ جڑ بھی اسی طرح کام کرتی ہے جس طرح کہ درخت کی جڑیں جو چاروں طرف زمین میں مضبوطی سے گڑ جاتی ہیں اور درخت کو تھامے رہتی ہیں۔ دانتوں کے نیچے کی یہ دو جڑیں بھی دماغ کی ہڈی کو مضبوطی سے پکڑ لیتی ہیں اور دانت کو ہلنے نہیں دیتیں۔

دانت دو مختلف مادّوں سے بنا ہوتا ہے ایک تو بہت ہی سخت چمکدار ہوتا ہے یہ باہر کا حصہ ہے جس سے ہم کھانا چباتے ہیں لیکن دوسرا اندرونی مادہ بہت ہی نرم گلگلا ہوتا ہے۔ جتنے بھی دانت کے امراض ہوتے ہیں وہ اسی نرم مادہ میں ہوتے ہیں۔ باہر کا سخت مادہ اس نرم مادہ کی حفاظت کرتا ہے اور وہ جراثیم کو نرم مادہ میں نہیں جانے دیتا۔ لیکن باوجود سخت مادہ کی حفاظت کے بھی جراثیم کسی نہ کسی طرح اندر مادہ میں داخل ہو جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ہم کھانا کھا چکتے ہیں تو دانتوں کو صاف نہیں کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے کھانے کے ذرات ان خلاؤں میں رہ جاتے ہیں جو ہمارے دانتوں کے بیچ میں ہوتے ہیں۔ اگر دانت خوب صاف کر لئے جائیں تو وہ ذرات ان میں نہیں رہنے پائیں گے۔ لیکن جب دانت صاف نہیں ہوتے ہیں اور وہ ذرات خلاؤں میں رہ جاتے ہیں تو وہ بعد میں سڑنے لگتے ہیں۔ جہاں پر وہ سڑتے ہیں وہاں دانتوں کے سخت مادہ میں ایک باریک سا سوراخ ہو جاتا ہے۔ جب سوراخ ہو گیا تو جراثیم اندر کے نرم مادہ میں آسانی سے داخل ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ تو ہمیشہ منتظر ہی رہتے ہیں کہ کوئی راستہ ملے اور وہ اندر داخل ہوں سخت مادہ میں سے تو وہ داخل نہیں ہو سکتے جب نرم مادہ میں سوراخ ہو جاتا ہے تو وہ اندر داخل ہو جاتے ہیں اور پورے دانت کو سڑا دیتے ہیں۔ شروع میں جب جراثیم اندر جاتے ہیں تو معمولی سا درد ہوتا ہے۔ لوگ اس معمولی درد کا خیال نہیں کرتے ہیں اور

سمجھتے ہیں کہ معمولی سا درد ہے خود ہی اچھا ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوتا، اگر معمولی درد کے دوران میں بھی باقاعدہ دانتوں کی صفائی شروع کر دی جائے تو دانت بچ سکتے ہیں، لیکن اس طرف لوگ خیال نہیں کرتے، اور درد رفتہ رفتہ بڑھ جاتا ہے اور جراثیم اندر ہی اندر نرم مادے کو کھا جاتے ہیں اور دانت کھوکھلے پڑ جاتے ہیں۔ بالآخر دانت کی جڑیں کٹ جاتی ہیں اور دانت گر پڑتے ہیں۔

لیکن اگر اتنا ہی ہو کہ دانت سڑ جائیں اور گر جائیں تو بھی غنیمت ہے مگر وہ تو اور ترقی پکڑتے ہیں۔ یعنی جب دانت سڑ جاتے ہیں تو ان کے سڑنے کی وجہ سے منہ میں ایک خاص قسم کا زہر پیدا ہو جاتا ہے جو کھانے کے ساتھ ملکر پیٹ میں چلا جاتا ہے اور انسان اس زہر کی وجہ سے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

شاعر لوگ دانتوں کو موتی سے تشبیہ دیتے اور انھیں گوہرِ دنداں کہتے ہیں۔ بالکل درست ہے، کیونکہ دانت حقیقت میں موتی ہیں اور ایسے موتی جن کو کھو کر انسان پھر دوبارہ حاصل نہیں کر سکتا۔ نقلی موتی مل سکتے ہیں، مگر جو بات اصل میں ہے وہ نقل میں کہاں! لوگ ان کی قدر نہیں کرتے حالانکہ یہ موتیوں سے زیادہ قیمتی اور قابلِ قدر ہیں۔ کسی بادشاہ کے یا امیر کے پاس اگر موتی ہوتے ہیں تو وہ ان کو بڑی حفاظت سے رکھتا ہے ان کو صندوقوں میں رکھ کر بڑے بڑے تالے ڈالتا ہے پولیس کا پہرہ رہتا ہے کہ کہیں چور چرا کر نہ لے جائیں لیکن اگر وہ ان بیش بہا موتیوں کی قدر نہیں کرتا اور ان کو جراثیم کے خطرناک حملوں سے نہیں بچاتا تو اس کی ان موتیوں کی حفاظت بے کار ہے کیونکہ اگر وہ موتی ضائع ہو بھی جائیں تو دوسرے آ سکتے ہیں لیکن یہ موتی ایسے انمول ہیں کہ ان کے خریدنے کے لئے اگر دنیا بھر کے موتی جمع کئے جائیں تو بھی یہ دوبارہ نہیں حاصل ہو سکتے۔

آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ دانت کس طرح خراب ہوتے ہیں۔ اب ان کی حفاظت کے متعلق معلوم کرنا چاہیے ان کی حفاظت اور ان کی قدر جو کچھ ہے وہ یہ کہ ان کو ہمیشہ صاف رکھو صاف رکھنے سے ہمارے دانتوں کے خلا میں کھانے کے ذرات رہنے نہیں پائیں گے اور ہم جراثیم کے حملوں سے بچے رہیں گے۔

دانت ہم کو مسواک سے صاف کرنے چاہئیں، کیونکہ مسواک کے ریشے ہمارے دانتوں کے خلاؤں میں آسانی سے چلے جائیں گے۔ اور خلاؤں کو کھانے کے چھوٹے چھوٹے ذرات سے صاف کر دیں گے اکثر لوگ برش استعمال کرتے ہیں وہ بھی اچھی چیز ہے لیکن ایک برش زیادہ عرصہ تک کام نہیں دے سکتا ہے کیونکہ بار بار اسی برش کے صاف کرنے سے اس کی جڑوں میں بھی جراثیم کا اثر پیدا ہو جاتا ہے اور پھر نیا برش خریدنے کی ضرورت پڑتی ہے اس لئے مسواک ایک ایسی چیز ہے جو بقول شخصے

"کم خرچ بالانشیں"

کہ دام بھی کم خرچ ہوں اور کام بھی عمدہ نکل آئے، مسواک کے استعمال سے دانت جلد صاف ہو جاتے ہیں اور اچھے صاف ہوتے ہیں یوں تو وہ بھی دو تین دفعہ کے استعمال سے خراب ہو جاتی ہے اس لئے چاہیے کہ دو تین دفعہ ایک طرف سے استعمال کیجائے پھر اس کا وہ حصہ جو استعمال ہو چکا ہے کاٹ دیا جائے تو وہ از سرِ نو استعمال کے قابل ہو جاتی ہے۔ اس طرح مسواک کئی دن تک

(ڈراما)

(۳)

دوسرا منظر

(جماعت میں پڑھائی ہو رہی ہے۔ لڑکے دری پر بیٹھے ہیں اور ان کے سامنے ڈیسکوں پر کتابیں وغیرہ ہیں۔ طرار سزا کے طور پر کھڑا کر دیا گیا ہے تختۂ سیاہ کے پاس ماسٹر صاحب ہاتھ میں کھریا لئے کھڑے ہیں)

ماسٹر صاحب:۔ ہمارا درسی کتاب کا سبق ختم ہوگیا۔ اب ہم اپنی طرف سے ایک سبق بنا کر لکھیں گے جس طرح کتاب لکھنے والے کسی چیز کے متعلق کچھ دوسروں سے سنی ہوئی کچھ اپنی دیکھی ہوئی اچھی اور سچی باتیں جمع کرکے سبق بنا لیتے ہیں اُسی طرح ہم بھی بنائیں گے۔ اچھا بتاؤ آج کے سبق میں کس چیز کا ذکر ہوا؟

ایک لڑکا:۔ ماسٹر صاحب جہاز کا۔

دوسرا:۔ نہیں ماسٹر صاحب، چاند کا۔

صالح:۔ ماسٹر صاحب، سچائی کا۔

اظہار:۔ ماسٹر صاحب جو آپ کا جی چاہے۔

داؤد:۔ ماسٹر صاحب، حُبّ ... (جھینپ کر چپ ہو جاتا ہے)

ماسٹر صاحب:۔ ہاں ہاں کہو کہو، ڈرتے کیوں ہو۔ حُبّ وطن کا۔ تم بولو طرار تم نے کچھ نہیں کہا۔

طرار:۔ ماسٹر صاحب جو جلدی سے ختم ہو جائے۔

(سب لڑکے ہنستے ہیں)

ماسٹر صاحب:۔ تمہارا دل سوائے شرارت کے کسی چیز میں نہیں لگتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تمہارا کیا علاج کیا جائے۔ رات تم نے اتنی بُری حرکت کی۔ آج صبح ایک لڑکے کا کرتہ پلنگ کی چادر سے سی دیا پچاس نمبر اس کے کٹے۔ اب پچاس باقی ہیں۔ اور آج اس نصف سال کا آخری دن ہے۔ پرسوں سے دو ہفتے کی چھٹی ہے۔ اگر یہ نمبر بھی کٹ گئے تو گھر نہیں جانے پاؤگے پڑھائی کا یہ حال ہے کہ کل کا کوئی سبق یاد نہیں۔ آخر تمہارا انجام کیا ہوگا۔

(طرار سر جھکائے خاموش کھڑا ہے۔ اظہار اس کی طرف دیکھ کر ہنستا ہے۔ وہ طرار کا منہ چڑاتا ہے)

صالح:۔ ماسٹر صاحب پھر کونسا سبق ہوگا؟

ماسٹر صاحب:۔ داؤد نے رُکتے رُکتے حبّ وطن کا نام لیا تھا،

شاید اوروں کو بھی یہ خیال آیا ہو مگر انھوں نے اس ڈر سے نہ کہا ہو کہ رات اسی عنوان کی نظم پڑھنے پر سزا مل چکی ہے۔ کیوں یہی بات ہے؟

داؤد:۔ جی ہاں ماسٹر صاحب۔

ماسٹر صاحب: تو اکثر لوگوں کو اس وقت حب وطن سے دلچسپی ہے اس لئے ہم اس کے متعلق سبق بنائیں گے۔

(تختہ سیاہ پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہے۔

"حب وطن")

اظہار:۔ (طرار کی طرف اشارہ کرکے آہستہ سے) کیوں بڑے میاں لومڑ شرم نہیں آتی۔

طرار:۔ چپ رہ، شرم کاہے کی، ماسٹر صاحب بھی تو کھڑے ہیں۔

ماسٹر صاحب: اچھا دیکھیں ہم لوگ حب وطن کے معنی بھی سمجھتے ہیں بتاؤ اس کے کیا معنی ہیں؟

صالح:۔ وطن کی محبت۔

ماسٹر صاحب: وطن کس کو کہتے ہیں؟

ایک لڑکا:۔ دیس کو۔

ماسٹر صاحب: بھئی میں ذرا دیر میں سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ دیس کیا چیز ہے؟

صالح:۔ جس میں آدمی رہتا ہے۔

ماسٹر صاحب: آدمی تو اپنے گھر میں رہتا ہے، بلکہ اس کی ایک کوٹھری میں۔ کیا وہی وطن ہے۔ اور اسی کی محبت حب وطن ہے؟

اظہار:۔ نہیں ماسٹر صاحب دیس اپنے گاؤں کو کہتے ہیں۔

داؤد:۔ نہیں ماسٹر صاحب اپنے ضلع کو۔

صالح:۔ اپنے ملک کو۔

ماسٹر صاحب: (لڑکوں سے) کون ٹھیک کہتا ہے؟

سب لڑکے:۔ ماسٹر صاحب، صالح ٹھیک کہتے ہیں۔

ماسٹر صاحب:۔ کہا تو سب ہی نے ٹھیک مگر یہ آدمی کے دل پر موقوف ہے۔ جس کا دل چھوٹا اس کا وطن چھوٹا جس کا دل بڑا اس کا وطن بڑا۔ اچھا تو تم لوگوں کے خیال میں وطن ملک کو کہتے ہیں مگر مجھے ملک کے معنی معلوم نہیں۔ کیا مشکل ہے۔

اظہار:۔ جیسے ہندوستان۔

ماسٹر صاحب:۔ یہ تو مثال ہوئی ملک کی تعریف کیا ہے؟

صالح:۔ ملک زمین کے ایک حصے کو کہتے ہیں جسے قدرتی حدوں نے اور حصوں سے الگ کر دیا ہو۔

ماسٹر صاحب: اس تعریف کو تم سب سمجھتے ہو؟

اظہار:۔ جی ہاں آج ہی جغرافیہ کے گھنٹے میں سمجھائی گئی ہے۔

ماسٹر صاحب:۔ میں تو ابھی اچھی طرح نہیں سمجھا مگر خیر مجھے اس وقت تم سے دوسری بات سمجھنا ہے۔ تو حب وطن اپنے ملک یا دیس کی محبت کو کہتے ہیں۔ یہ جملہ لکھوں؟

سب لڑکے:۔ جی ہاں، ماسٹر صاحب۔

(ماسٹر صاحب تختہ سیاہ پر لکھتے ہیں)

ماسٹر صاحب:۔ اچھا بھئی یہ بتاؤ کہ محبت اس جگہ سے ہوتی ہے جس پر انسان رہتا ہے یا ان لوگوں سے جو اس جگہ رہتے ہیں۔

صالح:۔ دونوں سے۔

ماسٹر صاحب:۔ زیادہ کس سے ہوتی ہے؟

داؤد:۔ جگہ سے۔

اظہار:۔ لوگوں سے۔

ماسٹر صاحب:۔ (اور لڑکوں سے) تمہاری کیا رائے ہے؟

کچھ لڑکے:۔ جگہ سے۔

کچھ اور لڑکے:۔ لوگوں سے۔

ماسٹر صاحب:۔ یہ تو اختلاف رہا کچھ فیصلہ نہیں ہوا۔ اچھا یہ بتاؤ اپنے گھر میں محبت ماں باپ بھائی بہن سے زیادہ ہوتی ہے یا گھر کی زمین اور دیواروں سے۔

کچھ لڑکے:۔ ماں باپ سے۔

کچھ اور لڑکے:۔ بھائی بہن سے۔

ماسٹر صاحب:۔ غرض جتنی محبت ساتھ رہنے والوں سے ہوتی ہے اتنی رہنے کی جگہ سے نہیں ہوتی۔ اس کی میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ٹھیک ہو تو مانو ورنہ نہ مانو۔ آدمی گھر میں اکیلا رہ جائے عزیز دوست سب چلے جائیں تو گھر کاٹے کھاتا ہے لیکن اگر گھر چھوٹ جائے اور عزیز دوست ساتھ ہوں تو اتنی تکلیف نہیں ہوتی۔

سب لڑکے:۔ سچ ہے، ماسٹر صاحب۔

ماسٹر صاحب:۔ تو حب وطن میں سب سے بڑی چیز دیس والوں کی محبت اور اس سے کم اس دیس کی محبت ہے جس میں انسان رہتا ہے، یہ جملہ لکھوں؟

سب لڑکے:۔ جی ہاں، ماسٹر صاحب۔

(ماسٹر صاحب تختۂ سیاہ پر لکھتے ہیں)

(اظہار پھر طرار کو دیکھ کر ہنستا ہے۔ طرار دیوار پر چھیٹا مارتا ہے، جیسے کوئی کیڑا اکڑا ہوا اور اظہار کی گردن پر کچھ پھینکتا ہے اظہار گردن پر ہاتھ مار کر چیخ اٹھتا ہے)

اظہار:۔ ہائے رے۔ ماسٹر صاحب، دوڑیئے۔

ماسٹر صاحب:۔ (مڑکر) کیا ہوا؟

سب لڑکے:۔ کیا ہوا؟

اظہار:۔ (روتے ہوئے) ماسٹر صاحب۔ طرار نے کوئی کیڑا ڈال دیا نہ جانے بچھو ہے کیا ہے؟

طرار:۔ نہیں ماسٹر صاحب، کاغذ کی گولی ہے، کیڑا ویڑا کچھ نہیں۔

ماسٹر صاحب:۔ طرار اب بات حد سے گذر گئی تمہیں نہ کسی کا خوف باقی ہے نہ شرم۔ تمہارے دل پر نہ ملامت کا اثر ہوتا ہے، نہ دلسوزی کا۔ میں تمہارے رہے سہے پچاس نمبر بھی کاٹتا ہوں۔ اب تعطیل میں یہیں پڑے سڑنا اور اپنے کئے کی سزا بھگتنا۔ یہی نہیں بلکہ میں آج صدر مدرس صاحب کو تمہارا کرتوت سناؤنگا۔ وہ اور سزا دیں گے۔ جاؤ یہاں سے نکل جاؤ۔ اپنی منحوس صورت مجھے نہ دکھاؤ۔

(طرار سر جھکائے باہر چلا جاتا ہے، پردہ گرتا ہے)

(باقی آئندہ)

فاطمہ اور رحیم الدین

گذشتہ نمبر میں بیان کیا گیا تھا کہ رسمیں اور قانون کیسے بنتے ہیں اور شروع میں جب بستیاں قایم ہوتی ہیں تو ان میں آپس کے جھگڑے کون چکاتا ہے۔

باپ کی باتیں جب ختم ہوگئیں تو فاطمہ اور رحیم الدین سونے کے لئے اپنے اپنے پلنگ پر لیٹے لیکن دونوں کو نیند نہیں لگی تھی، رحیم الدین نے پہلی مرتبہ ایک قیدی دیکھا تھا، اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی حالت بیان کرکے فاطمہ کو مرعوب کرے، فاطمہ کے دل میں یہ بات کھٹک رہی تھی کہ ایک بیچارے آدمی کو ایسی سخت تکلیف پہنچائی جاتی ہے، اور کسی کو اس پر رحم نہیں آتا۔ لڑکوں کے دل ایسے نرم نہیں ہوتے، اور رحیم الدین نے جب باتیں چھیڑدیں اور قیدی کی صورت کا خاکہ کھینچا تو اس کے لب و لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے قیدی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یہ انداز فاطمہ کو ناگوار ہوا۔ اس نے کہا:۔

آپ تو اس طرح سے باتیں کرتے ہیں جیسے قیدی کو سزا دینا کوئی بڑی خوشی کی بات ہے، کوئی آپ کو اس طرح پکڑ کر لے جاوے تو معلوم ہو!"

"جی ہاں، مجھے بھلائی کیوں پکڑے گا۔ کیا میں نے کسی کا خون کیا ہے یا کسی کے ہاں ڈاکہ ڈالا ہے۔

اور اس کے بعد رحیم الدین نے کئی واقعے بیان کئے جو اس نے ادھر اُدھر سے سنے تھے کوئی قتل کا قصہ تھا، کوئی چوری کا، کوئی ڈاکے کا۔ یہ سب سن کر فاطمہ کو مجرموں سے ہمدردی نہیں رہی۔ اس کے دل ہی یہ خوف پیدا ہوگیا کہ کہیں کوئی اسے مار نہ ڈالے، یا گھر کا سامان نہ اُٹھالے جائے، رات بھر اس نے ڈراؤنے خواب دیکھے، اور سویرے اُٹھی تو اس کی طبیعت بہت بے چین تھی۔ دن کا تو کام مقرر تھا، اسے اتنی مہلت نہ ملی کہ مجرموں کے بارے میں کچھ سوچے۔ مگر رات کو کھانے کے بعد وہ فوراً باپ کے پاس جاکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی:۔

"ابا جان ہم کو مجرموں کے قصے سنائیے۔ کیا وہ سچ مچ لوگوں کو مار ڈالتے ہیں اور ان کے گھروں میں آگ لگا دیتے ہیں؟"

باپ نے کہا "ہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے جیسے ہر انسان کے پیچھے ہزاروں بیماریاں لگی رہتی ہیں اور وہ ذرا کم زور پڑا تو اس پر ایک نہ ایک دھاوا بول دیتی ہے۔ ویسے ہی ہر بستی

کے ہزاروں دشمن ہوتے ہیں۔ قانون اس لئے بنائے جاتے ہیں اور عدالتیں اس لئے قائم ہوتی ہیں کہ بستی کے رہنے والے ایک دوسرے پر ظلم نہ کرسکیں، سپاہی اور فوجیں اس لئے ہوتی ہیں کہ دوسری بستیوں کے لوگ زیادتیاں نہ کرسکیں۔ ان سب کی ضرورت اس سبب سے ہوتی ہے کہ لوگوں کے دل برے ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے کی بجائے لڑتے ہیں، دوسرے کی خوشی میں شریک نہیں ہوتے، اس کو دکھ پہنچایا چاہتے ہیں۔ بستی کے اندر اس طرح کے جو لوگ ہوتے ہیں انہیں مجرم کہتے ہیں۔ وہ نہ خود شانتی سے رہتے ہیں نہ چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا رہے۔"

فاطمہ نے جھٹ سے پوچھا: "تو پھر یہ سب پہلے ہی سے مار ل نہیں ڈالے جاتے؟"

باپ نے جواب دیا: "سزا اسی وقت دی جاتی ہے جب کوئی شخص جرم کرے۔ کسی کو کسی کے دل کا حال تو معلوم نہیں ہوتا اس لئے کوئی شخص دل میں برے خیالات رکھے تو اسے سزا نہیں دی جاسکتی۔ ہم صرف اس کی کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں برے خیالات آہی نہ سکیں۔ لیکن جیسے بعض لوگ ردگی پیدا ہوتے ہیں ویسے بعض ایسے ہوتے ہیں جن کے دلوں میں برے خیالات اور ارادے جگہ نہیں کرپاتے۔ یہ لوگ جرم کرتے ہیں انہیں سزا دی جاتی ہے۔ یہ لوگ جرم کرتے ہیں اور انہیں سزا دیجاتی ہے، اس نیت سے کہ وہ پھر جرم نہ کریں۔

فاطمہ کے اندیشے ان باتوں سے دور نہیں ہوئے۔ اس نے پوچھا تو پھر اگر ہمارے گھر میں کوئی آگ لگا دے تو ہم کیا کریں گے؟

باپ نے کہا: میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ بستی کے اندر حفاظت کے لئے قانون ہوتے ہیں اور عدالتیں، اور باہر کے دشمنوں سے بچانے کے لئے فوجیں، لیکن قاضی اور جج تو مجرموں کو گرفتار نہیں کرسکتے نہ فوجیں بغیر سپہ سالار کے لڑسکتی ہیں۔ اس لئے اور انتظام کرنا ہوتا ہے۔ بستی کے جو اچھے یا بڑے لوگ ہوتے ہیں وہ حاکم بنائے جاتے ہیں، ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ سب سے قانون کی پیروی کروائیں، جو قانون کے خلاف کرے اسے عدالت میں پیش کریں اور عدالت کا جو فیصلہ ہو اس پر عمل کریں، اگر وہ سزا کا حکم دے تو سزا دلوائیں، اور اگر وہ بے گناہ قرار دے تو چھوڑ دیں۔ پھر حاکم کا کام یہ ہوتا ہے کہ اور بستیوں سے اپنی بستی کو محفوظ رکھیں، جب لڑنے کی ضرورت ہو تو لڑیں، اور نہیں تو اس کی کوشش کریں کہ ان کی بستی کی طاقت اور دولت اور اس کا اثر بڑھتا رہے، تاکہ دوسری بستیاں اسے کمزور نہ سمجھیں۔ اس کے علاوہ حاکم کا یہ کام بھی ہوتا ہے کہ بستی میں لوگوں کی تعلیم کا انتظام کرے، تجارت کے لئے آسانیاں پیدا کرے، بستی کو صاف ستھرا رکھے، اور اسکی اور تمام ضرورتیں پوری کرے اس سارے کام کو ہم حکومت کرنا کہتے ہیں۔ جتنی حکومت اچھی ہو، اتنے ہی لوگ چین سے رہتے ہیں۔ ہمارے مکان میں کوئی آگ اس لئے نہیں لگا سکتا کہ چاروں طرف روشنی ہے، اگر کوئی آگ لگائے گا تو ہم یا ہمارے ہمسایے اسے دیکھ لیں گے۔ اور پولیس کو بلا کر اسے پکڑوا دیں گے۔ لیکن اگر ہمارے ہاں کی حکومت خراب ہو تو بہت فساد ہوتا رہے، لوگ مصیبتیں اٹھاتے رہیں اور انکی فریاد سننے والا کوئی نہ ہو، پولیس مجرموں کو عدالتوں میں پیش نہ کرے۔ اسی وجہ سے لوگ چاہتے ہیں کہ حکومت اچھی ہو۔ اچھا اب باتیں کافی ہوچکیں، جاؤ، سو رہو۔

دنیائے سائنس کے روشن ستارے

لنڈن کے رائل انسٹی ٹیوشن کے سامنے رنگ برنگ کی گاڑیاں کھڑی ہیں۔ ہال میں لوگوں کا ایک ہجوم داخل ہو رہا ہے۔ لوگ بنچوں پر بیٹھتے جا رہے ہیں، ان کے چہروں سے ان کے شوق کی کیفیت ظاہر ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی دلچسپ اور غیر معمولی چیز کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ سامنے میز پر سائنس کے کچھ آلات ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں۔ آن کی آن میں تمام حاضرین پر سکتے کا ایک عالم طاری ہو جاتا ہے۔ ان سب کی توجہ کا مرکز ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ سامنے چبوترے پر ایک دبلا پتلا، پستہ قد نوجوان جدید فیشن کا لباس زیب تن کئے ہوئے کھڑا ہے۔ اس کے ہونٹوں کی پہلی ہی جنبش نے حاضرین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ یہ نوجوان اپنے جدید انکشافات عملی طور پر دکھانے کو ہے۔ ہر شخص کی نظر اس کے ہاتھ کی حرکت کے تابع ہے۔ اس کے دلچسپ اور دلکش انداز بیان نے سامعین پر جادو کا اثر پیدا کر دیا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تمام ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھتا ہے۔ کامل دو گھنٹے تک بیرونی دنیا سے بے خبر رہنے کے بعد حاضرین تحسین و آفریں کا وظیفہ پڑھتے ہوئے اپنی جگہوں سے اُٹھتے ہیں اور جلسہ برخاست ہو جاتا ہے۔

آخر یہ جادو بیان مقرر کون ہے؟ ہمفری ڈیوی رائل انسٹی ٹیوشن کا پروفیسر کیمیا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، کی مثل ڈیوی کی جادو بیانی کی مکمل تشریح ہے ابھی وہ مشکل سے نو برس کا تھا کہ ڈیوی اپنے ہم مکتب لڑکوں کو بازار کے کسی کونے پرلے جا کر مختلف قسم کے قصے اور کہانیاں سناتا ان میں سے کچھ تو ایسی ہوتیں جو اس نے اپنی ماں اور نانی سے سنی تھیں اور کچھ اس کی اپنی من گھڑت ہوتیں۔ تقریر کرنے کا شوق اس کو بچپن ہی سے تھا اسقدر تھا کہ کبھی کبھی تنہا کرسی پر کھڑا ہو کر کمرے کی دیواروں کو اپنا مخاطب بناتا۔

مدرسے میں اس کا شمار عام طور سے شرارتی اور کاہل لڑکوں میں ہوتا تھا۔ اس لئے مدرسہ کا ہیڈ ماسٹر اکثر اسکی گوشمالی کیا کرتا لیکن با ایں ہمہ وہ چست و چالاک، موقع شناس اور حاضر جواب تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ مدرسہ میں اکثر کان کھینچے جاتے ہیں تو ایک روز دونوں کانوں پر خوب مرہم لگا کر مدرسہ آیا۔ اُستاد نے جب اس حرکت کی وجہ دریافت کی تو نہایت متانت سے برجستہ جواب دیا "تاکہ گوشمالی نہ ہو" مدرسے میں اس کی تعلیم کا زمانہ بہت ہی محدود تھا۔ سیر و تفریح اور کھیل کود اور تقریر بازی کا وہ بہت

دلدادہ تھا۔ لیکن اس کی والد کی اچانک موت نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ اسکول اور اس کے ساتھ تمام کھیل کو دچھوڑ کر وہ ایک ڈاکٹر کے ہاں دواسازی وغیرہ کا کام سیکھنے لگا۔ یہاں اس کو ایسا کام مل گیا جس کی طرف وہ قدرتی طور پر مائل تھا۔ دواخانہ کے کاروبار سے اس کو اتنی دلچسپی ہوگئی کہ کہ ہر وقت مختلف تجربوں میں لگا رہتا۔ اکثر مکان کے بالائی کمرے پر جاکر دواؤں کی ترکیب کے متعلق مختلف تجربوں میں لگا رہتا۔ مالک مکان کبھی کبھی کہہ اٹھتا کہ اس لڑکے نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ یہ کسی نہ کسی روز ہم سب کو ہوا میں اُڑا کر رہے گا۔

اسی اثنا میں ڈیوی کی چند ایسے لوگوں سے ملاقات ہوگئی جو اسکی آئندہ کامیابی کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ ایک روز جب کہ وہ اس مکان کے سامنے کھڑا تھا اس زمانہ کے مشہور سائنسداں گلبرٹ کا اس راستہ سے گذر ہوا۔ گلبرٹ نے اس نوجوان کو دیکھ کر لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کس کا لڑکا ہے؟ جواب ملا کہ "وہ ایک چوب تراش کا لڑکا ہے اور سائنس کے تجربے کرنے کا بہت دلدادہ ہے"۔ اس کے بعد گلبرٹ ڈیوی کا بہت بڑا مددگار بن گیا۔

گلبرٹ کی کوشش اور سفارش سے ڈیوی کو کلفٹن کے ایک ہسپتال میں مددگار سائنس کی جگہ مل گئی۔ اس ہسپتال میں گیسوں کے خواص اور ماہیت کی تحقیقات ہوتی اور گیسوں ہی کے ذریعے اکثر بیماریوں کا علاج کیا جاتا۔ جس وقت ڈیوی گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے روانہ ہونے کو تھا، اس کے شاعرانہ تخیل نے اس کو تعین دلادیا کہ بظاہر تو گاڑی اس کو کلفٹن لیجا رہی ہے لیکن درحقیقت وہ اس کو شہرت اور ناموری کے دروازے پر لے جاکر پہنچائے گی۔

ڈیوی کا یہ خیال حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا۔ اس کا قول تھا کہ اگرچہ میرے پاس نہ دولت ہے، نہ حکومت اور نہ شرافت نسبی۔ تاہم اگر میں زندہ رہا تو بنی نوع انسان کی ایسی خدمت کرجاؤں گا جو اس حالت سے کسی طرح کم نہ ہوگی جب کہ یہ چیزیں میرے پاس ہوتیں۔

کلفٹن پہنچ کر وہ تحقیقات میں مصروف ہوگیا۔ اس زمانہ کے ایک ڈاکٹر کا خیال تھا کہ نائٹرس آکسائڈ بہت ہی زہریلی اور مہلک گیس ہے۔ ڈیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کے شوق تحقیق کو گدگدی اٹھی اور اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ زہریلی گیس کے خواص کو اپنے اوپر تجربہ کرکے معلوم کرے گا۔ چنانچہ اس نے یہ گیس لی اور اس کو تھوڑی مقدار میں سونگھ کر اندازہ کیا کہ اس ڈاکٹر نے گیس کے مہلک اثرات بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اس کے بعد اس نے اس گیس کو چند منٹ تک سونگھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بے ہوشی کا عالم طاری ہوگیا اور اسی حالت میں وہ کچھ عرصہ تک تمام کمرے میں ناچتا رہا۔ اسی خاصیت کی بنا پر اس کو ہنسانے والی گیس کہتے ہیں۔ اس گیس کے بیہوشی پیدا کردینے کی خاصیت پر اس کو اس زمانہ میں بھی دانتوں کے عمل جراحی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس گیس کے خواص کی اشاعت کے ساتھ ہی ڈیوی کے نام کی بھی شہرت ہونے لگی۔ کلفٹن میں ڈھائی سال کی محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام انگلستان میں ڈیوی کا نام مشہور ہوگیا۔

چین میں ایک حقیقی جمہوری حکومت قائم کرنے کے لئے ایک تعمیری پروگرام تیار کیا گیا ہے جس میں پہلا تعمیری کام یہ ہے کہ عوام کے کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے اور آمد و رفت کے ساتھ حکومت عوام کے لئے زراعت کی اصلاح کرے تاکہ ضروری کھانا میسر آسکے، روئی کی دستکاری کو ترقی دے تاکہ کافی کپڑا تیار ہو سکے، وسیع پیمانہ پر مکانات تعمیر کرائے تاکہ لوگ آرام سے رہ سکیں، نئی ریلیں، سڑکیں اور نہریں بنائی جائیں، تاکہ تجارت کے لئے آسانی ہو سکے۔

دوسرا تعمیری کام یہ ہے کہ عوام کو سیاسی معلومات بہم پہنچانے کیلئے حکومت کا فرض ہے کہ ان کو تربیت اور ہدایت دے تاکہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ کس طرح سیاسی حقوق سے کام لیا جا سکتا ہے۔

تیسرا تعمیری کام یہ ہے کہ اقلیتوں کا خوف اور ڈر دور کرنے کے لئے حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان کے مفاد کی حفاظت کرنے میں حتی الامکان مدد کرے۔ ان کو یہ بتائے کہ حکومت خود اختیاری کو کس طرح چلایا جا سکتا ہے، اور مرکزی حکومت میں ان کے کیا حقوق ہیں

تعمیری کام ترتیب کے لحاظ سے تین زمانوں میں تقسیم کیا گیا ہے

(الف) فوجی عمل کا زمانہ

(ب) سیاسی تربیت کا زمانہ

(ج) دستوری حکومت کا زمانہ

جمہوریت قائم ہونے کے شروع میں ضرور ایک وقت ایسا آتا ہے، جس میں اندرونی شورش ہوتی ہے، یعنی فوراً امن قائم ہونا مشکل ہے۔ ایسی حالت میں ضرورت یہ ہوتی ہے کہ فوجی قوت سے ان شورشوں کو دبایا جائے جو جمہوری حکومت کے خلاف پیدا ہوتی ہیں۔ چونکہ شورشوں کو دبانے کے لئے فوج سے کام لینا پڑتا ہے، اس لئے اس زمانہ کو فوجی عمل کا زمانہ کہا گیا ہے۔

سیاسی تربیت کا زمانہ اُس وقت شروع ہوتا ہے جس وقت کہ امن قائم ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک تمام ملک میں امن قائم نہ ہو اس وقت تک سیاسی تربیت کا زمانہ شروع نہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک ضلع میں امن قائم ہو جائے تو اس ضلع کی سیاسی تربیت کا زمانہ اس کے امن قائم ہونے کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔

سیاسی تربیت کے زمانہ میں حکومت کو تربیت یافتہ افسران کو مختلف مقامات میں بھیجنا چاہیئے، تاکہ وہ باشندوں کی مقامی حکومت کے قائم کرنے اور چلانے میں مدد کریں۔ مقامی حکومت کا نظام اس وقت مکمل ہوتا ہے جب کہ اس مقام کے رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے تمام ضروریات اور لوازمات مہیا کرے، مثلاً حفاظت کے لئے پولیس کی ضرورت ہے۔ آمد و رفت کے لئے ریل اور سڑکوں کی ضرورت ہے۔ خبر رسانی کے لئے ڈاکخانہ تارگھر، لاسلکی خانہ وغیرہ کی ضرورت ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں کے باشندوں کو اصول جمہوریت اچھی طرح سکھایا جائے تاکہ وہ اپنے حقوق کو پہچان سکیں، اور ان کا بے جا طور پر استعمال نہ کریں، اور جب وہ اپنے مقامی افسران کا انتخاب کرنا چاہیں تو نا قابل اور غلط آدمی نہ چنیں، چونکہ اس زمانہ میں عوام کو تمام سیاسی باتیں سکھائی جاتی ہیں، اس لئے اسکو سیاسی تربیت کا زمانہ کہتے ہیں۔

جب عوام کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کی روزانہ ضروریات کیا ہیں، اور ان کو کس طرح اپنے سیاسی حقوق کا استعمال کرنا چاہیئے، تو اس وقت دستوری حکومت کا عہد شروع ہوتا ہے۔ اس عہد کے شروع ہوتے ہی مرکزی حکومت میں پانچ مجالس کا قائم ہونا ضروری ہے، یعنی مجلس نگرانی مجلس عدالت، مجلس قانون ساز، مجلس معائنہ، اور مجلس عاملہ۔

جونہی دستور کا اعلان کر دیا جائے، مرکزی حکومت کے انتظامات فوراً قومی کانفرنس کے سپرد کر دیے جائیں یا بالفاظ دیگر قومی کانفرنس کو یہ قوت ہو جائے کہ وہ مرکزی حکومت کے افسران کو مقرر کر سکے یا ان کو ہٹا سکے۔

اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جمہوریت چین کی حکمت عملی دو قسم پر تقسیم ہے۔

(الف) ایک بیرونی۔

(ب) دوسری اندرونی۔

بیرونی حکمت عملی، اس کو کہتے ہیں کہ غیر ممالک کے ساتھ کیا کیا جائے۔ اور اندرونی حکمت عملی اس کو کہتے ہیں کہ ملک چین کے اندر کیا کیا جائے۔

(الف) بیرونی حکمت عملی:-

۱۔ جمہوریت چین کی بیرونی حکمت عملی میں سب سے پہلا نمبر یہ ہے کہ ایسے تمام غیر مساوی معاہدے جن کی رو سے غیر ممالک چین پر نوآبادیات اور مستعمرات قائم کر سکتے ہیں، انھیں امتیازی حقوق حاصل ہیں، کسٹم ان کے ہاتھ میں ہے، اور چین کے اندر وہ اپنی عدالت قائم کر سکتے ہیں۔ ایسے سب کے سب معاہدے منسوخ کر دئے جائیں۔ اور مساوات کی بناء پر نئے معاہدے کئے جائیں۔

۲۔ وہ ملک جو کہ اپنی طرف سے تمام امتیازی حقوق چھوڑنے کے لئے پہلے تیار ہو۔ چین اس کے ساتھ "اکرم القوم" کی حیثیت سے سلوک کرے گا۔

۳۔ چین اور غیر ممالک کے درمیان وہ تمام معاہدے نظر ثانی کے قابل سمجھے جائیں گے جو کسی ایک حیثیت سے بھی چین کے مفاد کے منافی ہیں۔ نظر ثانی اس غرض سے کی جائیگی کہ طرفین کی عظمت باقی رہے اور کسی کو نقصان نہ ہو۔

۴۔ باکسر[1] معاوضہ کی واپس شدہ رقم صرف چین کے تعلیمی کاموں میں خرچ کی جائے گی۔

۵۔ وہ رقم جو چین میں فساد پیدا کرنے کی غرض سے غیر ممالک نے فوجی جنرلوں یا غیر ذمہ دار جماعتوں کو بطور قرض دیا ہے، جمہوریت چین اس کی ادائگی کی ذمہ دار نہیں ہے۔

۶۔ جب تک غیر قومیں چین کے سیاسی مفاد کا لحاظ کرتی رہیں گی، اُس وقت تک وہ قرضہ جو چین کو دیا گیا ہے، واپس کر دیا جائے گا۔

۷۔ ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس میں اجتماعی ادارات، تعلیمی ادارات، بنکنگ کارپوریشن اور ایوانِ تجارت کے نمائندے شامل ہوں اور اس میں اس بات پر غور کیا جائے کہ غیر ممالک کے قرضہ کو کس طرح ادا کیا جائے، اور چین کو غیر ممالک کے معاشی قیود اور بندشوں سے کس طرح چھوڑایا جائے۔

(ب) اندرونی حکمت عملی:-

۱۔ مقامی اور مرکزی حکومت کے درمیان، قوت کی تقسیم میں کوئی توازن قائم رکھا جائے۔ وہ معاملے جو کل ملک سے تعلق رکھتے ہوں ان کا فیصلہ مرکزی حکومت کے ماتحت ہوا۔ اور وہ معاملہ جو صرف مقامی حیثیت رکھتے ہوں، مقامی حکومت کے سپرد کر دئے جائیں۔

۲۔ ہر صوبہ کے باشندوں کو اپنے صوبہ کے دستور و قوانین بنانے کا خود اختیار ہو اور اپنے صوبہ کے لئے افسران کا انتخاب وہ خود کر سکیں بشرطیکہ صوبجاتی اور مرکزی دستور کے مخالف نہ ہو۔ صوبجاتی حکام کا فرض ہے کہ وہ عدالتی نظام کے ماتحت صوبجاتی کاموں کی نگرانی کرے اور مرکزی حکومت کی ہدایت کے مطابق امور سلطنت چلائے۔

۳۔ ہر ضلعی حکومت کو ایک مستقل حکومت سمجھا جائے۔ ہر مستقل حکومت کو یہ حق ہوگا کہ وہ اپنے افسران کا انتخاب کرے، یا انکو عہدوں سے معزول خود کرے، اور قوانین کے بنانے اور ترمیم کرنے میں اپنے اختیار سے کام لے۔ زمین کا لگان، عام زمین کی پیداوار اور قیمت میں اضافہ، اور وہ

---

[1] ۱۹۰۰ء مئی کے مہینہ میں چین میں ایک جماعت جو کہ باکسر (Boxer) کے نام سے موسوم تھی، غیر ممالک کے بہت سے پادریوں کو مار ڈالا جس کی وجہ سے انگلینڈ امریکہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، جاپان، سویڈن اور سوئٹزرلینڈ یعنی آٹھ ممالک نے مل کر پیکن پر جو اُس وقت کا دارالسلطنت تھا حملہ کر دیا۔ شاہ مانچو نے مجبور ہو کر ان سے صلح کر لی۔ اور نقصانات کا معاوضہ دینا منظور کر لیا۔ اب غیر ممالک اسی معاوضہ کی رقم کو واپس کر رہے ہیں بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ رقم فوج یا ریلوے کی تعمیر میں صرف کیجائے۔ مگر چین چاہتا ہے کہ یہ رقم تعلیمی کاموں کے لئے محفوظ رکھی جائے۔

تمام منافع جو جنگلوں، نہروں، اور کانوں سے حاصل ہوتا ہے، مقامی حکومت کے خزانہ میں داخل کیا جائے تاکہ ان کو مقامی صنعت وحرفت کی ترقی دینے، غریبوں، ضعیفوں، یتیموں اور بھوکوں کی مدد کرنے اور صحت عام کے کاموں میں صرف کیا جائے۔

دولت کے قدرتی منبع کی درستی کرنے، اور بڑے بڑے کارخانوں کے قائم کرنے میں اگر مقامی حکومت کو قدرت نہیں ہے تو مرکزی حکومت ان کاموں کو انجام دیگی۔ اور اس طرح جو منافع ہوں گے، وہ مقامی اور مرکزی حکومت میں تقسیم کئے جائیں گے۔

جہاں تک کل سلطنت کے اخراجات کا تعلق ہے، ہر ضلع کو چاہئے کہ وہ اپنی کل آمدنی میں سے کچھ فیصدی مرکزی خزانہ میں داخل کرے۔ اس رقم کی مقدار کم سے کم دس فیصدی اور زیادہ سے زیادہ پچاس فیصدی ہوگی۔

۴۔ رائے دینے کا سب کو یکساں حق ہوگا۔ دولت کی کمی یا زیادتی کا لحاظ رائے دینے کا معاملہ میں نہیں کیا جائے گا۔ یعنی جس طرح امیروں کو رائے دینے کا حق حاصل ہے، اسی طرح غریبوں کو بھی ہوگا۔

۵۔ بجائے رشوت دینے کے لازمی فوجی تعلیم ہر ایک کے لئے لازمی ہوگی۔ ہر شخص کا فرض ہوگا کہ کم سے کم دو سال تک فوجی خدمت انجام دے۔

۶۔ لگان کی رقم خصوصیت کے ساتھ تعین کی جائیگی۔ اور بعض ایسے محصول جن سے عوام کو نقصان پہنچتا ہے، مثلاً لیکن وغیرہ منسوخ کر دئے جائیں گے۔

۷۔ اجتماع میں، اشاعت میں، انجمن قائم کرنے میں، اظہار مافی الضمیر میں عوام کی آزادی قانوناً تسلیم کی جائے گی۔

۸۔ آبادی کی مردم شماری ہوا کرے گی، مزروعہ زمین کا تعین کیا جائے گا، زرعی پیداوار اور سامان رسد کی تخفیف کی جائے گی، تاکہ عوام محتاجی سے محفوظ رہیں۔

۹۔ مزدوری کا نظام جاری کیا جائے گا، مزدوروں کی حالت درست کی جائیگی۔ ان کی انجمنوں کی حفاظت کی جائے گی، اور انھیں ترقی دی جائے گی۔

۱۰۔ مرد اور عورت کی قانونی، معاشی، تعلیمی اور معاشرتی حیثیت برابر سمجھی جائیگی۔ حقوق کی توسیع کرنے میں عورتوں کی ہمت افزائی کیجائیگی۔

۱۱۔ عام تعلیم کے لئے حتی الامکان پوری کوشش کی جائیگی۔ تعلیمی اخراجات میں اضافہ کیا جائے گا اور اس کے مستقل سرمایہ کا تحفظ کیا جائے گا۔

۱۲۔ زمینوں اور ان کی قیمت کے متعلق قانون جاری کیا جائے گا۔ اس قانون کے ماتحت زمیندار کو خود زمین کی قیمت کا اندازہ لگا کر حکومت کو اطلاع دینا ہوگا تاکہ حکومت اس قیمت کے مطابق زمینوں پر محصول لگائے یا اگر ضرورت ہو تو قیمت خریدی جائے۔

۱۳۔ بڑے بڑے کام (مثلاً ریلوے، جہاز اور ہوائی جہاز وغیرہ) کی کمپنیاں جن کے چلانے میں کافی سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ انھیں حکومت انجام دے گی۔

مندرجہ بالا تفصیلات جو کہ چین کے بیرونی اور اندرونی حکمت عملی سے تعلق رکھتی ہیں جمہوریت چین کی معمولی تدبیریں ہیں جن کے ذریعہ سے چین کو غیروں کی ہر قسم کے قیود سے آزاد کرانا اور ملک چین کو بربادی سے بچانا، اور چینی قوم کو تباہی سے محفوظ رکھنا ہے۔

پیام بھائیو! جمہوریت چین کے متعلق جو کچھ مختصر طور پر آپ کو بتانا چاہتا تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا، اب آخر میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ ان اصول نظم ونسق اور بیرونی واندرونی حکمت عملی کی بنا پر کیا یہ ممکن ہے کہ جمہوریت چین، چند سال کے اندر ترقی کرلے؟ اس کے باشندے خوشحال ہوجائیں؟ غیر طاقت اس کو اپنا ہمسر اور ہم رتبہ خیال کریں اور چین کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کریں؟ اگر اس کے متعلق آپکی کوئی رائے ہو تو بتائے، اس سے نہ صرف میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ بلکہ میں آپکی اس آواز کو چینی طلبہ کے حلقہ میں بھی پہنچاؤنگا۔

(ختم شد)

اردو ابجد خوانی کے سلسلے میں کچھ عرصہ سے "کہانی کا طریقہ" مروج اور مشہور ہوا ہے۔ لیکن نہ معلوم کیوں عام طور پر اس طریقہ کا نام اس طرح لیا جاتا ہے گویا یہ بذات خود ایک علیحدہ طریقہ ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر اس کی تمام جزئیات پر غور کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ طریقہ محض ایک دلچسپ تمہید ہے اُس طریقے کی جسے "طریق الصوت" کہتے ہیں۔

کہانی کے طریقے سے کام کرنے والے اُستاد ایک سال کے عرصہ میں جس قسم کی جد وجہد سے کام لیتے ہیں میں اس کو یہاں پر مختصراً بیان کرتا ہوں جس سے یہ بات خود بخود صاف ہو جائیگی کہ اسے علیحدہ طریقہ تصور کرنا کس حد تک درست ہے۔

ابتدا میں بچے کو ایک خاص کہانی عام فہم زبان میں سنائی جاتی ہے پھر اُسے ایک خاص ترتیب میں بچے کو یاد کرایا جاتا ہے۔ بعد اُس کے ایک یا دو پیراگراف کی جملہ شناسی کرائی جاتی ہے، پھر اُس پیراگراف کے لفظ یاد کرائے جاتے ہیں۔ اس کام میں کوئی ڈیڑھ دو مہینے لگ جاتے ہیں (جس میں تقریباً ۳۰-۴۰ لفظ بچہ اچھی طرح پہچاننے لگتا ہے) اس کے بعد حرف شناسی کرائی جاتی ہے۔ حرف شناسی میں طریق الصوت سے کام لیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ تمام حروف اسی طریقے سے بچے کے ذہن نشین کرائے جاتے ہیں۔ حروف ذہن نشین کراتے ہوئے جس طرح بچوں کو لفظ اور جملے بتائے جاتے ہیں، سب میں طریق الصوت سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ تقریباً سال بھر تک جاری رہتا ہے حتیٰ کہ بچہ اُردو پڑھنے لگ جاتا ہے۔ اس ایک سال کے عرصہ میں ابتدائی دو مہینے ایسے ہیں جن میں کہانی کی خاص ترتیب سے کام لیا جاتا ہے گویا بچہ کو اردو سکھانے میں "کہانی کا طریقہ" اور طریق الصوت کی نسبت ۱ اور ۶ کی ہے۔

کہانی کے طریقے میں بچوں کے سامنے جس طرح کہانی پیش کرکے ذہن نشین کرائی جاتی ہے، وہ اس قدر دلچسپ اور خوش کُن ہے کہ عام مدرسین اسکی غیر معمولی عظمت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ بچے کو زبان پر حاوی کرنے والی کوئی اور چیز ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر میں وہ اس طریقہ کے مخالف ہو جاتے ہیں۔

جو مدرسین طریق الصوت سے پڑھانے میں مہارت رکھتے ہیں وہ اس طریقہ سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ کہانی کے طریقہ سے شروع کرنے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ طریق الصوت کا کافی وسیع مطالعہ کیا جائے۔

جہاں تک میں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے "طریق الصوت" اس لئے جلد رائج نہ ہوسکا کہ اس پر عمل کرنے کے لئے کوئی خاص "ترتیب" معین نہیں ہوئی تھی (انجمن ترقی اردو دکن نے ایک ترتیب پیش کی ہے جس کا بعض نقائص کی وجہ سے رواج پانا مشکل ہے۔) ہمارے مدرسہ تحتانیہ نے چند سال کے تجربے کے بعد کہانی کے طریقہ کو تمہیدی حیثیت قرار دیتے ہوئے طریق الصوت کو ایک خاص ترتیب میں پیش کیا ہے۔ مختلف مقامات پر آزمانے کے بعد صحیح رائے پیش کی جاسکے گی۔

کہانی کے طریقے پر عمل کرنے والے کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ طریق الصوت استعمال نہ کرے لیکن طریق الصوت والے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے، لہذا کہانی کا طریقہ، طریق الصوت کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر تعجب ہے کہ اول الذکر نام رائج کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیوں نہ ان دونوں طریقوں کو ملاتے ہوئے ایک تیسرے نام یعنی "قدرتی طریقہ" کو رواج دیں۔

فہرست مضامین
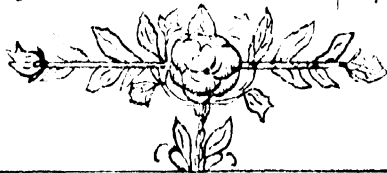
پیاری اماں

محبت سے کس نے مجھے پالا پوسا؟
مری شوخیوں پر بھی مجکو نہ کوسا؟
لیا بلکہ شفقت سے گالوں کا بوسا
مری پیاری ماں نے مری پیاری ماں نے

میں ہوں کس کے دل کیلئے وجہ راحت؟
مجھے کس نے گودوں کھلایا بہ شفقت؟
مرے واسطے کس نے جھیلی مصیبت؟
مری پیاری ماں نے مری پیاری ماں نے

زمیں پر گرا میں اگر چلتے چلتے
تو کس نے اُٹھایا مرا لال کہہ کے؟
پھر آنچل سے آنسو مرے کس نے پونچھے؟
مری پیاری ماں نے مری پیاری ماں نے

اگر اتفاقاً میں شب بھر نہ سویا
ہوا چپ نہ ہرگز جو رویا تو رویا
تو کس کے اُڑے ہوش جی کس نے کھویا
مری پیاری ماں نے مری پیاری ماں نے

وہ میرا مچلنا منائے نہ منتا
جہاں بجنے کوئی آیا تا گتا
سکھایا پڑا اب آدمی کس نے بنتا
مری پیاری ماں نے مری پیاری ماں نے

وہ اٹھلا کے چلنا وہ اِترا کے چلنا
وہ لاٹھی کے گھوڑے پہ چڑھ کر نکلنا
سدا کس نے چاہا مرا یوں بہلنا
مری پیاری ماں نے مری پیاری ماں نے

مجھے اوّل اوّل پڑھایا تو کس نے؟
جو شوق علم و فن کا دلایا تو کس نے؟
سدھارا سنوارا بنایا، تو کس نے؟
مری پیاری ماں نے مری پیاری ماں نے

کہاں ہیں وہ اگلی شرارت کی گھاتیں؟
کہاں ہیں جو کٹتی تھیں قصوں میں راتیں
بھلا دیں بُری ساری بخود وہ باتیں
مری پیاری ماں نے، مری پیاری ماں نے

سوچو اور بوجھو

نیچے تصویروں کی چار قطاریں ہیں۔ ہر قطار میں جو تصویریں ہیں ان کے ناموں کے پہلے حرف ملا دو تو ہمارے کسی بڑے شاعر کا نام بن جاتا ہے۔ دیکھو تم یہ نام نکال سکتے ہو یا نہیں؟ اگر نام بوجھ لو تو ایک کارڈ پر لکھ کر "پیام تعلیم۔ قرول باغ دہلی" کے پتہ پر بھیج دو۔ ۱۵ اپریل تک جو کارڈ آجائیں گے انھیں اسی دن شام کو دیکھا جائے گا۔ اور جو تین صحیح جواب سب سے پہلے نکل آئیں گے انھیں ۲۰ اپریل تک کوئی نہ کوئی ننھا سا انعام پہنچ جائے گا۔

دیکھو، اپنا نام اور پتہ پورا اور صاف صاف لکھنا۔
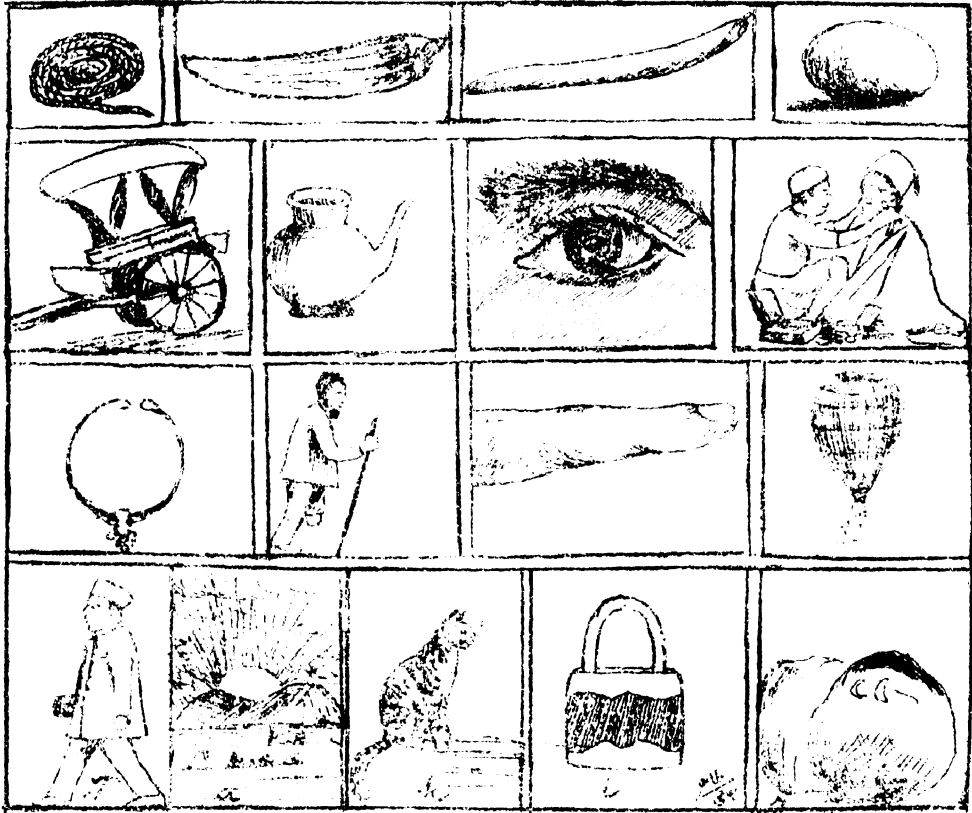
ریاضی کے چند سوالات

بعض وقت ریاضی میں ایسے فرضی سوالات پوچھے جاتے ہیں جن کا اگر صحیح جواب دیکھا جائے تو اسی قسم کا مضحکہ خیز ہوگا جیسا نیچے کی ان چند مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہ اس مکان کا حال ہے جسکے حوض کا پانی ۱۵۰ گیلن فی منٹ کی رفتار سے ٹپک رہا تھا۔ اس رفتار سے ۱ گھنٹہ میں پانی کی یہ کثرت ہوئی کہ کھڑکیوں اور چمنیوں سے بہہ نکلا۔

یہ اس شخص کا حال ہے جس نے ایک مکان ۵۶۰ روپیہ میں خریدا اور ۲۴۵ روپیہ میں بیچ ڈالا۔ سپاہی ایسے مسرف شخص کو پکڑ لے لئے جا رہے ہیں۔
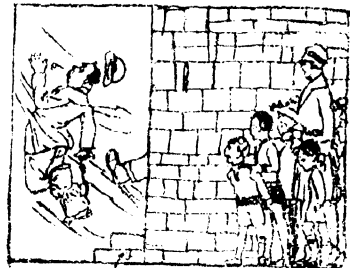
یہ اس مزدور کا انجام ہے جو ایک دن میں ۵۲۲۴ اینٹیں بناتا ہے اسکے ہم پیشہ اسے ٹھوکریں مار کر نکال رہے ہیں کہ دوسرے مزدوروں کا کیا حال ہوگا جو اتنی اینٹیں روزانہ نہیں بنا سکتے۔

یہ اس آدمی کا حشر ہے جو ایک گھنٹہ میں ۱۵ ایکڑ زمین جوتتا ہے۔ اس کے گھوڑے اس تیزی سے دوڑ رہے ہیں کہ وہ غریب پیچھے گھسٹتا رہ گیا۔

یہ ان دو گاڑیوں کا انجام ہے جو مرداں اور پشاور سے ایک ہی سمت کو روانہ ہوئیں اور بیچ میں آکر ٹکرا گئیں۔

یہ اس پیدل سفر کرنے والے کا حشر ہے جو کوئٹہ سے لاہور تک ۶ گھنٹے میں پیدل آیا۔ اتنے کم وقت میں اتنے لمبے سفر کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ جان سے مر گیا۔

ایک باپ کا خط اپنے بیٹوں کے نام

علی گڈھ میں مسلمانوں کا ایک بڑا مدرسہ ہے اس میں رشید احمد صاحب صدیقی اردو کے ایک اُستاد ہیں آپ بہت ہنس مکھ ہیں اور اپنی باتوں سے دوسروں کو خوب ہنساتے ہیں۔ آپکے دو بچے جامعہ کے مدرسہ تحتانیہ میں پڑھتے ہیں یہ خط آپ نے اپنی بچوں کے نام لکھا ہے جس میں سب سے زیادہ تاکید ہنسنے کی ہے امید ہے کہ سب پیام بھائی اسے شوق سے پڑھیں گے، اور ہنس مکھ بنیں گے۔

میرے پیارے اقبال اور احسان

آج ڈاک سے تمہارے خوب اچھے اور لمبے چوڑے خطوط ملے۔ ہم لوگ بہت خوش ہوئے۔ اور ہم سب سے بھی زیادہ خوش سلمیٰ اور عذرا ہوئیں، سلمیٰ اور عذرا نے تم لوگوں کے لئے آج کھجور پکوائی ہے اور سلمیٰ نے خود آٹا گوندھا تھا اور عذرا نے کھجور بیلیا تھا۔

جلیل صاحب نے لکھا ہے کہ وہ تم لوگوں کو اپنے ساتھ ایسٹر کی تعطیل میں لائیں گے۔ تمہارے دونوں بکس بھی بھیجے جاتے ہیں اور تمہارے لئے دو عدد مچھر دانیاں تیار کی جارہی ہیں، ان کو فوراً بھیجوں گا۔ میاں اقبال تمہارے ماسٹر صاحب کا خیال صحیح ہے کہ تم ہنستے کم ہو۔ لیکن احسان خوب ہنستا ہے۔ تم کو خوب ہنسنا چاہئے ہنسنے سے آدمی خوش رہتا ہے، بدن میں چستی آتی ہے۔ اور جب ہنسنے کی عادت ہوجاتی ہے تب کوئی تکلیف تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔ تمہارا کوئی نقصان بھی ہوجائے یا بیمار ہوجاؤ تو بھی تم ہنستے رہوگے۔ اور یہ تو دیکھو اگر تم ہنسو تو تمہارے سب ساتھی تمہارے ساتھ ہنسنے لگیں گے۔ اگر روؤ یا رونے والوں کی صورت بناؤ تو کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں روئے گا۔ اس لئے آدمی کو ہمیشہ ہنسنا چاہئے تاکہ لوگ اُس کو دیکھ کر خوب خوش ہوں اور تمہارے دوست بنیں۔

رونا تو لڑکیوں عورتوں اور مریضوں کا کام ہے۔ مسلمان مرد کبھی نہیں روتا۔ رونے کے معنی یہ ہیں کہ تم ہار گئے اور ہنسنے کے معنی یہ ہیں کہ تم کو کسی تکلیف کی پرواہ نہیں ہے اور تم جیت گئے۔ اب تم خود بتاؤ کہ کیا پسند کروگے؟ رونا یا ہنسنا۔

تمہاری کیاریوں میں خوب پھول کھلے ہیں ان کی بڑی احتیاط کی جاتی ہے اور پانی دیا جاتا ہے تاکہ تم آکر ان کو دیکھو اور خوش ہو۔ سارے پھول ہنستے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کو اب تک یہ نہیں معلوم کہ تم نہیں ہنستے۔ ان سب کو امید ہے کہ تم آؤ گے تو وہ سب خوب کھل کھلا کر ہنسیں گے۔ اب تم ذرا خبردار رہنا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سب تو تم کو دیکھ کر خوش ہوں اور تم ہنسنے کے بجائے رونے والوں کی صورت بنائے رکھو۔

اگر ایسا ہوا تو احسان کی کیاری کے پھول تمہاری کیاری کے پھول سے بازی لے جائیں گے۔ اور تمہاری کیاری والے پھول احسان کی کیاری کے پھول کی پارٹی میں شریک ہوجائیں گے۔ کیونکہ وہ سب یہ خیال کریں گے کہ ہمارے مالک تو روتے ہیں ایسے مالک کی پارٹی میں کیوں نہ ہوجائیں جو ہمیشہ خوش رہتا ہے خود بھی ہنستا ہے اور دوسروں کو بھی ہنساتا ہے۔

دنیا کا سب سے موٹا آدمی

یہ دنیا کا سب سے موٹا آدمی ہے جو امریکہ کا رہنے والا ہے ان کا نام ہیری ہے اور ان کا وزن ۹ من ۳۳ سیر ۸ چھٹانک ہے۔

اس سے پیشتر بھی ایک شخص انگلستان کا رہنے والا تھا جو موٹاپے میں سب سے زیادہ مشہور تھا۔ اس کا وزن ۹ من ۹ سیر ۸ چھٹانک تھا۔ یہ ۱۸۰۹ء میں مر گیا۔

اس کے علاوہ عورتوں میں سب سے موٹی عورت مس اتا ہول نامی تھی، جو وزن میں ۷ من ۳۵ سیر تھی۔

لیکن یہاں پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں، ایک کہ موٹے آدمی عموماً خوش طبع کیوں ہوتے ہیں؟ وہ خود بھی بہت ہنس مکھ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنساتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ امریکہ کے سائنسدانوں نے یہ بتائی ہے کہ دماغ کے نیچے کی جانب ایک ملائم غدود ہوتا ہے، جس میں خون آنے کو آتا ہے لیکن اس سے نکلنے کے لئے کوئی رگ نہیں ہوتی۔ اس خون سے ایک خاص قسم کا مادہ پیدا ہوتا ہے جو سارے جسم میں پھیلتا ہے۔ اس مادہ کی وجہ سے جسم کے اندر جو چربی پیدا ہوتی ہے، وہ خاص انداز میں جمع ہوتی جاتی ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہیری صاحب خواہ کچھ بھی نہ کھائیں لیکن تھوڑا بہت جو کچھ بھی وہ بطور غذا کے استعمال کرتے ہیں، وہ سب کا سب چربی ہی بن جاتا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ غصہ کی آگ جو انسان کے مزاج میں پیدا ہوتی ہے، وہ موٹے آدمی کے جسم میں ایک اور مادے سے ٹھنڈی پڑ جاتی ہے جو خاص طور سے پیدا ہوتا ہے۔

صفحہ ۵ کا بقیہ

اچھا بیٹے خدا حافظ۔ ہم سب کو بڑی خوشی ہوئی کہ دونوں بھائیوں میں اب لڑائی نہیں ہوتی۔ دیکھو اسی وجہ سے تم دونوں کے کیاریوں کے پھول بھی آپس میں ملے جلے کھڑے ہیں۔ تمہارا کارڈ نہیں ملا۔ اس وقت جلدی ہے۔ اب پھر ملوگے تو باتیں ہونگی۔

ہم سب لوگوں کا تم لوگوں کو بہت بہت پیار۔

خدا حافظ

رشید

جنگ چین و جاپان

پیام بھائیو! جنگ کا لفظ سن کر آپ کا خون رگوں میں تیزی سے دوڑنے لگا ہوگا، دل زور زور سے اُچھل رہا ہوگا اور جگر بے اختیار ہو رہا ہوگا۔ اور ساتھ ہی ساتھ آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ آجکل چین میں خصوصاً کیانگ وان اور ووسنگ کے علاقہ میں خون کا دریا بہ رہا ہوگا۔ مردوں کے ڈھیر لگے ہوں گے۔ اور لاشوں کا انبار پڑا ہوگا۔ اور آپ چپکے سے اپنے دل سے یہ پوچھتے ہونگے کہ کتنے غریب جان سے مارے گئے؟ اور کتنے بے گناہ اور معصوم باشندے گولی کا نشانہ بن گئے؟

بھائیو! میں آپ کو کیا بتاؤں بدقسمتی سے میں اب تک ہندوستان میں مقیم ہوں، اور اس ہیبت ناک منظر کا تماشہ نہیں دیکھا جو شنگھائی کے اردگرد پیش آرہا ہے، وہ خوں ریزی، وہ غارتگیری، وہ فوجوں کی لڑائی۔ وہ ہوائی جہازوں کا بم برسانا۔ وہ توپوں کے دھوئیں اور جنگی جہازوں کے شور کی بھرمار، یہ سب تماشے میری آنکھوں سے اوجھل ہیں۔

میں کیا بتاؤں؟ کبھی یہ سننے میں آیا کہ جاپان کی ہوا اکھڑ گئی، کبھی یہ خبر پہنچی کہ چینی شکست کھا گئے۔ مگر اصل واقعہ کیا ہے، میں یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ اس کا سبب کیا ہے۔ اور جاپان اپنی عسکری کارروائی جائز ثابت کرنے کے لئے دنیا کو کیا بتانا چاہتا ہے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ جنگ کا شعلہ سب سے پہلے منچوریا سے اُٹھا شنگھائی میں بھڑکا اور تمام وسط چین میں پھیل گیا۔ اس وقت ساحل چین کے بڑے بڑے شہروں میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اس لڑائی کی چنگاریاں نہ پھیل گئی ہوں۔ اور کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں اس جنگ کے شرارے نہ اُٹھ رہے ہوں۔ یہ چنگاریاں اور شرارے دراصل اُسی ملوکیت اور عسکریت کی تمہید ہیں جو جاپانی اور دوسرے ممالک چینیوں کی گردن پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک بہت نازک وقت ہے جس میں اہل چین کو نہ صرف جابر جاپانیوں سے لڑنا ہے، بلکہ اور ممالک سے بھی برسرپیکار ہونا ہے۔ چینیوں کی فنا و بقا اور دیگر مشرقی اقوام کی تجدید و احیا، کا اس پر بڑی حد تک دار و مدار ہے اگر چین کو اس وقت صرف جاپانیوں سے لڑنا ہوتا، تو جاپان

خواہ کتنا ہی زبردست کیوں نہ ہو، اسکی بالکل پروانہ تھی، اہل چین گو اس وقت کمزور ہیں جدید اسلحہ سے خالی ہیں، اور بحری اور ہوائی قوت ان کے پاس کم ہے مگر پھر بھی محض کثرت آبادی کے بھروسہ پر وہ جاپانیوں کی پیش قدمی کو روک سکتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے کیانگ وان اور ووسنگ کی لڑائیوں میں تقریباً دو ہفتہ تک جاپان کی زبردست بحری اور ہوائی قوت کو روکے رکھا اور ان کو آگے بڑھنے نہ دیا۔ آخرکار گرچہ چینی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا، مگر اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس کی ہمت ٹوٹ گئی اور اسے بالآخر شکست کھانا پڑی، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ انگریزی کمانڈر کیلی کی تحریک پر جاپانی اور چینی نمایندوں کے درمیان برطانوی فلگ شپ کنڈ پر صلح کی گفتگو ہونے لگی اور ہردو فریق نے ایک دوسرے سے یہ وعدہ کرلیا کہ گفتگو کے اثنا میں تمام جنگی کارروائی روک دی جائے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ چینی وعدہ کے بڑے پکے ہوتے ہیں اور اس کی خلاف ورزی کرنا خلاف انسانیت سمجھتے ہیں، مگر واقعہ توقع کے خلاف نکلا۔ یعنی ادھر فلگ شپ میں صلح کی گفتگو ہو رہی تھی، ادھر جاپان کی ہوائی اور بحری فوج نے یکبارگی قلعہ ووسنگ پر حملہ کر دیا۔ چینی سپاہی اس وقت آرام کر رہے تھے، وہ غیر مسلح تھے اور جنگ کے لئے کسی طرح تیار نہ تھے، باوجود اس کے ایک سخت مقابلہ کے بعد قلعہ کو چھوڑا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جاپانیوں اور انگریزوں کے درمیان کوئی خفیہ سمجھوتہ تھا اور کیلی کا طرفین کے نمایندوں کو ملا کر صلح کرانا ایک بہانہ تھا جس سے صرف چینی فوجوں کو قلعہ ووسنگ سے نکلوانا مقصود تھا۔ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ انگریزوں کی حکمت عملی، ملوکیت جاپان کی حامی ہے جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ انگریزی اخبارات میں کوئی نہ کوئی زہریلا اور شعلہ انگیز مقالہ ضرور پائیں گے جس سے آپ انگریزوں کی حکمت عملی کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

وجہ یہ ہے کہ جس طرح جنگ عظیم کے بعد یورپین قوموں نے سلطنت ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے اسی طرح آج چین کے حصے بخرے کرنے کے درپے ہیں۔ ترکی کے وسیع مقبوضات میں سے شام اور الجزائر فرانس نے لے لیا۔ انگریزوں نے عراق اور مصر میں قبضہ کرلیا اور اٹلی طرابلس اور روس کی مالک بن گئی۔ اس وقت چین کی حالت بھی بالکل ویسی ہے جیسی ۱۲ سال قبل ترکی کی تھی۔ ایک طرف جاپان منچوریا اور اندرونی منگولیا پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف روس بیرونی منگولیہ اور چینی ترکستان پر دانت لگائے ہوئے ہے، تیسری طرف فرانس کا ارادہ ہے کہ کوانگسی اور یونان کو اپنے قبضہ میں کرلے چوتھی طرف انگریز تبت اور سی کیانگ کی سیادت کے خواہشمند ہیں۔ غرضیکہ اس صدی میں مغربی طاقتوں کے سامنے دو مریض نظر آتے ہیں، ایک تو مشرق ادنیٰ، دوسرا مشرق اقصیٰ۔ مشرق ادنیٰ سے ان کی مراد ترکی تھی اور مشرق اقصیٰ سے چین۔ انھوں نے پہلے مریض کو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تو بےکار کر دیا جس سے اسلام کی شوکت عظمت کو بہت صدمہ پہنچا۔ اس کے بعد اب اس دوسرے مریض کی باری ہے اور اس کو زیر و زبر کرنے کے لئے دول یورپ تدبیریں سوچ رہی ہیں۔ اور اس مرتبہ تمام مشرقی اقوام کی بقا اور حیات اسی چینی قوم کی زندگی سے وابستہ ہے۔

تیسرا منظر

صدر مدرس کا دفتر

(صدر مدرس بیٹھے کام کر رہے ہیں) دروازہ کے باہر سے آواز آتی ہے "میں حاضر ہو جاؤں"

صدر مدرس:۔ کون، طرار، چلے آؤ۔ (طرار داخل ہوتا ہے اور کھڑا رہتا ہے)

طرار:۔ کہو بھئی، اچھے تو ہو۔

صدر:۔ جی ہاں، اچھا ہوں۔

صدر:۔ کل تمہارے والد کا خط آیا تھا تمہیں ملا؟

طرار:۔ جی ہاں۔

صدر مدرس:۔ سب خیریت ہے؟

طرار:۔ اماں کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ لکھا ہے چھٹی سے ایک دن پہلے آجاؤ۔

صدر مدرس:۔ مگر تمہیں تو جانے کی ممانعت ہے اب کیا کرو گے؟

طرار:۔ یہ لکھ دوں گا کہ میں نہیں آسکتا۔

صدر:۔ تمہاری ماں کو بڑا قلق ہوگا؟

طرار:۔ جی ہاں۔

صدر:۔ اور عزیزوں کو بھی؟

طرار:۔ جی ہاں چھوٹی بہن بہت روئے گی۔

صدر مدرس:۔ بھلا نہ جانے کا سبب کیا لکھو گے؟

طرار:۔ (خاموش)

صدر مدرس:۔ آخر کوئی سبب تو لکھنا ہی ہوگا۔

طرار:۔ لکھ دوں گا کہ ماسٹر صاحب نہیں آنے دیتے۔

صدر:۔ اور جو وہ پوچھیں کیوں؟

طرار:۔ تو سچا حال لکھ دوں گا۔

صدر:۔ شاباش! مگر پھر سب لوگ تم سے ناراض ہو جائیں گے؟

طرار:۔ جی ہاں جب گھر جاؤں گا تو ابا ماریں گے۔

صدر:۔ اور خفا بھی ہوں گے؟

طرار:۔ جی ہاں!

صدر:۔ تمہیں ان کی خفگی کا زیادہ رنج ہوگا یا مارنے کا؟

طرار:۔ مارنے کا۔

صدؔ مدرس:۔ اور جو وہ پیار سے ماریں تب بھی رنج ہوگا؟

طرار:۔ جی نہیں ۔

صدر:۔ تو معلوم ہوا رنج اصل میں خفگی کے سبب سے ہوگا۔ ٹھیک ہے نا ؟

طرار:۔ جی ہاں ٹھیک ہے ۔

صدؔ مدرس:۔ بھلا تمہیں اپنے ماسٹر صاحب کی خفگی کا بھی رنج ہوتا ہے ؟

طرار:۔ جی ہاں ۔

صدؔ مدرس:۔ اور میری خفگی کا ؟

طرار:۔ بہت رنج ہوتا ہے ۔

صدر:۔ پھر تم ایسی حرکتیں کیوں کرتے ہو کہ تمہارے باپ اور اُستاد خفا ہوں اور تمہاری ماں کا اور بہن کا دل دکھے ۔

طرار:۔ (خاموش)

صدر مدرس:۔ میں نے دیکھا ہے کہ تمہاری اکثر شرارتیں اظہار کو دق کرنے کے لئے ہوتی ہیں ۔ اس کا کیا سبب ہے ؟

طرار:۔ میری ان کی لڑائی ہے ۔

صدر:۔ یہ کیوں ؟

طرار:۔ جی، وہ مجھ پر ہنسا کرتے ہیں اور ماسٹر صاحب سے میری شکایت کر دیتے ہیں ۔

صدر:۔ وہ ہنسی کی بات پر ہنستا ہوگا اور شکایت کی بات پر شکایت کرتا ہوگا ۔

طرار:۔ نہیں ماسٹر صاحب، جب مجھے سزا ملتی ہے تو ہنستے ہیں اور ان کی خوشامد کی عادت ہے ۔ جو بات ہو جا کر ماسٹر صاحب سے جڑ دیتے ہیں ۔ خوشامد خورا کہیں کا ۔

صدؔ مدرس:۔ ہاں خوشامد کرنا اور خواہ مخواہ شکایت کرنا تو بڑی بات ہے۔ تو تم اسی لئے اسے بُرا سمجھتے یا ستاتے ہو ؟

طرار:۔ جی ہاں ۔

صدؔ مدرس:۔ تم سے صالح سے بڑی دوستی ہے ۔ صالح بھی اظہار کو بُرا سمجھتا ہے ؟

طرار:۔ جی ہاں! اسے کون اچھا سمجھے گا ۔ رونا، ہنسنا، کمزور، مار کھانے کی نشانی ۔

صدر:۔ مگر صالح اظہار کو نہیں ستاتا نہ اظہار صالح کی شکایت کرتا ہے ۔

طرار:۔ صالح بڑے نیک ہیں کسی کو نہیں ستاتے اور کبھی شرارت نہیں کرتے پھر اظہار کس منہ سے ان کی شکایت کرے ۔

صدر:۔ (مسکرا کر) اگر تم بھی بڑے نیک ہوتے کسی کو نہ ستاتے اور کبھی شرارت نہ کرتے پھر اظہار کس منہ سے تمہاری شکایت کرتا اور تمہیں کیوں ضرورت پڑتی کہ اُس رونے، ہنسنے، کمزور، مار کھانے کی نشانی کو ستاؤ ۔

طرار:۔ (خاموش)

صدر:۔ اچھا تمہیں صالح اچھا سمجھتا ہے ؟

طرار:۔ جی ہاں وہ میرے دوست جو ہیں ۔

صدر:۔ مگر تمہاری شرارتوں پر ہم سب ناراض ہوتے ہیں تو وہ بھی ہوتا ہوگا ؟

طرار:۔ جی نہیں، وہ کبھی ناراض نہیں ہوتے ہیں ۔

صدر:۔ یہ نیکی ہے۔ مگر جب تم سزا پاتے ہو تو اُسے ضرور صدمہ ہوتا ہوگا ۔

طرار۔ جی ہاں ہوتا ہے۔

صدر۔ تو تمہیں شرم نہیں آتی کہ ایسے دوست کو جو تمہاری بری حرکتوں پر بھی ناراض نہیں ہوتا صدمہ پہنچاتے ہو۔

طرار۔ (خاموش)

صدر۔ اچھا یہ تو بتاؤ تم کونسا کھیل کھیلتے ہو۔

طرار۔ ہاکی کھیلا کرتا تھا مگر اب نہیں کھیلتا۔

صدر۔ کیوں؟

طرار۔ اظہار نے سب لڑکوں کو میرے خلاف کر دیا ہے میرے ساتھ کوئی کھیلتا ہی نہیں۔

صدر۔ تم تو کہتے ہو اظہار کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے پھر اس کے کہنے سے تمہارے خلاف کیسے ہو گئے؟ یہ کہو تمہاری شرارتوں سے گھبراتے ہوں گے۔

طرار۔ جی ہاں مجھ سے ڈرتے ہیں۔

صدر۔ تمہارے لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اس پر فخر ہے۔ دیکھو ایک ڈر تو وہ ہوتا ہے جو ادب اور عزت کے سبب ہو اسے رعب کہتے ہیں۔ جیسے تم ماسٹر صاحب سے ڈرتے ہو اور ایک وہ ہوتا ہے جو صرف تکلیف کے اندیشے سے ہو جیسے آدمی مرکھنے بیل بھوت پریت سے ڈرتا ہے کہ نہیں؟

طرار۔ جی ہاں۔

صدر۔ تم سے لڑکے ادب یا عزت کے سبب تو ڈرتے نہیں ظاہر ہے کہ تمہیں مرکھنا بیل یا بھوت پریت کی طرح سمجھتے ہیں۔ اسی لئے تم سے بھاگتے ہیں تمہارے سائے سے پرہیز کرتے ہیں۔

طرار۔ (خاموش)

صدر۔ ادھر آؤ میرے قریب بیٹھ جاؤ (طرار جھجکتا ہوا آگے بڑھکر بیٹھتا ہے)

صدر۔ دیکھو بیٹا تم مدرسے آنے سے پہلے اپنے گھر رہتے تھے تو تمہاری اماں، ابا، بہن اور سب عزیز تمہیں چاہتے تھے۔ اب تم اپنا گھر چھوڑ کر اس سے بڑے گھر میں آئے ہو۔ یہاں وہ نسبت جو عزیزوں کو خود بخود ہوتی ہے تمہیں نہیں مل سکتی۔ مگر پھر بھی انسان انسان ہی ہے، وحشی جانور نہیں۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اور ساتھ رہنے سہنے سے یہ راہ اور کھل جاتی ہے۔ محبت اور خدمت سے غیر اپنے ہو جاتے ہیں۔ تم اپنے ساتھ کے لڑکوں کو ستانے کی جگہ ان سے اچھا سلوک کرو گے تو وہ بھی عزیزوں کی طرح ہو جائیں گے۔ اسی طرح دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو تمہیں بہت سے لوگوں سے سابقہ پڑے گا۔ ان کی سچے دل سے خدمت کرو گے تو ان کے دل میں بھی گھر کر لو گے۔ سب تم کو اپنا سمجھیں گے اور تم سب کو اپنا سمجھو گے۔ سب کا مالک سب کا خالق اللہ تم سے خوش ہوگا یہی چیز دنیا میں سب سے بڑھ کر ہے۔ اسی کے لئے انسان سب کچھ کرتا ہے۔ اچھا بتاؤ اگر سارے انسان ایک دوسرے سے ایسی ہی محبت کرنے لگیں جیسی ماں بیٹے بھائی بہن میں ہوتی ہے تو تم کو خوشی ہوگی۔

طرار۔ جی ہاں بڑی خوشی ہوگی۔

صدر۔ تو پھر اس کے لئے اپنی سی کوشش کرنا چاہئے۔ کم سے کم انسان اپنا رشتہ تو سب سے جوڑے اور خدا نے جتنی قابلیت دی ہو اس سے اپنے بھائیوں کی خدمت میں کام لے۔ تم میں جو یہ شرارت کا مادہ ہے اگر غور کرو تو اس کی جڑ طبیعت کی جولانی جرأت اور جوش ہے اور یہ سب بڑے کام کی چیزیں ہیں بشرطیکہ ان کا استعمال اچھے مقصد کے لئے اور صحیح طریقے سے ہو۔ اگر تم ان کے ذریعہ سے اپنے مکتب کے بھائیوں کی خدمت کرو (باقی)

دنیائے سائنس کے روشن ستارے

سر ہمفری ڈیوی

۲

لندن کے ایک ماہر سائنس نے جب اس کی شہرت سُنی تو اس نے نوجوان ڈیوی کو لندن کی مشہور درس گاہ رائل انسٹی ٹیوشن میں بطور کیمیا کے مددگار پروفیسر کے رکھ لیا۔

یہاں ڈیوی کے ذمہ کم کام تھے۔ لہٰذا اس کو تحقیقات جاری رکھنے کے لئے کافی فرصت مل گئی۔ ڈیوی کی حیرت انگیز تحقیقات اور اکتشافات نے اس کی درس گاہ کی عظمت تمام یورپ میں قائم کردی۔ اس کے لیکچر سننے کے لئے لندن کے تمام اہلِ علم اور امیر کبیر جمع ہوتے۔ اس کی جادو بیانی کا خاکہ ہم ابتدا میں پیش کر چکے ہیں مزید ثبوت کے لئے لندن کے مشہور شاعر سودے کا ایک قول نقل کر دینا کافی ہوگا۔ وہ کہتا تھا کہ ڈیوی کے لیکچروں میں میں اس وجہ سے شریک ہوتا ہوں کہ میری تشبیہات اور محاوروں کے ذخیرے میں اضافہ ہو۔

چند ہی سال کی محنت کے بعد ڈیوی سائنس کی سب سے بڑی مجلس رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب ہو گیا۔ عملی سائنس میں اس کو اس قدر مشق ہو چکی تھی کہ کوئی ہفتہ ایسا نہ گزرتا جس میں ڈیوی کوئی نئی چیز ایجاد یا دریافت نہ کرتا۔ ان میں سے ہم صرف چند ایک کی تفصیل قلمبند کرتے ہیں جن کی وجہ سے اس کا نام ہمیشہ کے لئے یادگار رہے گا۔

رائل انسٹی ٹیوشن میں ایک طاقتور برقی بیٹری تھی ڈیوی کے مشاہدے سے یہ بات کئی مرتبہ گذری تھی کہ مورچہ کے دونوں تاروں کو ایک دوسرے سے مس کر کے علیحدہ کیا جائے تو روشنی کا ایک شرارہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ایک روز اس نے دونوں تاروں کو آپس میں ملا کر اس انداز سے علیحدہ کر دیا کہ دونوں کے سروں کے درمیان تھوڑی سی خالی جگہ رہے جب تک وہ دونوں تاروں کو ایک دوسرے سے کچھ فاصلہ پر تھامے رہا برق کے چھوٹے چھوٹے روشن شرارے تار کے ایک سرے سے دوسرے تک کودتے رہے۔ علاوہ اس کے اس نے یہ بھی دیکھا کہ تاروں کے سرے بہت گرم ہو گئے ہیں۔ ڈیوی کو اس تجربہ سے بہت خوشی حاصل ہوئی۔ مزید معلومات کے لئے جب اس نے تاروں کے سروں پر کوئلہ کے قلم باندھ کر اس تجربہ کو دوبارہ کیا تو ایک نہایت تیز روشنی نمودار ہوئی اور کوئلہ کے ٹکڑوں کے سرے بہت ہی زیادہ گرم ہو گئے۔

برق کے متعلق بہت سی تحقیقات ہو چکی تھیں لیکن یہ پہلی مرتبہ دریافت ہوا کہ برقی قوت سے روشنی بھی پیدا کی جا سکتی ہے

ڈیوی کے اس انکشاف نے بیسویں صدی کے سامان راحت میں بہت بڑا اضافہ کر دیا۔

ڈیوی نے برقی قوت سے متعلق مزید تحقیق کر کے برق کے استعمال کو کیمیائی تحقیقات میں رواج دیا۔ یہی اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس سے قبل بعض محققین نے یہ تو معلوم کرلیا تھا کہ پانی میں اگر برقی رو گذاری جائے تو دو قسم کی گیسیں ہائیڈروجن اور آکسیجن پیدا ہوتی ہیں لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ گیسیں کہاں سے پیدا ہوتی ہیں یا برقی مورچہ یا پانی سے ڈیوی نے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ اس تجربہ کو مکمل کر کے اس معمے کا حل یوں پیش کیا کہ دونوں گیس پانی کا جزو ہیں جب پانی سے برقی رو گذاری جاتی ہے تو رو کے عمل سے پانی کے دونوں جزو علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ سائنس کی اصطلاح میں اس عمل کو "برق پاشیدگی" کہتے ہیں۔

یہ دونوں عمل بظاہر تو معمولی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے استعمال سے آج ہم بیشمار فائدے حاصل کر رہے ہیں تمام قسم کی ملمع کاری، برقی ٹائپ، سونے چاندی اور تانبے کو کان سے نکالنے کے بعد خالص حالت میں حاصل کرنا اور مفرد چیزوں کو ان کے مرکبات سے علیحدہ کرنے کی خدمات اس معمولی عمل سے لی جارہی ہیں۔

لیکن ڈیوی کے مندرجہ بالا تجربہ کا دائرۂ عمل صرف پانی تک ہی محدود نہیں رہا۔ اس نے اب اسکے اثرات کی جانچ دوسرے مرکبات پر بھی کرنا شروع کر دیا۔ کاسٹک سوڈا اور کاسٹک پوٹاس ایک عرصہ سے اسکی توجہ کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے کاسٹک پوٹاس میں برقی روگذاری۔ چند لمحوں میں کیا دیکھتا ہے کہ اس کی سطح پر نہایت ہی سفید اور چمکدار ذرات نمودار ہو رہے ہیں اور بعض ان میں سے ہوا سے مل کر چٹاخ پٹاخ کی آواز پیدا کر رہے ہیں اب تو اسکی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی وہ اپنے جذبات سے اس درجہ مغلوب ہوگیا کہ تمام کمرہ میں ناچتا پھرا۔

ڈیوی کی پہلی ہی تحقیقات نے اس کے نام کو کافی روشن کر دیا تھا لیکن اس انکشاف سے تو تمام یورپ جگمگا اٹھا۔ فرانس کے بادشاہ نپولین نے پیرس کی علمی مجلس کی طرف سے سونے کا تمغہ پیش کیا۔ کئی یونیورسٹیوں نے اس کو اعزازی ڈگریوں سے سرفراز کیا۔ حکومت کی طرف سے اس کو سر کا خطاب دیا گیا۔ یہ خطاب ڈیوی کے لئے فال نیک ثابت ہوا اس لئے کہ دوسرے ہی روز ایک دولت مند بیوہ سے اس کی شادی ہوگئی۔

اب ڈیوی نے تمام یورپ کی سیاحت کا ارادہ کیا۔ دوران سیاحت میں وہ جس شہر میں گیا اپنی شہرت کو وہاں پہلے سے موجود پایا۔ مختلف علمی مجلسوں میں اپنے انکشافات کو اپنے سفری معمل کے ذریعہ دکھا کر دو سال کے بعد انگلستان واپس پہنچ گیا۔

بچپن میں جب ڈیوی کوئلہ کی کانوں کے حادثے کے حالات سنتا تو اس کے دل پر بہت اثر ہوتا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں اس نے عہد کیا کہ بڑا ہو کر میں کسی نہ کسی طرح غریب مزدوروں کو تحت الثریٰ کی اس بلائے ناگہانی سے ضرور نجات دلاؤں گا۔ یورپ کی سیاحت کے بعد جب وہ اسکاٹ لینڈ کا دورہ کر رہا تھا تو کوئلہ کی بعض کانوں کے پھٹ پڑنے سے سخت حادثے ہوئے جن سے تمام ملک دہل گیا۔ کانوں میں یہ ہولناک دھماکے اس

طرح واقع ہوتے تھے کہ کانوں کے اندر کی آتش گیر گیس جب لالٹینوں کے شعلوں تک پہنچتی تھی تو اس میں آگ لگ جاتی اور اس سے دھماکے پیدا ہوتے تھے۔

اسکاٹ لینڈ کی کانوں کے مالکوں نے ڈیوی سے درخواست کی کہ وہ ان حادثات کے دفع کرنے کی کوئی تدبیر بتائے۔ ڈیوی نے کوئلہ کی ایک کان میں پہنچ کر تھوڑی سی آتش گیر گیس بطور نمونہ لی۔ دو ہفتے تک وہ اس کے خواص کی جانچ پڑتال میں لگا رہا۔ بالآخر اس نے ایک محفوظ قسم کی لالٹین ایجاد کی جو اسی کے نام سے مشہور ہے اس کے چاروں طرف دھات کی جالی لگی ہوتی ہے دھات کی اس جالی نے شعلے کو کیسے محفوظ کر دیا؟ ڈیوی کی محفوظ لالٹین کس اصول کے ماتحت کام کرتی ہے؟ اس کا جواب ذیل کی سطور سے واضح ہو جائے گا۔

تقریباً تمام دھاتوں میں ایک خاصیت پائی جاتی ہے کہ وہ حرارت کو بہت جلد جذب کر لیتی ہیں اور اس جذب کردہ حرارت کو بہت جلد کھو بھی دیتی ہیں۔ دھات کی کسی چیز مثلاً سلاخ کے ایک سرے کو آگ میں رکھا جائے تو اس کا دوسرا سرا بھی بہت جلد گرم ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ حرارت اس کے ذروں سے گذرتی ہوئی دوسرے سرے تک پہنچ جاتی ہے۔ اس قسم کی چیزیں جن میں سے حرارت منتقل ہو سکے، سائنس کی اصطلاح میں موصل کہلاتی ہیں۔ ڈیوی کے دھات کی جالی لگانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس کے ذریعہ لالٹین کی اندرونی حرارت جلد جلد باہر کی فضا میں منتقل ہوتی رہے۔

چنانچہ آتش گیر گیس جب ہوا کے ساتھ لالٹین میں پہنچ کر جلتی ہے تو اس کا شعلہ جالی کے باہر نمودار نہیں ہوتا اس لئے کہ اس کے جلنے سے جتنی حرارت لالٹین میں پیدا ہوتی ہے، موصل جالی اس کو باہر کی فضا میں منتقل کر دیتی ہے۔

ڈیوی کی اس ایجاد سے ہزاروں جانیں بچ گئیں اس کے ایک دوست نے جب اس ایجاد کو پیٹنٹ کرانے کا یعنی اپنے نام محفوظ کرانے کا مشورہ دیا تو فراخ دل ڈیوی نے جواب دیا "نہیں میرے اچھے دوست! اس قسم کا خیال بھی کبھی میرے دماغ میں نہیں آیا۔ میرا مقصد صرف خدمت خلق تھا۔ اور اب جب کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں تو یہ کامیابی میرے لئے کافی صلہ ہے۔"

کوائف جامعہ

۲۴ر مارچ ۱۹۳۲ء کو وقفہ کے بعد سے مدرسہ تحتانیہ میں بچوں کے تعلیمی کھیل تھے جن میں بعض بہت مفید اور دلچسپ مقابلے ہوئے، مثلاً خاموشی سے پڑھ کر عمل کرنا۔ جس لڑکے کو لکھنوی سلام کی تختی ملی تھی، اس کے اس فعل پر تمام مجمع ہنس پڑا یا جس لڑکے کے نام پر غصہ کرنے کی تختی آئی تھی، اس کے اکڑنے اور بھرنے پر تمام حاضرین نہایت محظوظ ہوئے۔ سب سے آخیر میں تصویریں بنانے کا مقابلہ تھا جو شاید سب سے بہتر کھیل تھا۔ چند چیزوں کے نام تختہ سیاہ پر لگا دئے گئے تھے مثلاً گاجر، مولی، شلجم وغیرہ ——— اور پھر یہ کہہ دیا گیا تھا کہ ان سے ایک طوطے کی تصویر بناؤ۔ عبدالعزیز پشاوری متعلم ابتدائی چہارم کی تصویر سب سے اچھی ثابت ہوئی۔ بعض کھیلوں کے نام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ خاموشی سے پڑھ کر عمل کرنا۔ ۲۔ ہاتھ سے ٹٹول کر پڑھنا۔ ۳۔ ہندسوں کی دوڑ۔ ۴۔ پرندوں اور سبزیوں کے نام لکھنا۔ ۵۔ انگریزی کے چار حرفی الفاظ ڈھونڈھنا۔ ۶۔ تیزی سے پڑھنا۔

قرول باغ میں بھی چونکہ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہو گیا ہے جس کی رو سے کسی قسم کا عام جلسہ بغیر اجازت سپرنٹنڈنٹ پولیس نہیں ہو سکتا اس لئے ناظم صاحب نے ادارۂ اکادمی کا وہ جلسہ جو ۱۹ر مارچ کو ہونے والا تھا، ایک غیر متعین مدت کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔

(صفحہ ۱۱ کا بقیہ)

تو تمہارا دل بھی خوش ہوا اور وہ تمہیں دل سے چاہنے لگیں۔ تم کھیل میں لڑکوں سے لڑتے ہو۔ لڑکے تمہیں ساتھ نہیں کھلاتے اگر تم اپنی تیزی اور جرأت سے یہ کام لیتے کہ اپنی ٹیم کے جیتنے کے لئے جان لڑا دیتے تو سب تمہیں آنکھوں پر بٹھاتے تمہیں یاد ہے کہ جب چیچک کا ٹیکہ تم نے سب سے پہلے خوشی خوشی لیا تھا تو تمہاری کتنی تعریف ہوئی تھی؟

طرار:۔ جی ہاں، پارسال اکتوبر میں۔

صدر:۔ اور جب تم نے باؤلے کتے کو مار کر نکالا تھا، تو لڑکے تم سے کتنے خوش تھے۔

طرار:۔ (جلدی جلدی سر ہلاتا ہے)

صدر:۔ یہ ایسے کام تھے جس میں تم نے اپنی ہمت اور جرأت کا مفید استعمال کیا۔ مگر کل رات اور آج صبح تم نے انہیں چیزوں کو ایسی بری طرح برتا کہ لڑکے تم سے الگ تھلگ ہیں۔ ماسٹر صاحب الگ خفا ہیں تمہارا گھر جانا بند ہو گیا تمہارے ماں باپ اور بہن کو بڑا قلق ہوگا۔ اگر تمہارا یہی حال رہا تو ممکن ہے تم ایک خوفناک مجرم بن جاؤ تم سے لوگوں کے جان اور مال کو نقصان پہنچے اور وہ تمہیں سچ مچ کے قید خانہ میں جکڑ کر رکھیں۔ لیکن اگر تم نے اپنے جوش اور دلاوری سے لوگوں کی خدمت کا کام لیا تو شاید تم ایک دن جہاز کے ناخدا بن کر طوفان سے لڑو، یا سیاحی کی مہم میں پر ہول جنگلوں اور خطرناک پہاڑوں کی سیر کرو، یا اپنے وطن کی حمایت کا بیڑا اٹھا کر آزادی کا جھنڈا لہراؤ۔ طرار، مجھے تم سے بڑی امیدیں ہیں۔ تم ذرا سنبھل جاؤ تو ایسے ایسے کام کرو گے جو کسی سے نہ ہوں گے۔ اچھا، اب تم جاؤ۔ میں ماسٹر صاحب سے سفارش کروں گا کہ ان کی والدہ کی طبیعت اچھی نہیں اگر دس دن تک سلامت روی کے ساتھ رہیں تو انہیں چار دن کے لئے گھر جانے کی چھٹی دیدی جائے۔ (پردہ گرتا ہے)

مدرسہ تحتانیہ جامعہ کے بچوں کا سال بھر کا پروگرام

۱۔ جلسہ میلاد النبی
اگست کا آخری ہفتہ، رات میں ۹ ½ بجے۔
بچے آں حضرت کی سیرۃ پاک پر
مضامین اور نظمیں پڑھیں گے۔

بچوں کا مشاعرہ اور بیت بازی
ستمبر کا آخری ہفتہ، رات میں ۸ ½ بجے۔
طلبہ بچوں کے رسالوں سے نظموں کا انتخاب کرکے سنائیں گے، اپنی لکھی ہوئی نظمیں
پڑھیں گے۔ بیت بازی کا انعامی مقابلہ ہوگا۔

۳۔ مدرسہ کا سالانہ جلسہ
اکتوبر کا آخری ہفتہ، رات میں ۸ ½ بجے۔
طلبہ مدرسہ، باغیچہ، بنک، دکان وغیرہ سے متعلق رپورٹ سنائیں گے۔ اس سلسلہ میں
مختلف پروجکٹ کی روداد بھی شامل ہوگی۔

۴۔ جلسہ مباحثہ اور مضامین سنانا
نومبر کا آخری ہفتہ، رات میں ۸ ½ بجے
طلبہ دلچسپ مضمون پر بحث کریں گے۔ اپنے لکھے ہوئے مضامین سنائیں گے۔
(دسمبر آخری ہفتہ امتحانات اور چھٹی ہوگی)

۵۔ دہلی کے مدارس تحتانیہ کا تقریر و تحریر میں مقابلہ
جنوری کا آخری ہفتہ سہ پہر میں ۴ ½ بجے
دہلی کے مختلف مدارس تحتانیہ جس میں چھٹی جماعت تک کے
طلبہ شامل ہوں گے، تقریر و تحریر میں مقابلہ ہوگا۔

۶۔ ڈراما۔
فروری کا آخری ہفتہ، رات میں ۸ ½ بجے

تعلیمی کھیل کود کا جلسہ۔
مارچ کا آخری ہفتہ، سہ پہر میں ۴ ½ بجے۔
درسی کتب اور ذہانت کی ترقی میں مدد دینے والے تعلیمی کھیل کود کرائے جائیں گے۔

ورزشی کھیل
اپریل کا آخری ہفتہ، سہ پہر میں ۴ ½ بجے۔

قیمت سالانہ
عہ/

پیام تعلیم

قیمت فی پرچہ
۲/

جلد ۱۱ ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء نمبر ۱۲

فہرست مضامین

طابع و ناشر:۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب — اڈیٹر:۔ سعید انصاری بی اے (جامعہ) — مطبع:۔ جامعہ ملیہ برقی پریس دہلی

انعامی معمّا

اس صفحہ پر چار مشہور اسلامی عمارتوں کی تصویریں ہیں۔ ان عمارتوں میں سے ہمارے بزرگوں نے ہندوستان کی سرزمین کو سجایا تھا۔ یہ ہماری اس بڑائی کی یادگار ہیں جو خدمت سے پیدا ہوئی تھی۔ اور جو پھر خدمت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ بچو! تمہیں ان سب عمارتوں کے نام معلوم ہونے چاہئیں۔ اپنے بڑوں کے کاموں کو بھلا دینا بڑی غلطی ہے۔ اچھا دیکھو معلوم ہیں یا نہیں؟ نہ معلوم ہوں تو یکم مئی کے پرچہ میں اسی صفحہ پر تمہیں ٹھیک جواب مل جائے گا۔ معلوم ہوں تو نمبروار ایک کارڈ پر لکھ کر ہمیں بھیج دو۔ اپنا نام اور پتہ بھی صاف صاف لکھنا۔ ۳۰ اپریل کو سب جواب دیکھے جائیں گے۔ جو تین سب سے پہلے نکل آئیں گے انھیں ایک اچھا سا انعام بھیجا جائیگا۔

نمبر۱

نمبر۲

نمبر۳

نمبر۴

ایڈیٹر پیام تعلیم قرولباغ دہلی

عقل مند لڑکی

گرمی کا زمانہ تھا۔ سارا جنگل سورج کی گرمی سے تپ رہا تھا ہر ہر ذرہ سے چمک پیدا ہو رہی تھی۔ درختوں کی پتیاں جھلس کر زرد پڑ گئی تھیں۔ جانور جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے چڑیاں گھونسلوں میں منہ چھپائے بیٹھی تھیں۔ اس حالت میں ایران کا مشہور بادشاہ نوشیرواں شکار کا پیچھا کئے اپنے ہمراہیوں سے دور جا پڑا تھا اب وہ تھک کر چور ہو گیا تھا۔ دھوپ سے بری گت ہو رہی تھی۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ اس نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ دور فاصلہ پر ایک سایہ دار درخت کے تلے ایک جھونپڑا نظر آیا۔ نوشیرواں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جھونپڑے کے پاس پہنچ گیا۔ جھونپڑے سے ایک لڑکی نکلی لیکن شہنشاہ کو دیکھ کر واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں ایک پیالہ میں کچھ ایکھ کا شربت لائی اور سلام کے بعد بادشاہ کے سامنے پیش کیا بادشاہ پیاس سے بے چین تھا۔ شکرگزاری کے ساتھ پی لیا جب ذرا مطمئن ہوا تو لڑکی کو پاس بلا کے پوچھا کہ "شربت میں کچھ تنکے کیوں تھے؟ کیا شربت کو چھاننا بھول گئی تھیں؟" لڑکی نے جواب دیا "محترم مہمان! میں نے تنکوں کو قصداً چھوڑ دیا تھا تاکہ .....
........"

بادشاہ:۔ "اس میں کیا مصلحت تھی"؟

لڑکی:۔ میں نے آپ کے چہرہ کو دیکھ کر معلوم کر لیا تھا کہ اس وقت آپ سخت پیاسے ہیں۔ اگر اس میں تنکے نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ آپ شربت ایک ہی بار پی جاتے جس سے نقصان ہوتا۔"

بادشاہ لڑکی کی اس بات سے بہت خوش ہوا۔ اور اس کی عقلمندی کا قائل ہو گیا۔ اس کے بعد پھر پوچھا "اچھا یہ تو بتاؤ کہ شربت کتنی ایکھ کا تھا"

لڑکی نے جواب دیا کہ "محض ایک ایکھ کا"

یہ سن کر بادشاہ سخت متعجب ہوا کہ اتنا شربت محض ایک ایکھ کا! مالگذاری تو اتنی کم ہے لیکن آمدنی بہت زیادہ!!

وہ دل میں ارادہ کرکے نکلا کہ مالگذاری ضرور زیادہ ہونی چاہئے اور پھر شکار میں مشغول ہو گیا جب شام کا وقت قریب آیا تو نوشیرواں پھر اس لڑکی کے پاس گیا۔ شکار کھیلتے کھیلتے تھک گیا تھا۔ اسے سخت پیاس معلوم ہو رہی تھی۔ پانی طلب کیا۔ بہت دیر کے بعد شربت کا پیالہ ہاتھ میں لئے باہر آئی۔ بادشاہ نے اس تاخیر کی وجہ پوچھی۔ لڑکی نے جواب دیا کہ "ایک ایکھ سے بقدر ضرورت شربت نہ نکل سکا۔ اس لئے تین ایکھ سے نچوڑنا پڑا لیکن باوجود اس کے اتنا شربت نہ ہو سکا جتنا ایک ایکھ سے نکلا تھا"

بادشاہ نے تعجب سے پوچھا "ایسا کیوں ہوا"

لڑکی نے جواب دیا "معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ سلامت کی نیت

جانوروں کے جذبات

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جانور انسان سے ہر بات میں مختلف ہیں۔ انکی ہر بات میں فرق ہے۔ لوگوں کا صرف یہی خیال نہیں ہے کہ انسان میں عقل ہے اور جانور اس سے محروم ہیں بلکہ ان کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ وہ بے زبان ہیں اور اپنے دلوں کی حالت نہیں بتا سکتے جب تک لوگوں کو ان کے متعلق علم نہ تھا اس وقت تک یہ خیالات صحیح سمجھے جاتے تھے لیکن جب سے ان کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی گئی اُس وقت سے اُنکی سمجھ اور دانائی نے دیکھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے، مشاہدہ کرنے والوں نے یہ محسوس کیا کہ جنگل کے رہنے والے بہت باتوں میں انسان سے لگ بھگ۔ اور بعض میں تو اُس سے بھی بڑھ گئے ہیں۔

جذبات کو لے لیجئے اور ایک ایک کرکے دیکھئے کہ اُس کے دل میں کون کون سے جذبات ہیں۔ عام طور سے یہ بات تجربہ میں آئی ہے کہ جانوروں کے دلوں میں غم غصہ۔ نفرت۔ خوف محبت غرض تمام جذبات ہوتے ہیں۔ ان کا وہ اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ سمجھنے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اس وقت جانور پر کیا گذر رہی ہے اُن کا غرانا، منہ سے جھاگ نکالنا۔ اکثر لوگوں نے دیکھا ہے بعض لوگوں نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ آنسوؤں کی جھڑی انکے رخساروں پر بندھ رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ رونا صرف گیدڑ کا حصہ ہے دوسرے جانور اس سے بالکل ناآشنا ہیں، لیکن رنج و راحت کا احساس سب کو ہے اس سے کوئی بھی بچا ہوا نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اُن کے جذبات کا پتہ کیسے لگتا ہے؟ اُن کے بدن کی حرکتوں سے، چہرہ کی حالت وغیرہ سے اُن کے دل کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ غصہ کو لیجئے اس میں سب سے پہلا نمبر بلی کی قسم کے جانوروں کا ہے۔ شیر سے لے کر بن بلاؤ اور گھریلو بلیاں تک یکساں ہیں۔ یہ سب کے سب بہت صاف اور زبردست طریقہ سے اپنے غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ دُم مروڑتے ہیں۔ کان پھیلاتے۔ منہ سے جھاگ نکالتے اور ساتھ ہی غراتے جاتے ہیں۔ اِن میں سب سے زیادہ غصہ ور اسکاٹ لینڈ کی جنگلی بلی ہوتی ہے جس کے غیظ و غضب کا یہ عالم ہے کہ کتا یا انسان اگر غصہ کی حالت میں سامنے آجائے تو پھر اُسکی خیر نہیں۔

پرندے اپنے غصہ کو دوسری طرح ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ کامیاب اُلو ہے۔ وہ اس صفائی سے غصہ کو جتاتا ہے کہ دیکھنے والے کے دل میں ذرا شبہ باقی نہیں رہتا۔ وہ پروں کو اُٹھاتا۔ بازوؤں کو ٹیکتا اور اپنی نارنجی آنکھوں سے گھورنے لگتا ہے۔ عقاب اور اُلو کی آنکھیں غصہ کی حالت میں بہت رعب دار معلوم ہوتی ہیں، سفید رنگ کا اُلو آنکھوں کو آدھا بند کرکے پنجوں پر کھڑا ہوتا۔ جلدی جلدی سر گھماتا اور ساتھ ہی ساتھ بھن بھنانے لگتا ہے تاکہ دیکھنے والے پر خوف طاری ہو جائے۔ ہُدہُد اپنی چونچ کھولتا اور اپنے تاج کو پھیلا کر غصہ کو ظاہر کرتا ہے۔

جانور اپنی خوشی کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ بلی خوش ہوتی ہے تو اپنے جسم چلاتی ہے۔ کتا دم ہلاتا ہے اور چلاتا بھی ہے۔ کتے کی خوشی اُس کی آنکھوں سے ٹپکتی ہے۔ مذاق و تفریح پر اُتر آتی ہے تو بھونک ہلاتی ہے۔ لومڑی مسرت کی حالت میں منہ کھولتی اور کانوں کو پھیلا کر پیچھے ڈالتی ہے۔ مور دار جانوروں کی مور سے خوشی لہراتی نظر آتی ہے۔ پرند اپنے پروں کو پھیلا کر بتاتے ہیں کہ وہ خوش ہیں۔ اُلو تو اپنے پر اتنے پھیلاتا ہے کہ پروں میں چھپ جاتا اور اُن کی گیند معلوم ہوتا ہے۔ بھورے رنگ کا اُلو اس رسیلی آواز سے اپنی شادمانی کا اعلان کرتا ہے کہ سننے والے کوئل کی آواز کو بھول جاتے ہیں۔

غصہ اور خوشی کے علاوہ اُن میں ہنسی دل لگی کرنے کا بھی جذبہ ہوتا ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بن مانس اپنے پنجرے کے قریب روٹی کے ٹکڑے ڈالتے۔ پاس آنے والے پرندے ٹھوکر مارتے اور آخر میں اُس کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ پالتو کتا اکثر گھاس میں چھپ کر اچانک بلی پر کود پڑتا ہے۔ بلی بھاگتی اور غصہ سے غرانے لگتی ہے لیکن جب کتا اُس کا منہ چڑاتا ہے تو وہ سمجھ جاتی ہے کہ یہ مذاق تھا۔ تیرنے والے پرند اپنے ساتھی کی دم چونچ میں لیکر پانی میں غوطہ لگا جاتے ہیں۔ اُس وقت اُن کے چہروں پر غور کیا جائے تو شرارت صاف نظر آتی ہے۔

وہ رنجیدہ بھی ہوتے ہیں اور سست بھی۔ لیکن سستی صرف اُن جانوروں میں پائی جاتی ہے جو قید ہوتے ہیں۔ مصروف و مشغول جانور ہمیشہ خوش و خرم رہتے ہیں۔ آزاد جانوروں میں چھوٹے بچے البتہ سست پڑ جاتے ہیں۔ انکی ماؤں کو دیر ہو جاتی ہے تو وہ چلاتے اور ممیاتے ہیں۔ غرض ہر طرح اپنی بےکسی کو بتاتے ہیں۔ ایک مرتبہ دو ا ود بلاؤ ساتھ رکھے گئے۔ دونوں ساتھ رہتے، ساتھ کام کرتے، کھیلتے اور ایک دوسرے کی گود میں سر رکھ کر سو جاتے۔ ان میں سے ایک کو الگ کر دیا گیا پھر کیا تھا؟ دوسرا جگہ جگہ اُس کو تلاش کرتا۔ نہ ملتا تو چلاتا۔ کبھی اپنے آقا کی بغل میں جا لیٹتا لیکن بار بار چونکتا اور اس حالت میں بھی ساتھی کو ادھر اُدھر دیکھتا۔ برسوں اس کی یہی حالت رہی۔

خطرہ اور مشکل کے وقت وہ غور و خوض بھی کرتے ہیں۔ گھوڑے اور کتے کو کان کھڑے کرتے اور گھورتے کس نے نہیں دیکھے۔ خرگوش اور لومڑی کا بھی یہی حال ہے۔ جہاں کھٹکا ہوا اور انھوں نے کان کھڑے کر لئے۔ گھوڑا کبھی اپنے دونوں کان کھڑے کرتا ہے کبھی ایک ہی۔ کبھی کان سامنے کرتا ہے کبھی پیچھے ڈالتا ہے۔ یہ اُس کے برہم ہونے کی علامت ہے ہاتھی بھی اسی طرح کرتا ہے۔ لیکن چوہے اپنے کانوں سے یہ کام نہیں لیتے۔ وہ خوف کے وقت اپنے منہ کو جلدی جلدی دھوتے ہیں۔ بندر منہ بسورتے اور بعض جانور لنگڑا کر چلتے ہیں۔

اُمید کا بھی اُن کے دل میں گذر ہے۔ بچوں کو دانہ کی اُمید میں چونچیں ہلاتے ہر شخص نے دیکھا ہے۔ اسی حالت میں وہ بازو بھی پھڑپھڑاتے ہیں۔ یہ گویا اصرار اور تقاضے کی علامت ہے لیکن بازوؤں کے پھڑپھڑانے سے صرف اصرار ہی نہیں ظاہر ہوتا بلکہ فکر کی حالت میں بھی یہی کرتے ہیں۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی بات سے تنگ آ جاتے ہیں۔ جب اُن کو کسی بات سے کوفت ہونے لگتی ہے تو وہ جمائی لیتے ہیں۔ گھوڑا جب اصطبل میں کھڑے کھڑے اُکتا جاتا ہے تو جمائی لیتا ہے

شریر لڑکا

چوتھا منظر

(دارالاقامہ کے پاس کھیل کا میدان ہے۔ لڑکے ہاکی کھیل رہے ہیں، طرار اسٹک لیے ہوئے آتا دکھائی دیتا ہے)

ایک لڑکا۔ آج طرار بھی کھیلنے آ رہے ہیں۔

داؤد۔ آنے دو کیا حرج ہے۔

اظہار۔ جی ہاں جب اسٹک رسید کریں گے تو معلوم ہو گا کیا حرج ہے۔ آپ کھیلئے۔ بندہ تو چلا۔

اور لڑکے۔ چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ بڑے میدان میں کھیلیں گے۔

داؤد۔ تو پھر میں بھی چلتا ہوں۔

(سب چلے جاتے ہیں۔ طرار ان کے پیچھے دوڑنا چاہتا ہے مگر چند قدم جا کر رک جاتا ہے اور دیر تک ادھر دیکھتا رہتا ہے۔ صالح دارالاقامہ کی طرف سے آتا ہے۔)

صالح۔ کیوں بھائی طرار، تم اکیلے کیوں کھڑے ہو اور سب کہاں گئے؟

طرار۔ میری صورت دیکھتے ہی کھسک گئے۔ وہ دیکھو بڑے میدان میں کھیل رہے ہیں۔

صالح۔ تم سے سب ڈرتے ہیں۔

طرار۔ ڈرتے کیا ہیں، مجھے مرکھنا بیل یا بھوت سمجھتے ہیں۔ میرے سایہ سے بھاگتے ہیں۔

صالح۔ خیر تم کچھ پرواہ نہ کرو میں تمہارے ساتھ کھیلتا ہوں ابھی جا کر اسٹک اور گیند لاتا ہوں۔

طرار۔ بس رہنے دیجئے، آپ کو کھیلنا بھی آتا ہے۔ بچ بچ کر کے کھیلتے ہیں۔

صالح۔ کھیلنا نہیں آتا تو تم سکھاؤ۔

طرار۔ سکھاؤں کیا خاک آپ سے دوڑا تک تو جاتا نہیں۔ بطد بطد کرتے چلتے ہیں، جیسے بطخ۔

صالح۔ (طرار کے گلے میں باہیں ڈال کر) بھائی آج تم خفا ہو اور ہونا بھی چاہیئے۔ اور سب گھر جائیں گے اور تمہیں یہاں اکیلا رہنا پڑے گا۔ سچ کہتا ہوں مجھے اس کا بڑا قلق ہے، میں نے ماسٹر صاحب کی بڑی منتیں کیں کہ تمہیں گھر جانے کی اجازت دیدیں نہیں تو مجھے بھی تمہارے ساتھ رہنے دیں، مگر وہ ایک نہیں سنتے۔ کہو صدر صاحب سے کیا باتیں ہوئیں؟

طرار:۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) بھائی انھوں نے آج مجھے بڑی شرم دلائی۔ یوں تو بڑی محبت سے باتیں کیں جیسے ہمیشہ کرتے ہیں، مگر کہا کہ تم اماں، ابا اور بہن سب کا دل دکھاتے ہو اور سب کو ستاتے ہو ایسا نہ ہو کہ تم ایک دن ڈاکو بن جاؤ اور جیل میں بند کر دیئے جاؤ پھر یہ کہا کہ تم بہادر ہو، اچھے کام کرو گے تو بڑا نام ہوگا، سب لوگ بھائی سمجھیں گے اور اللہ تعالیٰ خوش ہوگا۔ مجھے تم سے بڑی امیدیں ہیں۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر باتیں کر رہے تھے۔ میں شرم کے مارے رویا پڑتا تھا مگر روتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔

صالح:۔ خیر خدا کا شکر ہے سب کہتے تھے طرار کو سزا دیں گے مگر میں کہتا تھا سمجھائیں گے۔ ایسا محبت والا استاد کہاں ملے گا جو خفگی میں بھی شاباشی دے۔ جو ان کے پاس جاتا ہے اس کا جی خوش ہو جاتا ہے، اور ہمت بڑھ جاتی ہے۔ بھائی یہ بات تو ماں باپ میں بھی نہیں ہوتی ایسے بزرگ کی بات دل میں بیٹھ جاتی ہے آدمی کبھی نہیں بھولتا۔

طرار:۔ میں اُن کی آج کی باتیں کبھی نہیں بھولوں گا۔ اور سنا صالح! میں نے جو باؤلے کتے کو مارا تھا اس کا حال انھیں معلوم ہے۔

صالح:۔ انھیں سارا حال معلوم رہتا ہے۔ اچھا گھر جانے کے لئے کیا کہا؟

طرار:۔ کہا کہ تم دس روز تک سیدھی طرح رہو گے تو چار دن کی چھٹی ملے گی، وہ بھی اماں کی بیماری کے سبب سے

صالح:۔ کیا کریں قاعدے سے وہ بھی مجبور ہیں، مگر تم گھبراؤ نہیں، شاید جلدی چھٹی مل جائے۔ اور جب تک رہو گے صدر صاحب اپنے گھر بلائیں گے اپنے ساتھ کھانا کھلائیں گے۔ اور اچھی اچھی باتیں کریں گے، مجھے معلوم ہے وہ ہمیشہ یہی کرتے ہیں۔

طرار:۔ ہاں بھائی یہ سب ٹھیک ہے مگر اماں آج بہت گھبراتی ہونگی اور بہن رو رو کر برا حال کرے گی۔

صالح:۔ خدا کرے تمہیں پرسوں ہی چھٹی مل جائے (چونک کر) ارے وہ دیکھو نیولا!

طرار:۔ کہاں کہاں (دوڑ پڑتا ہے، صالح بھی اس کے پیچھے دوڑتا ہے پردہ گرتا ہے)

پانچواں منظر

پہلے منظر کی طرح اسٹیج کے آدھے حصے میں کھیل کا میدان ہے آدھے میں دارالاقامہ کا سونے کا کمرہ۔ رات کا وقت ہے۔ کمرے کی پشت کی طرف دروازہ میں آگ لگی ہوئی ہے۔ شعلے اور دھواں نظر آتا ہے۔ سعید روتا ہوا ادھر اُدھر دوڑ رہا ہے۔ داہنی طرف کی دیوار کے باہر کھیل کے میدان میں لڑکے جمع ہیں۔ ایک بھیڑ مچی ہوئی ہے۔ ماسٹر صاحب اور صدر مدرس بڑی تیزی سے داخل ہوتے ہیں)

صدر مدرس:۔ سب لڑکے باہر ہیں کوئی اندر تو نہیں۔

اظہار:۔ (رو کر) ماسٹر صاحب سعید اندر رہ گیا۔ دروازے میں آگ لگی ہے۔ اب کیسے نکلے گا۔

صدر مدرس:۔ گھبراؤ نہیں ابھی نکلتا ہے۔ اللہ بچانے والا ہے مگر ابتری سے کام نہیں چلے گا۔ تم لوگ سب ایک صف میں کھڑے ہو جاؤ (بلند آواز سے) ایک صف میں۔

(سب لڑکے صف باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

صدر مدرس (ہاتھ کے اشارے سے) یہاں تک آدھے لڑکے داہنی طرف مڑ جاؤ۔ باقی بائیں طرف

(لڑکے تعمیل کرتے ہیں)

(داہنی طرف کی جماعت سے) تم لوگ باغ سے بڑی سیڑھی لاؤ اور کنوئیں کے پاس رسی ہے وہ بھی لیتے آنا

(لڑکے دوڑ کر جاتے ہیں)

(بائیں طرف کی جماعت سے) تم سب حوض پر جاؤ۔ آدمی آگ بجھانے کو جمع ہیں انھیں گھڑوں میں پانی بھر بھر کے دو۔

(یہ لڑکے چلے جاتے ہیں) داہنی طرف سے وہ لڑکے جو پہلے گئے تھے واپس آتے ہیں)

ماسٹر صاحب:۔ ہیں! تم لوگ گئے نہیں؟

ایک لڑکا:۔ ماسٹر صاحب طرار آپ کے آنے سے پہلے ہی سیڑھی لینے چلے گئے تھے۔ ہمیں لوٹتے ہوئے ملے

(طرار چھوٹی سیڑھی لئے داخل ہوتا ہے۔ اس پر رسی بھی لٹکی ہوئی ہے)

صدر مدرس:۔ شاباش طرار۔ مگر تم چھوٹی سیڑھی لائے، کمزور ہے کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ اچھا لگاؤ جلدی سے۔ میں چڑھتا ہوں۔ (طرار سیڑھی لگاتا ہے۔ چند لڑکے سیڑھی تھام کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

ماسٹر صاحب:۔ (آگے بڑھ کر) مجھے چڑھنے دیجئے۔ یہ میرا کام ہے۔

طرار رسی کا ایک سرا ہاتھ میں لئے آناً فاناً چڑھ جاتا ہے اور روشندان سے رسی اندر پھینکتا ہے

صدر مدرس } ماسٹر صاحب } ہائیں ہائیں! طرار دیکھو اتر آؤ۔

طرار:۔ بھائی صالح اور اظہار ذرا رسی تھامنا۔ ماسٹر صاحب آپ یہاں آجائیے۔ میں اندر اُترتا ہوں

(اظہار اور صالح رسی تھامتے ہیں۔ طرار رسی پکڑ کر اندر اترتا ہے۔ ماسٹر صاحب بھی سیڑھی پر چڑھ جاتے ہیں)

سعید:۔ (روتا ہوا دوڑ کر طرار سے لپٹ جاتا ہے) بھائی مجھے یہاں سے نکالو۔ اظہار بھائی کہاں ہیں؟

طرار:۔ (اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر) اظہار بھائی باہر کھڑے ہیں۔ ہم بس دم بھر میں نکلتے ہیں۔ دیکھو روؤ مت۔ مرد بچے کہیں روتے ہیں۔ یہ لڑکیوں کا کام ہے۔

ماسٹر صاحب: جلدی کرو طرار۔

طرار:۔ ماسٹر صاحب میں اس تپائی پر کھڑا ہوتا ہوں۔ آپ سعید کو لے کر اتار دیجئے۔ پھر مجھے چڑھا لیجئے۔

(یہی ہوتا ہے۔ پہلے سعید کو ماسٹر صاحب چند سیڑھی اتر کر اظہار کی گود میں دیدیتے ہیں۔ پھر طرار کو ہاتھ پکڑ کر چڑھا لیتے ہیں۔ دونوں آگے پیچھے اُترتے ہیں)

ماسٹر صاحب:۔ (بڑے جوش میں طرار کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں)

شاباش طرار! آج تو نے جواں مردی کا کام کیا۔ میں تجھے ایک ہزار ایک نمبر دیتا ہوں۔ کل تو سب سے پہلے گھر جائیگا ڈاک گاڑی سے۔

اظہار:۔ روتا ہوا طرار کو گلے لگاتا ہے

طرار! آج سے تم میرے پیارے بھائی ہو۔

سعید:۔ (ہنستا ہوا اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے) اور میرے بھی۔

(اور لڑکے بھی دوڑتے ہوئے آتے ہیں)

صدر مدرس:۔ (طرار کے سر پر ہاتھ پھیر کر) لو بیٹے آج سے تمہارے دو بھائی اور ہو گئے۔ دیکھو یہ سلسلہ بڑھتا ہی رہے۔ گھٹنے نہ پائے۔ (ماسٹر صاحب سے) آپ ان سب لڑکوں کو حوض پر لے جائیے کہ آگ بجھانے میں مدد دیں۔ میں بھی آتا ہوں۔

ماسٹر صاحب:۔ آؤ بھئی چل کے اب آگ بجھائیں۔

(لڑکے طرار کو اُٹھا لیتے ہیں اور زندہ باد طرار کے نعرے لگاتے چلے جاتے ہیں)

صدر مدرس:۔ یا اللہ اس آگ کو ان معصوم بچوں کے ہاتھوں اپنے رحمت کے چھینٹوں سے بجھا دے اور اس بڑی آگ کو بھی جس کے شعلے ہمارے ملک میں بھڑک رہے ہیں اور ہمارے دلوں کو جو تیرے گھر ہیں جلا کر خاک کئے دیتے ہیں۔ الٰہی یہ بچے اس آگ کی لپٹ سے جھلسنے نہ پائے بلکہ اُس کی آنچ میں تپ کر کندن بن جائیں۔

(چلا جاتا ہے۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

ختم شد

صفحہ ۵ کا بقیہ

لیکن جمائی میں منہ زیادہ نہیں کھولتے اگر جمائی لینے میں تمام دانت دکھائی دے جائیں تو یہ کوفت نہیں غصہ کی علامت ہے لیکن ہر جانور غصہ میں دانت نہیں نکالتا۔ مثلاً قطبی بلی۔ ابابیل نیولا اور اود بلاؤ اپنے بالوں کو کھڑا کر کے اپنی کوفت کا اظہار کرتے ہیں۔

لیکن اُن سب میں عجیب بات یہ ہے کہ جانوروں کو جھوٹے سچے کی بھی تمیز ہوتی ہے۔ وہ اپنی غلطی پر نادم بھی ہوتے ہیں۔ دلدلی مرغیاں تالابوں کے قریب اپنے لئے جگہ پسند کر لیتی اور اُسکی حدود مقرر کر لیتی ہیں۔ اگر کوئی دوسرے کی حد میں قدم رکھے تو اُس کو سزا دی جاتی ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ زیادتی کرنے والی مرغیاں لڑائی کے وقت اُس جوش سے مقابلہ نہیں کرتیں جس دلیری سے دوسری مرغیاں اُن پر حملہ کرتی ہیں۔ گویا اُن کو غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ تھوڑے سے مطالعہ اور تجربے نے ہم کو یہ بتا دیا کہ جانوروں کو قدرت کی طرف سے کیا کچھ ملا ہے۔ اور اس کو وہ کس طرح ظاہر کرتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ زیادہ مطالعہ یا کافی عرصہ کے غور و فکر کرنے کے بعد یہ معلوم ہو کہ وہ رحم و انصاف میں بھی انسان سے کسی طرح کم نہیں۔

فاطمہ اور رحیم الدین

پچھلے نمبر میں یہ بتایا گیا تھا کہ حکومت کس کو کہتے ہیں اور حکومت کے فرائض کیا ہیں۔

کھانا ختم ہوتے ہی رحیم الدین نے جھٹ پٹ ہاتھ دھویا کلّی کی اور باپ کے پاس بیٹھ گیا۔ فاطمہ کو بھی اس نے جلدی سے بلایا اور جب وہ پہنچ گئی تو باپ سے کہا:

"ابا جان، آج آپ نے یہ بتانے کا وعدہ کیا تھا کہ اچھی حکومت کیسی ہوتی ہے، اب بتائیے۔"

باپ نے جواب دیا: "میں یہ تو بتا دوں گا کہ اچھی حکومت کیسی ہوتی ہے، مگر تم کو یہ بھی یاد ہے کہ حکومت کا کام کیا ہوتا ہے؟"

رحیم الدین کچھ سوچ کر بولا: "جی ہاں، حکومت کا کام یہ ہوتا ہے کہ بستی کی تمام دشمنوں سے حفاظت کرے، چاہے وہ دشمن غیر لوگ ہوں یا بستی والے ..... اور تعلیم دینا اور تجارت کے لئے ....."

باپ نے کہا: "ہاں ٹھیک ہے حکومت کا کام ہے حفاظت کرنا، تعلیم کا انتظام کرنا، تجارت کے لئے آسانیاں پیدا کرنا، بستی صاف ستھری رکھنا، اور اس کے علاوہ بستی والوں کی جو ضرورتیں ہوں وہ پوری کرنا۔ حکومت کا کام کئی حصوں میں تقسیم ہوتا ہے، انھیں محکمے کہتے ہیں، جیسے محکمہ فوج، جو سپاہیوں کی تنخواہیں وغیرہ دیتا ہے، ان کی نگرانی کرتا ہے اور ضرورت کے وقت ان سے کام بھی لیتا ہے۔ اس محکمہ کا سب سے بڑا افسر وزیر جنگ کہلاتا ہے، اور اس کے دفتر کو وزارت فوج کہتے ہیں۔ محکمہ فوج کی طرح عدالت، تعلیم وغیرہ کے الگ الگ محکمے ہوتے ہیں۔ یہ سب محکمے مل کر حکومت کہلاتے ہیں۔ اور ایک بات اور یاد رکھو، جب بستی میں حکومت کا پورا انتظام ہو جائے اور بستی کے رہنے والوں کا بڑا حصہ ایک طرح کے خیالات، ایک طرح کے ارادے اور حوصلے رکھتا ہو، جو اس کے خیال میں سب کے ساتھ رہنے اور ایک حکومت کے ماتحت ہونے سے پورے ہو سکیں گے تو پھر بستی صرف بستی نہیں رہتی، وہ ایک ریاست ہو جاتی ہے۔ سمجھیں فاطمہ؟ وہ بستی جس میں سب کی رائے کے موافق ایک حکومت قائم ہو جائے، اور سب سمجھیں کہ حکومت کے قائم رہنے سے ان کا فائدہ ہوگا، تو وہ ریاست کہلاتی ہے۔"

رحیم الدین نے فاطمہ کا کندھا ہلا کر پوچھا "کہو سمجھ گئیں؟" فاطمہ کو یہ ناگوار ہوا، اور اس کی آنکھوں نے رحیم الدین کو یہ بتا بھی دیا، لیکن باپ کو اطمینان تھا کہ فاطمہ سب سمجھ رہی ہے اور اس نے کہا:

"یہ سوال کہ حکومت کا کونسا طریقہ سب سے اچھا ہے، بہت پرانا ہے، اور اس کا اب بھی کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ پہلے پہل لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ دشمنوں سے لڑنا سب سے زیادہ ضروری کام ہے۔ اور اس لئے حکومت کا سارا کام بادشاہوں کے سپرد ہوتا تھا۔ جب لڑائی ہو تو یہی بہتر ہوتا ہے کہ ایک آدمی جو سب سے زیادہ ہوشیار اور بہادر ہو، سب کا سردار بنا دیا جائے۔ لیکن لڑائی کوئی نیک کام تو نہیں ہے جس کے کرنے سے ہمیشہ برکت ہو لوگ لڑتے لڑتے تھک جاتے ہیں، یا وہ لڑائی کو اپنی حفاظت کے لئے ضروری نہیں سمجھتے، یا ان کے دلوں میں یہ شبہہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بادشاہ انھیں صرف اس واسطے لڑا رہا ہے کہ دوسرے بادشاہوں کے مقابلے میں بڑا بن سکے۔ اس کے علاوہ جیسے جیسے ریاست بڑھتی ہے، اس میں ہوشیار اور بہادر آدمی بھی زیادہ ہوتے جاتے ہیں، وہ یہ نہیں مانتے کہ بادشاہ ان سے زیادہ ہوشیار یا بہادر یا ریاست کا خیر خواہ ہے، اور اس وجہ سے اکثر بادشاہت کے بعد ایک ایسی حکومت قائم ہوتی ہے، جسے اشرافیہ کہتے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت ان لوگوں کے سپرد ہوتی ہے جو سب سے زیادہ شریف، چال چلن کے اچھے، اور ریاست کی بھلائی چاہنے والے ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ دیکھنے میں ہے تو اچھا، مگر اس میں دشواری یہ ہے کہ جیسے بعض بادشاہ نیک ہوتے ہیں اور بعض برے، ویسے ہی شریفوں میں بہت سے اچھے ہوئے تو کچھ برے بھی ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے حکومت ٹھیک طرح سے نہیں کی جا سکتی اور جو اپنے فائدے کے لئے ریاست کو نقصان پہنچانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اگر ریاست کے لوگ ہوشیار اور ہمت والے ہوئے تو وہ یہ حالت دیکھ کر حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں، جیسے یونان میں اثینہ کے لوگوں نے کیا تھا، اور اگر نہ ہوئے تو ریاست میں بہت ابتری پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی حکومت کسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے، کبھی کسی کے۔ سب اپنی اپنی فکر میں پڑے رہتے ہیں اور ریاست کی کوئی خبر نہیں لیتا، پھر جو ریاست کی قسمت میں ہو۔ اس کا حال وہی ہوتا ہے جو طوفان میں کشتی کا۔ بچ گئی تو بچ گئی، نہیں تو مسافروں سمیت سمندر کی تہ تک جا پہنچتی ہے۔ لیکن اگر ریاست کے لوگ جوانمرد ہوئے، جیسے اثینہ کے لوگ تھے، تو وہ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ یہ طریقہ جس میں ریاست کے تمام لوگ حاکم بھی ہوتے اور محکوم بھی، جمہوریت کہلاتا ہے۔ اسے سوراج بھی کہتے ہیں، یعنی اپنے اوپر خود حکومت کرنا۔ ہمارے زمانے میں لوگوں کا خیال ہے کہ یہی حکومت سب سے اچھی ہوتی ہے۔

ہاں، تو حکومت کے تین طریقے ہوئے، ایک آدمی کی، چند آدمیوں کی، اور سب لوگوں کی۔ جیسے حاکم ہوتے ہیں ویسی ہی حکومت ہوتی ہے، اچھے حاکم ہوئے تو اچھی حکومت اور برے ہوئے تو بری۔"

رحیم الدین نے پوچھا "مگر ابا جان یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سب کے سب حاکم بن جائیں؟ پھر تو کوئی کسی کا کہنا ہی نہ مانے گا۔"

باپ نے کہا "حکومت کرنے کے معنی یہ نہیں کہ ہر شخص دوسرے کو حکم دیا کرے اور خود کسی کی بات نہ سنے۔ اس کی تفصیل ہم تمہیں کل بتائیں گے۔"

دنیائے سائنس کے روشن ستارے

مائیکل فیریڈے

(۱)

اس نے کس طرح ترقی کے زینہ پر قدم رکھا

اب تک ہم نے جتنے سائنسدانوں کے حالات بیان کئے ہیں، ان پر غور کرنے سے دو باتیں نمایاں طور پر معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ وہ عموماً مفلس اور تنگدست گھرانوں میں پیدا ہوئے دوسرے یہ کہ مفلسی کی وجہ سے ان کی تعلیم معمولی لکھائی پڑھائی سے زیادہ نہیں ہوئی۔ ذیل میں جس سائنسداں کے کارنامے بیان کئے جاتے ہیں وہ بھی اسی مفلس جماعت کا ایک کامیاب رکن تھا۔ اس کا نام مائیکل فیریڈے تھا۔ اس کا باپ لوہار کا کام کرکے بمشکل اپنے خاندان کا پیٹ پالتا تھا۔ اس زمانہ میں جب انگلستان میں قحط پڑا تو فیریڈے کا خاندان بھی پبلک امداد لینے پر مجبور ہوا۔ غریب فیریڈے کے حصے میں روٹی کا صرف ایک ٹکڑا آتا جس پر اس کو ایک ہفتہ بسر کرنا پڑتا۔

یہ ہونہار لڑکا جب کچھ لکھنا پڑھنا اور حساب کے معمولی سوال حل کرنا سیکھ گیا تو مفلسی کی وجہ سے اس کے باپ نے اُسے ایک کتب فروش کی دوکان پر کام سیکھنے کے لئے رکھدیا۔ اس کتب فروش کی دوکان پر جلد سازی کا کام بھی ہوتا تھا۔ فیریڈے کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ گاہکوں کے یہاں تازہ اخبارات پہنچا دیا کرے اور جب وہ ان کا مطالعہ کر چکیں تو واپس لاکر دکان پر رکھ دیا کرے مالک دکان نے فیریڈے کی کارگذاری سے خوش ہوکر اُسے جلد سازی کے کام پر لگا دیا۔ یہ ترقی بھی اگرچہ بلا تنخواہ ہی تھی لیکن فیریڈے کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس طرح اس کو مختلف کتابوں کے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ جلد بندھنے کے لئے جو کتاب بھی اس کے ہاتھ آتی وہ اس کو پڑھے بغیر واپس نہ کرتا۔ اس زمانہ کے مطالعہ نے اس کی زندگی کا مقصد معین کردیا اور سائنس سے اُس کی دلچسپی روز بروز بڑھنے لگی اور تجارتی کاروبار اس کو خود غرضی اور نفس پرستی کا مجسمہ نظر آنے لگا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی غیبی آواز اُسے سائنس کی خدمت کی طرف بلا رہی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ڈیوی کی شہرت کا ڈنکا یورپ کے گوشے گوشے میں بج رہا تھا۔ لندن میں اسکی تقریریں مقناطیسی قوت کا کام دے رہی تھیں۔

فیریڈے دوران ملازمت میں اپنی ذہانت اور شیریں کلامی کی وجہ سے بعض جوہرشناس گاہکوں کے دل میں گھر کرچکا تھا چنانچہ انہیں میں سے ایک شخص نے فیریڈے کو ڈیوی کے لیکچر سننے کے لئے چار ٹکٹ دئے۔ لیکچر سننے کے بعد سائنس کے اس شیدائی نے ان کے تفصیلی نوٹ ایک کاپی میں لکھے اور حسب ضرورت شکلیں کھینچ کر ان کو ہر طرح سے مکمل کرلیا۔ سائنس کی تحصیل کا شوق اب اس میں روز بروز بڑھنے لگا، لیکن اپنی دلی آرزوؤں کو پورا کرنے کے لئے کوئی سبیل اس کو نظر نہیں آتی تھی۔ کچھ عرصہ تک اسی کشمکش و پیچ میں رہنے کے بعد اس نے ایک درخواست ڈیوی کی خدمت میں ارسال کی اور اس کے ساتھ وہ نوٹ بھی بھیجدئے اس نے ڈیوی کے لیکچروں کے متعلق تیار کئے تھے۔

ڈیوی اس کی اس کوشش کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اس میں اس کو اپنی قابلیت اور فیرے ڈے کی ذہانت منقوش نظر آتی تھی۔ درخواست کو پڑھ کر اس نے اپنے ایک رفیق کار سے کہا "میرے پاس فیریڈے نامی ایک نوجوان کی درخواست آئی ہے جو میری تقریریں سنتا رہا ہے اور اب اس انسٹی ٹیوشن میں کسی ملازمت کا طالب ہے۔ آپ مشورہ دیجئے کہ اس کے لئے کیا صورت اختیار کی جائے"۔ اس نے جواب دیا "کیا صورت کی جائے؟" اس نے کہا کیا صورت کی جائے؟ اس سے شیشیاں صاف کرنے کا کام لیجئے۔ شوق ہوگا تو خوشی سے کرے گا اور اگر انکار کرے تو جانے دیجئے۔" ڈیوی نے کہا "ابھی نہیں، جگہ دنیا ہی ہے تو کوئی بہتر جگہ دینی چاہئے۔

فیرے ڈے کی خوش قسمتی سے چند ہی ماہ کے بعد رائل انسٹی ٹیوشن میں ایک مددگار عملیات کی ضرورت پڑی۔ اور ڈیوی نے اس نوجوان کو ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ ملاقات کے دوران میں ڈیوی اور اس کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ ملاحظہ کیجئے:۔

مسٹر فیریڈے! جگہ تو خالی ہے اور میں اس کے لئے تمہارا تقرر کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن بطور مشورہ کے میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرلو۔ تجارتی کاروبار کو چھوڑنا میرے خیال میں ٹھیک نہیں۔ تجارت اور صنعت و حرفت میں بیشمار فائدے ہیں۔ (باقی آئندہ)

(بقیہ صفحہ ۵ کا مضمون)

کچھ بدل گئی ہے"۔

نوشیرواں نے پوچھا "تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا"۔

لڑکی نے جواب دیا "میں بڑے بڑے عقلمندوں سے سنتی آئی ہوں کہ "جب بادشاہ کی نیت بدل جاتی ہے تو رعایا سے برکت اٹھ جاتی ہے اور انکی خوش بختی رخصت ہوجاتی ہے"۔

نوشیرواں یہ سن کر ہنس پڑا اور اس لڑکی کی ذہانت، تیزی اور حاضر جوابی سے اتنا خوش ہوا کہ اسے بہت سا انعام واکرام دیا۔

چین اور جاپان کی موجودہ جنگ

(۲)

جنگ کے اسباب

دنیا کے ہر اخبار نے نہایت موٹے اور جلی حرفوں میں جاپان کے بیانات شائع کئے۔ جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جنگ کا سارا قصور اسی خاموش اور نالائق چین کے کندھے پر ہے۔ اور جاپان نے بھی جنگ کے جو وجوہ دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں، وہ مختصر الفاظ میں یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ پیام بھائی اپنی عقل وفہم کے مطابق انکا فیصلہ کریں۔

جاپان نے کہا کہ اس کا ایک کپتان ناکا مورہ (Nakamura) نام، اندرونی مانگولیہ میں سفر کرتے کرتے کسی چینی سپاہی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور حکومت چین نے اسکی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ دوسری وجہ یہ کہ چند چینی سپاہیوں نے جنوبی منچوریا کی ریل کا ایک حصہ تباہ کر دیا۔ تیسری وجہ یہ کہ منچوریا چینی قزاقوں اور ڈاکوؤں کا گہوارہ بن گیا ہے۔ چوتھی یہ کہ جاپان کے چند رہبان شنگھائی میں اس وجہ سے چینی عوام کے ہاتھ سے مارے گئے کہ وہ ایک چینی کارخانہ میں آگ لگا رہے تھے۔ یہ ہیں وہ وجوہ جن کی بنا پر جاپان نے چین پر فوج کشی کی۔ ان چار خاص وجوہ کے علاوہ اور دو عام وجوہ بھی ہیں جن کے بہانہ سے جاپان اپنی فوجی کارروائی سے باز نہ آیا، اور فوجیں پہ فوجیں سمندر اور ساحل چین پر بھیجتا رہا۔ ان دو وجہوں میں سے ایک یہ ہے کہ چینیوں کے مسلسل جاپانی مال کے مقاطعہ کرنے سے اس کی معاشی بنیاد ہلنے لگی ہے۔ اور دوسری یہ کہ چین صرف ایک جغرافی نام کے سوا، اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا، کیونکہ چین کی نہ کوئی منظم حکومت ہے، اور نہ مرکزی قوت۔ اندرون چین میں بدنظمی اور فساد ہونے کی وجہ سے جاپانیوں کا جان ومال ہمیشہ خطرہ میں رہتا ہے۔ ان بہانوں کے ذریعہ جاپان دنیا کی اور قوموں کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کرتا رہا ہے اور دنیا کی اکثر قومیں بھی جاپان کی شکایت کو بجا سمجھتی ہیں۔ اور اس کی حمایت کے لئے زبردست پروپیگنڈا کر رکھا ہے۔

اب دیکھو، بیچارا چین کیا کہتا ہے؟ چین کہتا ہے کہ اولاً یہ بات ثابت نہیں کہ ناکا مورہ کوئی جاپانی کپتان تھا جو کہ چینی سپاہی کے ہاتھ سے مانگولیہ میں مارا گیا۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ ناکا مورہ کوئی جاپانی کپتان تھا، تو اندرونی مانگولیہ میں سفر کرتے وقت چینی حکام کو اطلاع کیوں نہیں دی گئی تاکہ اسکی حفاظت کے لئے معقول انتظام کیا جاتا۔ چینی حکام کی اجازت کے بغیر چین کا سفر کرنا نہ صرف چین کی توہین ہے، بلکہ خلاف قانون بھی ہے۔ دوسرے

یہ کہ جنوبی منچوریا ریلوے کا انتظام جب سے جاپان کے ہاتھ میں آگیا، تب سے جاپانی پولیس اسکی سخت نگرانی رکھتی ہے، جس کی وجہ سے نہ صرف کسی چینی سپاہی کا ریلوے لائن کے پاس جانا مشکل ہے بلکہ اسکی حدود میں کسی سپاہی کو بھی جانے کی اجازت نہیں ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی چینی سپاہی کو جنوبی ریلوے کے خراب کرنے کا موقع ملا ہوگا، تیسرے یہ کہ جب تمام چین قوم پرستوں کے ماتحت متحد ہوگیا تو منچوریا سب سے زیادہ پرامن مقام ثابت ہوا۔ ثبوت یہ ہے کہ وہاں نہ کوئی قحط پڑا، اور نہ سیلاب کی آفت آئی۔ علاوہ بریں انتظامی فوج کافی رکھی گئی جس کی وجہ سے منچوریا میں بدامنی کا نام بھی سننے میں نہ آیا۔ اس وقت جاپان کا یہ کہنا کہ منچوریا چینی قزاقوں اور ڈاکوؤں کا گہوارہ ہے، صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ وہاں کی انتظامی فوجوں کو جو حکومت چین کی طرف سے مقرر ہیں، منچوریا سے، نکال دینا چاہتا ہے، تاکہ وہ خود وہاں پر اپنا اقتدار قائم کرسکے۔ چوتھے یہ کہ وہ رہبان جو چینی عوام کے ہاتھ سے مارے گئے تھے حقیقت میں رہبان نہ تھے بلکہ جاپان کی بحری فوج کے سپاہی تھے جنھوں نے رہبان کا بھیس اختیار کرلیا تھا۔ ان کا اصلی مقصد یہ تھا کہ چین کے بازاروں میں گشت لگائیں اور وہاں ایسی حرکت کریں جس سے چینی عوام کو غصہ آجائے، اور وہ جاپانیوں کی دشمنی کا اظہار کرنے لگیں تاکہ اسی بہانہ سے جاپان، چین کے خلاف کوئی فوجی کارروائی کرسکے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جاپان اپنی ملوکیت پھیلانے کے لئے مختلف مقامات پر مختلف بہانے تلاش کرتا ہے۔ منچوریا پر فوجکشی کی، تو اس لئے کہ وہاں چینی قزاق تھے، شنگھائی پر حملہ کیا، تو اس لئے کہ ان کے رہبان چینیوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ یہ ایک نہایت عجیب بات ہے کہ چینی تو قزاق ہوں اور جاپانی رہبان!

رہا جاپانی مال کا مقاطعہ، یہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ اہل چین نے اس وقت مقاطعہ کی تحریک نہیں کی جب تک جاپان نے منچوریا پر قبضہ نہیں کیا یعنی مقاطعہ کی تحریک جاپان کی فوجی کارروائی کے بعد شروع ہوئی۔ یہ تحریک جاپان کی پیدا کردہ ہے، نہ کہ چینیوں کی ایجاد، اس لئے سارا قصور چینیوں کی گردن پر رکھنا ناانصافی ہوگی۔ جاپان کی سب سے آخری شکایت یہ ہے کہ چین ایک غیر منظم ملک ہے۔ وہاں حکومت اس قدر کمزور ہے کہ امن قائم نہیں رکھ سکتی۔ ہم نے مانا کہ چین غیر منظم ہے، تو جاپان کا بحیثیت ایک قریبی ہمسایہ کے کیا یہ فرض ہے کہ چین میں اور زیادہ بدامنی اور فساد پیدا کرائے؟ بلکہ اس کا برتاؤ تو ایسا ہونا چاہیئے جس سے چین کی ہمت بڑھے اور وہ ملک کا بہترین انتظام قائم کرنے میں چین کی مدد کرے۔ مگر نہ اس نے چین کا ساتھ دیا اور نہ اسکی ہمت افزائی کی۔ بلکہ مختلف حیلے اور بہانے سے جمہوریت چین کو دبانا شروع کیا۔ اور اس وقت جاپان نے ایک طرف تو اپنی فوجی کارروائیوں سے چین کے بہت سے خوبصورت شہروں کا ستیاناس کردیا، اور دوسری طرف چین میں مزید بدنظمی پھیلانے کے لئے منچوریا میں ایک نئی ریاست (جو کہ ریاست مانچو کے نام سے موسوم ہے) حکومت نانکن کے خلاف قائم کردی جس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ منچوریا کی سرزمین پر جاپان کا اقتدار قائم رہے۔

کوائفِ جامعہ

اپریل کے پہلے ہفتہ میں جامعہ کے دو ہونہار سپوت ڈاکٹر عبدالعلیم احراری اور ڈاکٹر محمود حسین خاں جرمنی سے بعد فراغت تعلیم واپس آئے ہیں ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب احراری جامعہ کے شعبہ اسلامیات میں بی۔اے امتیازی کی سند حاصل کی تھی اور جرمنی میں بھی آپ نے اپنا مضمون اسلامیات ہی سے متعلق رکھا، یعنی اعجاز القرآن۔ آپ نے اپنے مقالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ خیال مسلمان علماء میں کب سے شروع ہوا اور اس موضوع پر عربی زبان کی مطبوعہ تصانیف یا قلمی نسخوں میں جو بحثیں ہیں انھیں آپ نے یکجا کیا ہے۔ آپ کا یہ پورا مقالہ جب طبع ہوجائے گا تو اس موضوع پر معلومات کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہوگا۔ برلن یونیورسٹی سے آپ کو اس موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری ملی ہے۔ آپ نے کوئی ۲½ سال جرمنی میں تعلیم پائی اور اتنی کم مدت کے اندر فارغ التحصیل ہوجاتے ہیں آپ جامعہ کے سب سے پہلے طالب علم ہیں۔

ڈاکٹر محمود حسین خانصاحب جو شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب کے چھوٹے بھائی ہیں، جامعہ سے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کرنے کے بعد گئے تھے اور کوئی چار سال قیام کیا۔ آپ نے اس مدت تعلیم میں سیاسیات اور بالخصوص دنیا کے مختلف دستور اساسی کا نہایت غائر مطالعہ کیا ہے، اور اپنا مقالہ ہندوستان کے دستور اساسی کے ارتقاء پر لکھا ہے جو اگر اردو میں آجائے تو اردو خواں ناظرین کے لئے سیاست پر ایک بہت اچھا ذریعۂ معلومات حاصل ہوجائے۔ آپ نے کوئی چار سال قیام کیا اور اس عرصہ میں آپ نے اپنے کاموں سے اپنے اساتذہ کو ایسا خوش رکھا کہ انھوں نے آپ کے مقالہ پر نہایت اچھی رائے کا اظہار کیا ہے جو کم لوگوں کے حصہ میں آتا ہے۔

جامعہ کی اُردو اکیڈمی کا ملتوی شدہ جلسہ ۹ اپریل کو منعقد ہوا جس میں مولانا اسلم صاحب جیراجپوری نے "مصر کی تہذیب قدیم پر اسلام کا اثر" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ آپ نے اپنے اس مضمون میں مصر کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تھی اور اخیر میں کچھ اسلام کے اثرات دکھائے تھے۔ آپکی تقریر کا سلسلہ کوئی سوا گھنٹہ تک جاری رہا اور جلسہ کی صدارت ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب احراری نے فرمائی۔

اس کے بعد پروفیسر محمد مجیب صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ مباحثہ ہوا جس میں شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تعلیم بہ حیثیت مجموعی مضر رہی ہے۔ آپ نے اپنی تقریر میں نہایت خوبی اور اختصار کے ساتھ یہ دکھایا کہ کس طرح ہندوستانی یونیورسٹیاں ہماری اجتماعی اور انفرادی دونوں ضروریات کے پورا کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ آپ نے متعدد مثالوں سے بتایا کہ ان یونیورسٹیوں میں کس طرح تمدن کے تمام بڑے بڑے عناصر سے بے پرواہی برتی جاتی ہے مثلاً مذہب سے بیزاری، اپنی زبان اور ادب سے نفرت، اپنے فنون لطیفہ سے لاعلمی وغیرہ ان یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتوں کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ آپکی تقریر کوئی دس منٹ تک جاری رہی۔ اس کے بعد جناب خواجہ غلام السیدین صاحب نے تجویز کی مخالفت میں تقریر فرمائی جس میں آپنے بتایا کہ تاریخی حیثیت سے یہ یونیورسٹیاں ایسے زمانہ میں وجود میں آئیں جب کہ ہندوستان سے تمام تہذیب و تمدن تقریباً ختم ہوچکا تھا، ایسی حالت میں غیر قوم کی تہذیب و علوم کا اثر پڑنا لازمی تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ غیر ملکی اثر کم ہوتا جارہا ہے۔ علاوہ اس کے یونیورسٹیوں میں اتنی تنگی نظر نہیں ہونی چاہیئے کہ دوسری قوم کے علوم و تہذیب سے کوئی واسطہ نہ رکھا جائے۔ آپ نے اخیر میں یہ بھی فرمایا کہ ایک عملی شخص کے لئے حالات سے اس درجہ مایوس نہ ہونا چاہیئے بلکہ ان کی اصلاح کی فکر میں برابر لگے رہنا چاہیئے۔ آپکی تقریر کا سلسلہ کوئی نصف گھنٹہ جاری رہا۔ آپ کے بعد ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی، مولوی نورالرحمٰن صاحب، سید تجمل حسین صاحب اور ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے بھی تقریریں فرمائیں، لیکن سب موافقت میں۔ بالآخر جلسہ کوئی ۱۱ بجے شب میں ختم ہوا۔